ارمغانِ آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کا مجموعۂ کلام
اور ان کے
ابتدائی دَور کے مضامین

ارمغانِ آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کا مجموعۂ کلام
اور ان کے
ابتدائی دور کے مضامین

مرتب و مؤلف

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری

یکے از مطبوعات

ادارۂ تحقیقاتِ افکار و تحریکاتِ ملّی
پاکستان

سلسلۂ مطبوعات آزاد صدی نمبر ۲۳

ارمغانِ آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کا مجموعۂ کلام اور ان کے ابتدائی دور کے مضامین

مرتّب

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

طابع

المخزن پرنٹرز۔ پاکستان چوک۔ کراچی ۱

اشاعت : ۱۹۹۰ء

قیمت : ۶۵ روپے

ملنے کا پتہ

(۱)

مکتبۂ شاہد

علی گڑھ کالونی۔ کراچی ۷۵۸۰۰

(۲)

مکتبہ رشیدیہ

قاری منزل۔ مرار اسٹریٹ۔ پاکستان چوک کراچی ۱

فہرست

حصّہ دوم

دیباچہ

مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم و مغفور کا نام زبان پر آتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ کسی ایک شخص کا تذکرہ نہیں ہو رہا ہے بلکہ بیک وقت کئی اشخاص زیر بحث ہیں۔ اور ان میں سے ہر شخص اپنے فن میں یکتائے روزگار، اور شہنشاہِ علم و فن ہے۔ انھیں اللہ تعالیٰ نے علم و فضل کی بے شمار دولتوں اور فکر و نظر کی بے شمار صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ وہ دین کے متبحر عالم تھے، اور مختلف علوم دینیہ مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ میں وسیع نظر رکھتے تھے، انھیں فن تجوید، علم کلام، منطق اور مناظرہ وغیرہ میں عبور حاصل تھا۔ علم ہیئت اور فلسفۂ قدیم و جدید پر ان کی ناقدانہ نگاہ تھی۔ دساتیر و قوانین کا نہ صرف مطالعہ کرنے والے بلکہ بنانے والے تھے، تاریخ عالم کے ایک ایک گوشے اور ایک ایک پہلو پر نظر تھی، جغرافیہ عالم میں ان کو کمال حاصل تھا۔ وہ اُردو زبان کے بے مثال ادیب و انشا پرداز تھے، لسانیات، لغات، اصطلاحات کے مسائل سے خاص دل چسپی تھی۔ عربی ان کی مادری زبان تھی۔ فارسی زبان کے نکات انھوں نے اہل زبان سے سیکھے تھے، اور ان پر عبور حاصل کر لیا تھا۔ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں سے بہ خوبی واقف تھے اور ان زبانوں کی تاریخ پر عبور اور ادب کا خاص ذوق رکھتے تھے۔ وہ ہر زبان کے بڑے بڑے ادیبوں، مصنّفوں اور شاعروں کی تخلیقات پر ناقدانہ نظر رکھتے تھے۔ مذکورہ زبانوں میں ادب، تاریخ، مذہب اور فلسفہ کا تمام بہترین سرمایہ ان کی نظر سے گزر چکا تھا، ہندو اور چینی فلسفہ و مذاہب کا مطالعہ انھوں نے زیادہ تر انگریزی کی مدد سے کیا تھا۔ اُردو صحافت کے دامن میں انھوں نے اب سے پون صدی پیشتر جو کچھ ڈال دیا تھا، آج تک اس میں اضافہ نہ کیا جا سکا۔ خطابت میں ان کا کوئی جواب نہ تھا۔ ان کی طاقتِ لسانی کے سامنے برٹش حکومت اپنی تمام آہنی اور جنگی طاقتوں کے ساتھ لرزتی رہی، عملی سیاست میں انھوں نے اس وقت قدم رکھا اور برٹش امپریلزم کے قصرِ عظمت پر اس وقت ضرب لگائی جب بڑے بڑے رہنماؤں کا اس میدان میں دور دُور پتا نہ تھا۔ بڑے بڑے رہنما جو بعد میں رہنمایان آزادی میں شمار ہوئے ان کی دعوت سیاسی کی سب سے بلند پرواز برٹش حکومت کی کاسہ لیسی کی زندگی اختیار کر لینے پر مبنی تھی۔ نظری سیاست میں بھی ان کا مقام دنیا کے بڑے بڑے سیاست دانوں میں تھا۔ مفکر تعلیم کی حیثیت سے برصغیر کی وہ

ایک اہم شخصیت تھے ۔ ہندوستان کو انھوں نے اپنے دَورِ وزارت میں اپنے افکار اور اپنی خداداد صلاحیتوں سے اتنا مالا مال کر دیا کہ اس کے تذکرے کے لیے جدید ہندوستان کی تاریخ تعلیم میں ایک طویل اور نمایاں باب ہوگا ۔ دنیا کے امن کے لیے تاریخ وجغرافیہ کی تعلیم کا انھوں نے ایک خاص تصور اور نظریہ پیش کیا ہے ۔ اثری تحقیقات ان کا محبوب موضوع تھا، اور اس سلسلے میں قدیم اور جدید ترین معلومات وتحقیقات ان کے علم اور مطالعے میں تھیں ۔ طب پر ان کی زبان کھلی تو طب قدیم وجدید کے نظریوں اور طریق علاج اور منضج ، مسہل ، تبرید ، تکمید سے لے کر ریشۂ خطمی اور گاؤزبان تک کوئی پہلو نہ چھوڑا ۔ اور اپنی معلومات کا بڑے بڑے حکیموں سے لوہا منوالیا ۔ مصوّری میں ان کا مطالعہ اتنا وسیع اور ان کی نظر اتنی گہری تھی کہ وہ نہ صرف اس کی تاریخ بلکہ عہد بہ عہد ترقی اور ہر عہد کی خصوصیات سے واقف تھے ۔ موسیقی کا ذوق ان کی طبیعت میں رچا بسا تھا اس کو انھوں نے عملی لحاظ سے سیکھا تھا ۔ اور فنی لحاظ سے اس کی تکمیل کی تھی ۔ ہندوستان میں لکھنؤ اور آگرہ اور بیرونِ ہند عراق اور بغداد کے ماہرینِ فنِ موسیقی سے بحث مباحثہ رہتا تھا ۔ ڈراما اور سینما وغیرہ کی تاریخ اور اس کی تدریجی ترقیوں سے وہ ایک صاحبِ مضمون کی طرح واقف تھے ۔ مشرقی لباس اور کھانوں کا تذکرہ ہو یا مشرقی کوفنوں کی تاریخ ، وہ ہر موضوع پر اپنی معلومات اور مطالعے کی وسعت سے سننے والوں کو حیرت میں ڈال دیتے تھے ۔ علوم وفنون کی جزئیات پر بھی وہ اصحابِ علوم وفنون کی طرح نظر رکھتے تھے ۔

جعفری خاندان کی تاریخ ہو یا پٹھانوں کی تاریخ ان کے خاندانوں کا بیان وہ اس تفصیل اور روانی سے کرتے تھے کہ خود صاحبِ علم ومطالعہ جعفری اور پٹھان بھی حیرت زدہ رہ جاتے تھے ۔ حتیٰ کہ حقہ کی تاریخ اس کی تدریجی ترقی ، عہد بہ عہد اس کی شکل میں تبدیلی ، اس کی "نے" کی مختلف شکلیں ، ان کی لمبائی ، موٹائی اور شکل کے اختلاف سے اس کی آواز پر معمولی اثر ، پتنگ کی تاریخ ، اس کی مختلف شکلیں ، ان کے اڑانے اور لڑانے کے طریقے ، چائے کی تاریخ ، کاشت ، اس کی اقسام اور اس کے ذائقے کا تذکرہ ہو ، پان کی تاریخ ؛ اس کی قسموں مختلف زمانوں اور ملکوں میں پان بنانے کی ترکیبوں کا تذکرہ ہو ، بلبلوں اور ان کی نسلوں کا بیان ہو ، پھول پودے اور اُن کی اقسام زیرِ بحث ہوں یا پرندوں اور جانوروں کی نفسیات پر قلم اٹھائیں ۔ وہ ہر چیز کا بیان اس تفصیل سے کرتے ہیں کہ پڑھنے والے نہ صرف ان کے قلم کی ندرت کاری اور بیان کے حسن پر عش عش کر اٹھتے ہیں بلکہ ان کے علم ومطالعہ کی وسعت ، حیرت انگیز قوّتِ حافظہ ، اور بے نظیر قوّت

استحضار کا اعتراف کرتے ہی بن پڑتا ہے، یہ کمال کچھ ان کی طلاقتِ لسانی ہی کا نہیں تھا، بلکہ یہ ان کی قابلیت اور حافظہ و استحضار کی بے نظیر صلاحیتیں تھیں، ان کی طلاقتِ لسانی کا تو یہ عالم تھا کہ وہ اگر اَرہر کی پتلی دال اور بیچ نکلے ہوئے چاولوں کو دنیا کی لذیذ ترین اور مفید ترین غذا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ یا تہہ بند، بنیان اور معمولی چپل کو وہ دنیا کا عمدہ ترین لباس ثابت کرنا چاہتے تو کسی کی مجال نہ تھی کہ اس سے انکار کر سکتا۔

ابو الکلام کے علم وفضل کے جن پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا گیا یہ وہ پہلو ہیں جن کا ذکر اور جن کا اعتراف ملک اور بیرون ملک کے علما و مشاہیر کر چکے ہیں یا ابو الکلام کی زندگی کے وہ گوشے ہیں جو لوگوں کے علم میں آ گئے ہیں۔ ان کے ایک وجود میں علم وفضل کی ایسی کتنی ہی دنیائیں آباد تھیں جن کا لوگ پتا بھی نہ چلا سکے۔ اور کسی طرح لوگوں کے احاطۂ علم میں نہ آ سکیں۔ علامہ نیاز فتحپوری نے مولانا مرحوم کی اسی جامعیت کے متعلق فرمایا تھا:

> "مولانا کی جو خصوصیات دنیا پر ظاہر ہو سکیں وہ اس سے بہت کم تھیں جو چھپی ہوئی رہ گئیں، حالانکہ وہ بہت زیادہ وزنی اور گراں قدر تھیں۔ ان کی ہستی کے بہت سے امکانات دنیا پر ظاہر نہ ہو سکے۔
>
> وہ امکانات کیا تھے؟ ان کا تعین اور صراحت آسان نہیں تاہم جس حد تک میرے ذاتی ربط اور مطالعے کا تعلق ہے، میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر ان کی زندگی ایک خاص سانچے میں ڈھل کر وہ نہ ہو جاتی جو ہمارے سامنے آئی تو وہ خدا جانے کیا کیا ہو سکتے تھے۔ وہ اگر عربی شاعری کی طرف توجہ کرتے تو متنبی اور بدیع الزماں ہوتے۔ اگر وہ مذہب اور مذہبی اصلاح کو اپنا شعار بنا لیتے تو اس عہد کے ابن تیمیہ ہوتے۔ اگر محض علوم حکمیہ کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیتے تو ابن رشد اور ابن طفیل سے کم درجے کے متکلم اور فیلسوف نہ ہوتے، اگر وہ فارسی شعر و ادب کی طرف متوجہ ہوتے تو عرفی اور نظیری کی صف میں انھیں جگہ ملتی۔ اگر وہ تصوف اور اصلاح اخلاق کی طرف مائل ہوتے تو غزالی اور رومی سے کم نہ ہوتے، اگر وہ مسلکِ اعتزال اختیار کرتے تو دوسرے واصل بن عطا ہوتے۔

مولانا عجیب وغریب دماغی اہلیتیں لے کر پیدا ہوئے تھے جن کو زمانے

نے یا ان کی خلوت پسند طبیعت نے ابھرنے کا موقع نہ دیا اور آج ہم انھیں صرف الہلال اور البلاغ کے رئیس التحریر یا تذکرہ، ترجمان القرآن اور غبارِ خاطر کے مصنف کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس صدی کے مجدد ہونے کی تمام صلاحیتیں اپنے اندر رکھتے تھے:

ابوالکلام کو خود بھی اپنی جامعیت علوم و فنون اور فکر و نظر کی وسعتوں کا احساس تھا۔ ایک موقع پر بے ساختہ ان کے قلم سے چند جملے نکل گئے۔ فرماتے ہیں:

"افسوس ہے کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سروسامان نہ کرسکا، غالب کو تو صرف اپنی ایک شاعری ہی کا رونا تھا۔ نہیں معلوم میرے ساتھ قبر میں کیا کیا چیزیں جائیں گی۔

نا روا بود بہ بازارِ جہاں جنسِ وفا　　رونقے گشتم و از طالعِ دکاں رفتم

بعض اوقات سوچتا ہوں تو طبیعت پر حسرت و الم کا ایک عجیب عالم طاری ہو جاتا ہے، مذہب، علوم و فنون، ادب، انشا، شاعری کوئی وادی ایسی نہیں ہے جس کی بے شمار راہیں مبداءِ فیاض نے مجھ نامراد کے دماغ پر نہ کھول دی ہوں۔ اور ہر آن اور ہر لحظہ نئی نئی بخششوں سے دامنِ دل مالا مال نہ ہوا ہو۔ بہ حدیکہ ہر روز اپنے آپ کو عالمِ معنی کے ایک نئے مقام پر پاتا ہوں اور ہر منزل کی کرشمہ سنجیاں پچھلی منزلوں کی جلوہ طرازیاں ماند کر دیتی ہیں:

مَا زِلْتُ اَنْزِلُ فِیْ وِدَادِکَ مَنْزِلاً　　یَتَحَیَّرَ الْاَلْبَابَ عِنْدَ نُزُوْلِہَا

لیکن افسوس! جس ہاتھ نے فکر و نظر کی ان دولتوں سے گراں بار کیا، اس نے شاید سروسامانِ کار کے لحاظ سے تہی دست رکھنا چاہا۔ میری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ اس عہد و محل کا آدمی نہ تھا، مگر اس کے حوالے کر دیا گیا۔"[۵]

یہ اشارات تو ان کے علم و فضل کی جانب تھے، ان کی شخصیت کے اور بہت سے پہلو ہیں۔ مثلاً اُن کی شخصیت کا جو پہلو سب سے پہلے دامن شوق و عقیدت کو اپنی جانب کھینچتا ہے، وہ ان کی زندگی کا اٹھان ہے۔ انھوں نے ایک مخصوص عقاید و افکار کے خاندان میں آنکھیں کھولیں ایک مخصوص ماحول میں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ لیکن فطرتِ سلیمہ نے اس

---

[۵] نقشِ آزاد (خطوط ابوالکلام آزاد) مرتبہ مولانا غلام رسول مہر، لاہور، ۱۹۵۸ء، ص ۵۸ - ۱۵۷۔

ماحول سے بغاوت کی اور اُن عقاید و افکار کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ حق کی طلب و جستجو نے انھیں شک و انکار اور الحاد و فسق کی وادیوں کی بھی خاک چھنوائی ۔ لیکن ان کے بخت کی فیروز مندی انھیں ہر نشیب و فراز سے صحیح سلامت منزلِ مقصود کی طرف لے گئی۔ اسلام کی صداقت کے متعلق شکوک و شبہات کے تمام کانٹے دل سے نکل گئے ۔ اور یقین و ایمان کی کھوئی دولت دو بارہ مل گئی ۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ۔

علم و فضل کے بعد ان کی سیرت کا پہلو آتا ہے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان کے علمی فضائل و محاسن کا پہلو عظیم الشان تھا یا اخلاقی کمالات کے لحاظ سے وہ بڑے تھے ۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ ہر لحاظ سے عظیم الشان تھے ، چھوٹوں کے لیے ان کا وجود سرتاپا شفقت و رحمت ، دوستوں کے ہمدرد و غم گسار ، نیاز مندوں اور عقیدت کیشوں کے لیے ہمہ تن دعا و سلامتی ، لیکن فراعنۂ وقت کے مقابلے میں کبھی ان کی کج کلاہی نہ گئی ۔ اوچھوں سے ہمیشہ درگذر کیا ، کم ظرفوں کو کبھی منہ نہ لگایا اور ان کی کسی بات کا کبھی جواب نہ دیا ۔ غلط کاروں کو ہمیشہ معاف کر دیا ، مخالفوں سے بدلہ لینے کا کبھی خیال بھی دل میں نہ لائے ۔ کچھ عاقبت نااندیشوں نے نوجوانوں کو بھڑکایا ، اور ان سے اخلاق و شرافت کی حدود تڑوائیں ، عقیدت مندوں نے اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہا ۔ مولانا آڑے آئے ۔

”میرے بھائی ! “ انھیں معاف کر دو ۔ یہ بچے ہیں ، ان کی کوئی خطا نہیں “

دوستوں نے مجبور کیا ، مولانا زبان کھولیں ۔ جواب ملا ، ” میرے بھائی ! موسمی ہوائیں ہیں گزر جائیں گی “

اخبار نویسوں نے ردِ عمل معلوم کرنا چاہا ۔ فرمایا :

”کوئی شخص گالی دے کر اپنی عزت میں اضافہ نہیں کر سکتا “

جس بات کو انھوں نے غلط سمجھا ، غلط کہا ، اور جس بات کو انھوں نے صحیح جانا ، بانگِ دہل صحیح کہا ۔ اور اس کے لیے سینہ سپر ہو گئے ، ان کے نزدیک حق کے معاملے میں عوام کا اشتعال اور دوستوں کی ناراضگی اضافی چیزیں تھیں ۔ مخالفتوں کے طوفان آئے اور بڑے بڑے اصحاب عزم و ہمت تنکوں کی طرح بہہ گئے لیکن اس کوہِ استقلال کو کوئی چیز اس کی جگہ سے جنبش نہ دے سکی ۔ مصائب و حوادث نے بہت سوں کا وقار خاک میں ملا دیا لیکن ابوالکلام جس مقام پر تھے اس سے نیچے دیکھنا بھی گوارا نہ کیا ، عوام کے سیلاب کے

آگے بڑے بڑے، خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔ اور رہنمائی کے مقام بلند سے ترجمانی کے مقام اسفل میں اتر آئے۔ لیکن ابوالکلام کے نزدیک عوام کے جذبات خواہ کتنے ہی تیز و تند کیوں نہ ہوں، انھیں مطاع و مرجع نہیں بنایا جا سکتا۔

یہی وہ مقامِ عزیمتِ دعوت تھا جہاں سقراط نے زہر کا پیالا پیا۔ گلیلو نے موت کو خوش آمدید کہا، امام احمد نے پیٹھ پر کوڑے کھائے۔ اور ابن تیمیہ نے قید و بند کی سختیوں کو لبیک کہا، ابوالکلام کے حصے میں بھی تلخیوں کے گھونٹ اور نفرتوں کے جام آئے۔ انھوں نے صبر و شکر کے ساتھ ان کو پی لیا۔ اور اُف تک نہ کی۔

صحیح اعتراض ہو تو آدمی خاموشی سے سن لیتا ہے۔ لیکن لغو اعتراضات اور بہتان تراشیوں پر کون شخص اپنی زبان بند رکھ سکتا ہے۔ لیکن ابوالکلام نے جب ایک مرتبہ عہد کر لیا کہ جو شخص ان کے خلاف مناظرانہ رنگ میں کچھ کہے گا یا لکھے گا، اس کے خلاف نہ کچھ لکھیں گے اور نہ حرف شکایت زبان پر لائیں گے۔ تو پھر کبھی نہ کسی کے رد اور جواب میں ان کا قلم اٹھا، نہ زبان پر کسی کا شکوہ آیا۔ مدت العمر وہ اپنے اس عہد پر قائم رہے۔ ذٰلِكَ لِمَنْ عَزْمِ الْاُمُوْر۔

ان کے علم و فضل اور سیرت کے ساتھ ان کی خدمات کا پہلو سامنے آتا ہے۔ اس کے اتنے میدان ہیں جتنے کہ علم و فضل اور فکر و نظر کے لحاظ سے ان کی شخصیت کے پہلو ہیں۔ علمی و عملی زندگی کے مختلف میدانوں میں انھوں نے جو خدمات انجام دیں انھیں کوئی مورخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔

ایسی با کمال اور پہلو دار شخصیت کے علوم و معارف کے احاطے، فضائل و محاسن کے ذکر اور خدمات کے تذکرے کے لیے علما کے بڑے بڑے مجامع، عظیم الشان اکیڈمیوں اور ان کے بے شمار وسائل اور قرنوں کی کوششوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان پر قلم اٹھانے کے لیے جن صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے بلاشبہ وہ مجھ میں نہیں ہیں مجھے ان پر قلم اٹھانے اور ان کے تذکرے کا حق نہیں پہنچتا تھا۔ لیکن مولانا سے میری عقیدت اس وقت کا انتظار نہ کر سکتی تھی، جب اکابر اہل علم اس جانب توجہ فرمائیں۔ میں نے اپنی معمولی صلاحیت کے مطابق جو کچھ مجھ سے ہو سکا کیا۔ آیندہ اہلِ علم اور باصلاحیت لوگ اسے اپنا موضوع بنائیں گے اور اپنے اعلیٰ معیار اور علمی ذوق کے مطابق کام کریں گے۔

-پیش نظر کتاب مولانا آزاد کی باکمال اور ہمہ جہت شخصیت کے صرف ایک پہلو کے ایک دَور یعنی ان کی ابتدائی ادبی زندگی سے تعلق رکھتی ہے ۔ اس میں مولانا کے ابتدائی چند مضامین اور کچھ کلام جو اس وقت تک دستیاب ہو گیا تھا یک جا کر دیا ہے ۔ اس کتاب کی اشاعت سے حقیقتاً مقصود یہی ہے کہ مولانا کے مضامین نظم و نثر کے جو نقوش مختلف اخباروں اور رسالوں میں بکھرے ہوئے ہیں، وہ یک جا اور محفوظ ہو جائیں ۔

مولانا کی شاعری کے جو نقوش سامنے آئے ہیں وہ فکر و فن کے لحاظ سے خواہ قابل التفات نہ ہوں ۔ لیکن مولانا آزاد کی شخصیت اور اس کے ارتقا، ان کے افکار و نظریات اور فن کے مطالعے اور تجزیے میں ان کی بڑی اہمیت ہے ۔ اس لیے انھیں کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔

اسی طرح ان کے ابتدائی مضامین جو پیش نظر ہیں وہ علمی گہرائی، فکری بلندی اور اسلوب و بیان کے لحاظ سے دَورِ الہلال اور اس کے بعد کے پختہ و نادر اسلوب سے کوئی نسبت نہیں رکھتے، لیکن ان کے اسلوب فکر و نگارش کی بنیادیں یہیں استوار ہوئی ہیں ۔ حصۂ مضامین کا آخری مضمون حضرت سرمد شہید پر ہے ۔ وہ اپنے اسلوب کی ندرت اور فکر کی طراوش کے لحاظ سے ابتدائی دَور کا معلوم نہیں ہوتا ۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ "الہلال" کے دَور سے قبل کا ہے اور اس کی جگہ زمانی ترتیب میں وہی ہے جو اسے دی گئی ہے ۔

الندوہ (لکھنؤ) کے مضامین دستیاب ہیں لیکن بہت سے مضامین ابھی ایسے ہیں جو دسترس سے باہر ہیں ۔ یہ مضامین دستیاب ہو جائیں تو خیال ہے کہ ایک الگ مجموعے میں مرتب کر دیے جائیں ۔ ممکن ہے اوسط ضخامت کے ایک سے زیادہ مجموعے بنانے پڑیں ۔

مولانا آزاد کی شاعری

(۱)

اس بارے میں اب کوئی شبہ نہیں کہ مولانا آزاد نے شاعری شروع کی تو ان کی عمر گیارہ بارہ برس سے زیادہ نہ تھی، شعر و شاعری کے ابتدائی ذوق و شوق کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں :

"یہ عجیب بات ہے کہ درسیات کے باہر جس چیز سے میں سب سے پہلے آشنا ہوا وہ شاعری تھی۔ مجھے یہ ٹھیک یاد نہیں پڑتا کہ پہلے پہل میں کیوں کر اس چیز سے واقف ہوا۔ لیکن یہ اچھی طرح یاد ہے کہ زیادہ شوق اس کا مولوی عبدالواحد خاں[1] سہسرامی ایک شخص کی وجہ سے ہوا جو مولوی محمد فاروق چریا کوٹی کے ایک مستعد شاگرد تھے اور اُردو فارسی کا اچھا ذوق رکھتے تھے، وہ ایک غریب گھرانے کے آدمی تھے۔ ان کی بہن ہم لوگوں کے یہاں گھر کے اوپر کے کام کے لیے ملازم تھیں۔ اس تعلق سے ان کی بھی آمد و رفت شروع ہو گئی تھی اس وقت میری عمر دس گیارہ[2] برس سے زیادہ نہ تھی، دوپہر کے وقت وہ آیا کرتے تھے اور بہن سے ملتے تھے۔ اس میں ہم لوگوں سے بھی بات چیت ہونے لگی، اور پھر ہمارے باہر کے درس کے اوقات میں بھی آنے لگے، اس زمانے میں کلکتہ میں ایک بڑا مشاعرہ ہوا تھا، اس کا انتظام پٹنہ کے بادشاہ

---

[1] جناب مالک رام نے مولانا آزاد کی غیر مطبوعہ تحریر کے حوالے سے عبدالواحد خاں کا تخلص دَیب لکھا ہے۔ مولانا کی یہ غیر مطبوعہ تحریر وہ ہے جو انھوں نے اپنے حالات میں مولوی عبدالشاہد خاں شروانی مرحوم کے بعض سوالات کے جواب میں لکھی تھی۔

[2] مولوی محمد یوسف جعفری رنجورؔ عظیم آبادی کے نام مولانا آزاد کی ایک حالیہ دستیاب شدہ تحریر کے مطابق مولانا کا سال پیدائش ۱۳۰۳ھ (مطابق ۱۸۸۶ء) ہے۔ اس لیے یہاں پر دس گیارہ کے بجائے بارہ تیرہ برس سمجھنا چاہیے۔ مولانا کا جو اولین مطبوعہ کلام دستیاب ہوا ہے وہ بھی ۱۸۹۹ء کا ہے۔ یہ کلام شاعری کے شوق کے بالکل اوائل کا ہے۔ اس وقت مولانا کی عمر تیرہ برس کی تھی۔

میاں نامی ایک رئیس نے کیا تھا۔ اس کے لیے کلکتہ سے باہر کے بھی مشہور اشخاص مثلاً جلالؔ مرحوم بلائے گئے تھے۔ تین طرحیں دی گئی تھیں جن میں سے ایک یہ تھی:

مطلب کی بات صاف کہوں کیا مجال ہے۔

تین دن تک مسلسل مشاعرہ جاری رہا تھا، مولوی عبدالواحد نے غزلیں لکھی تھیں اور مشاعرے میں پڑھی تھیں۔ انھوں نے اس کا حال ہم لوگوں کو سنایا اور اپنی غزلیں بھی سنائیں۔ یہ پہلی منظم دل چسپی ہے، جو میرے حافظے میں شاعری کی نسبت پائی جاتی ہے۔ مجھ پر اس کا بہت اثر پڑا، اور اب ان سے اس بارے میں صحبتیں رہنے لگیں۔ اردو شعرا کا وہ ذکر کرتے، ان کے مقابلے اور معرکے اور لطائف سناتے، خاص خاص اشعار کے متعلق جو واقعات مشہور ہیں ان کا ذکر کرتے اور میری دل چسپی روز بروز بڑھنے لگی۔"[۱]

شعرگوئی کی جلا کے لیے اساتذہ کے کلام کا مطالعہ بہت ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ اس کے بغیر زبان و بیان کے باریک نکتے نہیں سمجھے جا سکتے۔ اس سے نئے نئے خیالات ذہن میں آتے ہیں اور اظہارِ خیال اور اندازِ بیان کے نئے نئے اسلوبوں سے طبیعت آشنا ہوتی ہے۔ مولانا نے اس غرض سے اساتذہ کے دواوین خریدے اور ان کا مطالعہ کیا۔ فرماتے ہیں:

"چنانچہ میں نے بعض اساتذہ مثلاً سوداؔ، میرؔ وغیرہ کے دواوین خریدے اور فرصت کے وقت میں ان کا مطالعہ کرنے لگا۔ ساتھ ہی خود بھی کہنے کا شوق ہوا، اور روز بروز طبیعت میں اس کا شوق اور کاوش بڑھتی گئی، چناں چہ مختلف زمینوں میں بہت سے اشعار کہے۔ مگر چوں کہ خود اعتمادی پیدا نہیں ہوئی تھی اس لیے مولوی عبدالواحد خاں کو بھی کبھی نہیں سنائے۔ اسی شوق کی وجہ سے میں نے پہلے پہل تذکرہ آبِ حیات خریدا مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کا دیباچہ اور مقدمہ اور اردو زبان و شاعری کی ابتدا کا تاریخی بیان اچھی

۱؎ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی۔ عبدالرزاق ملیح آبادی۔ حالی پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی، ۱۹۵۸ء صفحہ ۳۲۷۔

طرح میری سمجھ میں نہیں آیا تھا- ابتدا میں مجھے اس طریقے سے بڑی وحشت ہوئی کہ صرف آزاد لکھ کر ایک بیان شروع ہوگیا- میں نے وہ حصہ چھوڑ دیا اور جہاں سے شعرا کے حالات شروع ہوتے ہیں، مطالعہ شروع کردیا- اور مجھے اتنی دلچسپی ہوئی کہ ان تمام شعرا کے کلیات اور دواوین خرید کر اور تذکرے کے اقتباسات کو اصلی مواد میں تلاش کرکے نکالا" حیاتِ سعدی" اور "یادگارِ غالب" بھی اسی زمانے میں منگوائی گئیں "۔ ؎۱

مولانا کی پہلی غزل :

اس زمانے کا نمونہ کلام دستیاب نہیں- البتہ مولانا کی پہلی غزل جو انھوں نے ارمغانِ فرخ (بمبئی) کی طرح میں کہی تھی اور کسی دوسرے شخص (عبدالواحد) کو سنائی تھی اس کے چند شعر جو مولانا کو یاد تھے محفوظ ہیں- پہلی غزل کہنے کی روداد اور اس پر مولوی عبدالواحد سہسرامی کی تحسین کا تذکرہ مولانا ہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں :

"اس زمانے میں بمبئی سے ایک نیا گلدستہ "ارمغانِ فرخ" نکلا تھا اور کلکتہ میں بعض لوگ اس کی طرحوں پر ماہوار مشاعرہ منعقد کیا کرتے تھے سب سے پہلی غزل جو میں نے لکھ کر دوسروں کو سنائی وہ اسی کی ایک طرح میں تھی اس میں طرح ہوئی تھی :

"پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی "

اور کلکتہ کے مشاعروں میں یہی طرح قرار پائی تھی- عبدالواحد نے اپنے چند اشعار اس میں سنائے اور مجھ کو اس درجہ شوق ہوا کہ بڑی کوشش و جاں کاہی سے تقریباً تیس شعر لکھ کر ان میں سے سترہ شعر منتخب کیے- تاہم طبیعت مطمئن نہ تھی اور کسی کو سناتے ہوئے ہچکچاتی تھی، بار بار حک و اضافہ کے بعد جب اپنے خیال میں اچھی طرح تیار ہوگیا تو میں نے عبدالواحد خاں کو مطلع سنایا وہ سنتے ہی چیخ اٹھے اور اس قدر تعریف کی کہ میں جامے میں نہ سمایا- اور طبیعت کو ایک عجیب قسم کی فرحت حاصل ہوئی ایک ایسا نشہ چڑھ گیا کہ معلوم ہوتا تھا گویا ایک

؎۱ ایضاً ص ۲۳۸ -

غیر معمولی فتح مندی حاصل ہوئی ہے۔ جب اور شعر سنائے تو ہر شعر پر کھڑے ہو ہو کر انھوں نے تحسین کی اور بھائی مرحوم جو اس وقت تک میدان میں نہیں آئے تھے۔ میری اس کامیابی کو دیکھ کر بچپنے کے رقیبانہ رشک میں مبتلا ہو گئے۔ اس سے مجھے اپنی کامیابی پر اور مسرت ہوئی اور عبدالواحد خاں کے بار بار جرأت دلانے پر میں تیار ہو گیا کہ غزل اشاعت کے لیے بھیجوں۔"[1]

مولانا نے اس غزل کے تین شعر مولانا غلام رسول مہر مرحوم کے نام ایک خط میں خود تحریر فرمائے ہیں[2]۔

اس غزل کا ایک شعر مولانا کی بہن آبرو بیگم کو یاد تھا، انھوں نے خواجہ احمد فاروقی کو سنایا تھا[3]۔

مشاعرے میں پہلی غزل :

دوسرے دن مشاعرہ تھا۔ مولانا کو خود تو مشاعرے میں شریک ہونے کی ہمت نہ ہوئی، عبدالواحد خاں کو غزل دے دی انھوں نے مشاعرے میں پڑھی۔ مولانا فرماتے ہیں :

"اس کے دوسرے ہی دن مشاعرہ تھا، خود تو جانے کی جرأت نہ ہوئی انھیں کو غزل دے دی، اور انھوں نے مشاعرے میں پڑھی، وہاں کی تعریف خصوصاً مصرع طرح کی تضمین کی ترجیح پر مشاعرے کا اتفاق جب صبح کو مجھے سُنایا گیا تو میں بالکل مخمور ہو گیا۔"[4]

اوّل تو مولانا کی طبیعت ہی شاعرانہ واقع ہوئی تھی اس پر عبدالواحد خاں کی تحسین، مشاعرے کی تعریف، مصرع طرح کی تضمین کی ترجیح پر سب کا اتفاق ان سب باتوں نے شعرگوئی کے سمندِ شوق کے لیے تازیانے کا کام کیا، مولانا نے عبدالواحد خاں کے اصرار ہی سے اُسے اشاعت کے لیے بھیج دیا۔

مولانا فرماتے ہیں :

"اس دن کی خوشی مجھے اب تک یاد ہے، جب ارمغانِ فرخ چھپ کر آیا

---

[1] آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی صفحہ ۲۳۹ [2] نقشِ آزاد، لاہور، ۱۹۵۸ء ص ۱۰۷۔

[3] ماہنامہ آج کل، دہلی۔ ماہ نومبر ۱۹۵۹ء۔ [4] آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی صفحہ ۲۴۰۔

اور پہلی مرتبہ میں نے اپنی غزل اس میں چھپی ہوئی دیکھی، انتظار کی وہ لذت بھی یاد ہے جو ایک مہینے تک اس کے لیے برداشت کرنی پڑی تھی۔" [1]

مولانا کی اس غزل کے چار شعر "ارمغان فرخ" کے شمارہ جنوری ۱۸۹۹ء (صفحہ ۴) میں شائع ہوئے تھے۔ مطلع اور مقطع اس میں شامل نہیں۔

اب اس شوق میں اس وقت کے تمام گلدستے منگوانے شروع کیے اور اپنا کلام بھی بالالتزام ان میں بھیجنا شروع کیا۔ مولانا فرماتے ہیں:

"اب یہ ہوا کہ کوئی گلدستہ ایسا باقی نہیں رہا تھا جو میں نہ منگواتا ہوں اور اس میں غزل نہ بھیجتا ہوں۔" [2]

مشاعرے کی پہلی شرکت:

مولانا کو شعر کہتے ۶، ۷ مہینے ہوگئے تھے، لیکن مشاعرے میں شرکت کا ابھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ نہ تھی کہ اتنی کم عمری میں ایک شاعر کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے آتے حجاب آتا تھا۔ بلکہ بڑی وجہ یہ تھی کہ مولانا آزاد کے والد اس وقت تک دن میں بھی کہیں آنے جانے نہ دیتے تھے جب تک خادم ساتھ نہ ہو۔ صرف نمازوں کے اوقات میں مسجد تک جانے کی اجازت تھی، مشاعرے چوں کہ رات کو ہوتے تھے اس لیے گھر سے نکلنا ناممکن تھا۔ بہ ہر حال چھ سات ماہ کے بعد انھیں پہلی بار مشاعرے میں شرکت کا موقع ملا۔ مولانا فرماتے ہیں:

"سب سے پہلی مرتبہ مشاعرے میں غزل پڑھنے کا جو مجھے اتفاق ہوا، وہ ابتدائے شعر گوئی سے چھ سات مہینے بعد کا واقعہ ہے پہلے کبھی اس کا اتفاق نہیں ہوا، اور نہ کبھی کسی مشاعرے میں شرکت کی تھی، مشاعرے شب کو ہوا کرتے تھے اور ہمارے گھر کی پابندیاں ایسی تھیں کہ شب کو نکل ہی کب سکتے تھے۔ اوّل تو ویسے بھی اشعار سنانے کی اگر مشق نہ ہو تو سنانا دشوار ہوتا ہے۔ پھر مشاعرے میں پڑھنے کا ایک خاص اسلوب ہے اور ناآشنا آدمی اس سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ لیکن میں پہلی ہی دفعہ مشاعرے میں شریک ہوا، اور

---

[1] ایضاً [2] ایضاً

غزل پڑھی اور لوگوں نے استقبال کیا۔ گویا مدتوں سے کوئی ممتاز جگہ رکھتے آئے ہوں"۔ [۱]

کلکتہ کے چند مشاعرے:

اس زمانے میں کلکتہ کے شاعروں اور مشاعروں کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں:

"اس زمانے میں کلکتہ میں عام نومشق لوگوں کے شمس مرحوم بہ حیثیت استاد کے سمجھے جاتے تھے وہ نساخ مرحوم کے لڑکے تھے اور نواب عبداللطیف کے بھتیجے تھے، داغ مرحوم کے شاگرد تھے۔ اس میں شک نہیں کہ بنگال میں ان سے بہتر اردو پر قدرت رکھنے والا کوئی شاعر نہیں ہوا۔ وہ ان مشاعروں میں شریک ہوتے تھے اور بڑی تعریف کرتے تھے۔ اس زمانے میں رضا علی وحشت بھی نئے نئے شعر کہنے لگے تھے، اور شمس مرحوم سے اصلاح لیتے تھے۔

دو تین مجلسوں کے بعد ہی سے ہم دونوں بھائی مشاعرے میں اس حد تک ممتاز ہو گئے گویا ہمارا شمار اساتذہ میں تھا اور یہ بات مان لی گئی تھی کہ ہمارے آگے سب سے آخر میں شمع آنی چاہیے۔ کئی مجلسیں ایسی بھی ہوئیں کہ جن میں باہر کے اچھے اچھے شعرا نے بھی شرکت کی۔

ایک مشاعرہ نواب سعید احمد خاں طالب مرحوم کی موجودگی کی وجہ سے ہوا تھا اور "نظر آئی" اور "ادھر آئی" طرح ہوئی تھی۔ میں نے اس میں مسلسل سہ غزلہ سنایا تھا، چند مشاعروں میں تو ایسی خاص کامیابی ہوئی تھی کہ لوگوں نے بالاتفاق ہماری غزلوں کو حاصل مشاعرہ قرار دیا تھا۔ یا کسی خاص شعر پر مجلس کی مجلس لوٹ گئی تھی۔

اس زمانے کی مدہوشیاں بھی عجیب تھیں۔ یہ چیزیں بہت بڑی کامیابی معلوم ہوتی تھیں، حالاں کہ یہ ظاہر ہے کہ وہ مشاعرے ہی کیا تھے اور ان میں جو لوگ شریک ہوتے تھے ان کی تحسین و تقبیح کیا مفید ہو سکتی تھی، بیچارے سب یہیں

---

[۱] ایضاً ص ۲۲۴۔

کلکتہ کے نومشق لوگ ہوتے تھے بجز شمس مرحوم کے اور کوئی شخص کلکتہ میں وقیع حیثیت شاعری میں نہیں رکھتا تھا۔ ہاں البتہ کہنہ مشق لوگوں میں شہرت مرحوم ایک خاص شخص تھے۔ لیکن جو کچھ بھی ان میں تھی کہنہ مشقی اور پرگوئی تھی، ورنہ نہ تو کوئی خاص رنگ تھا اور نہ شاعری کا خاص ذوق۔ البتہ بندیوں میں رضا علی وحشت اس وقت بھی بہت اچھا کہنے لگے تھے اور کچھ شک نہیں کہ روز بہ روز ان کا ذوق ترقی کر رہا تھا۔

ایک اور مشاعرہ جو طالب مرحوم ہی کی تحریک سے ان کے بعض دوستوں نے کیا تھا اور یہ طرح تھی "ادھر دیکھ رہے ہیں۔ اُدھر دیکھ رہے ہیں" وہ کلکتہ کے عام مشاعروں کے اعتبار سے ایک خاص مجلس تھی۔ طالب مرحوم کے علاوہ پٹنہ اور لکھنؤ کے بھی بعض شعرا موجود تھے۔ شوق نیموی بھی ڈھاکا جاتے ہوئے کلکتہ آگئے تھے اور شریک ہوئے تھے۔ اس میں خاص طور پر طالب مرحوم نے میرے مطلع کی اس قدر تعریفیں کیں کہ میرا دماغ آسمان پر چڑھ گیا۔ حالاں کہ وہ مطلع اب میں سوچتا ہوں تو وہ نہایت معمولی تھا۔ اس شاعرے کی غزلیں انھوں نے دلی میں ایک گل دستے کی شکل میں شائع کر دی تھیں[۱]۔"

"ارمغانِ فرخ" کے جنوری اور فروری ۱۸۹۹ئہ کے پرچے دستیاب ہوئے ہیں۔ دونوں میں مولانا کی غزلیں موجود ہیں۔ جنوری کے پرچے میں مولانا کی وہ غزل ہے جس کا طرح یہ تھا:

پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

مولانا آزاد نے اِس پر اِس طرح گرہ لگائی تھی:

آزاد بے خودی کے نشیب و فراز دیکھ پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

فروری کے شمارے میں مولانا کی ایک اور غزل کے چار شعر مطلع کے بغیر چھپے ہیں۔ اس کا مقطع یہ ہے:

آزاد اُن کی ترچھی نظر سے نہ خوف کر یہ تیر وہ نہیں جو کلیجے کے پار ہو

---

[۱] ایضاً ص ۲۶-۲۲۵

اس شمارے میں اور اسی طرح میں مولانا آزاد کے بھائی ابو النصر آہ کے بھی دو شعر چھپے ہیں۔ ایک شعر یہ ہے:

گھبرا نہ جائیے اے دلِ مضطرِ دہ بُت کہیں　　اتنا نہ تو خدا کے لیے بے قرار ہو

ان دو شماروں کے علاوہ میرے علم میں نہیں کہ کسی صاحب کو ارمغانِ فرخ کا کوئی شمارہ دستیاب ہوا ہو۔

مولانا کی ایک غزل "خدنگ نظر" لکھنؤ بابت ماہ جون ۱۸۹۹ئہ میں ملی ہے جس کی طرح یہ تھی:

تو نے آدھی بات کی میں نیم بسمل ہو گیا

اس طرح کا اعلان مارچ کے پرچے میں کیا گیا تھا اور ۱۵ رمئی تک غزلیں مانگی تھیں۔ پھر اپریل کے نمبر میں ۱۵ رجون تک اس مدت میں توسیع کا اعلان کیا گیا۔ جون کے نمبر میں تمام غزلیں اسی طرح میں ہیں۔ آخر میں چند غزلیں طرح ماہ گزشتہ میں بھی ہیں۔

مولانا کی یہی وہ غزل ہے جو اپریل ۱۹۰۳ئہ کے مخزن لاہور میں شائع ہوئی، البتہ اس غزل کا یہ شعر

تم نے مارا غیر کو اور رشک نے مارا مجھے
اس نے تن پر کھائیں تلواریں میں بسمل ہو گیا

مخزن میں نہیں ہے اور شعر مخزن میں اضافہ ہے جو خدنگ نظر میں نہیں تھا:

قیس مجنوں کا تصور بڑھ گیا جب نجد میں
ہر بگولا دشت کا، لیلیٰ کا محمل ہو گیا

اس طرح دونوں اشاعتوں میں اگرچہ تعداد چھ ہے لیکن ایک شعر مختلف ہے۔ مخزن میں مقطع کے مصرعِ اولیٰ میں "بن گیا" کی جگہ "ہو گیا" ہے۔

خدنگ نظر کے کچھ پرچے ڈاکٹر عابد رضا بیدار کی نظر سے گزرے ہیں، انھوں نے اس کے مختلف شماروں میں مولانا کی مندرجہ ذیل منظومات کی نشان دہی کی ہے۔

۱۔ غزل　　جنوری ۱۹۰۰ئہ
۲۔ غزل　　مئی ۱۹۰۰ئہ
۳۔ قطعۂ تاریخ انتقالِ امیر مینائی۔ نومبر ۱۹۰۰ئہ

۴۔ قطعۂ تاریخ جشن تاج پوشی شاہ انگلستان اگست ۱۹۰۲ء

اس میں جشن تاج پوشی کا قطعہ تو وہی ہے جو اپلنچ، پٹنہ میں" مثنوی متضمن بہ تہنیت تاج پوشی حضور ملک معظم" کے ساتھ شائع ہوا تھا اور اردو ادب کے حوالے سے" ارمغان آزاد" کے پہلے ایڈیشن میں بھی شامل تھا۔ اب یہ قطعہ پروفیسر افضل حق قرشی (لاہور) کی عنایت سے خدنگ نظر میں مل گیا ہے۔ اس قطعے کی دونوں اشاعتوں میں تھوڑا سا فرق بھی ہے۔ امیر بینائی کے انتقال کا قطعہ" مولانا آزاد البم" میں مل گیا۔ البتہ غزلیں ابھی ہماری دسترس سے باہر ہے۔

اس زمانے میں مولانا بہت سے گلدستوں میں اپنا کلام اشاعت کے لیے بھیجا کرتے تھے۔ لیکن مولانا نے اس زمانے کے بعد چوں کہ شاعری کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔ انھوں نے اپنا کلام محفوظ نہیں رکھا۔ کبھی شاعری کا ذکر آیا تو محض تفنن طبع کے طور پہ

گزر چکی ہے یہ فصل بہار ہم پہ بھی

اور اس زمانے کے گل دستے اب دستیاب نہیں۔ اس لیے مولانا کا ابھی تک بہت سا کلام اہل علم کی نظروں سے پوشیدہ ہے اور کیا تعجب کہ پوشیدہ ہی رہ جائے اور دستیاب ہو تو کب، کچھ نہیں کہا جاسکتا!

۱۹۰۰ء میں مولانا کی ایک نعت جو پانچ شعروں کی ہے، گلدستہ سفینۂ نجات، بمبئی کے اپریل کے شمارے میں چھپی تھی۔ اس نعت کے چار شعر بہ تغیر ادنیٰ ماہنامہ صحن چمن نگینہ (ضلع بجنور) کے شمارہ ستمبر ۱۹۰۲ء میں شائع ہونے والی تین نعتوں میں سے۔ پہلی نعت میں شامل ہیں۔

امتحان:

مولانا نے اتنی چھوٹی عمر میں شاعری شروع کی تھی اور پھر عمر کو دیکھتے ہوئے شعر بھی اچھے خاصے نکالنے لگے تھے، میرے خیال میں شاعر کی حیثیت سے ایک خاص حلقے میں ان کی شہرت اور مشاعروں میں مقبولیت اس کم عمری میں اچھے خاصے شعر کہہ لینے کی وجہ سے تھی۔ لیکن کئی لوگ ایسے بھی تھے جو یقین نہ کرتے تھے کہ جو کلام مولانا مشاعروں میں سناتے ہیں وہ ان کا اپنا ہوتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ مولانا کے والد شاعر ہیں، وہ انھیں کہہ دیتے ہوں گے، اور یہ اسے اپنے نام سے مشاعروں میں پڑھ دیتے ہیں۔ نادر شاہ خان شوخی

کو مولانا کے بارے میں ہی شبہ تھا۔ لیکن جب مولانا نے ایک موقعے پر ان کے دیے ہوئے مصرعِ طرح پر فی البدیہہ سات شعر کہہ دیے تو ان کا شبہ دور ہوا۔ یہ دل چسپ روداد خود مولانا نے اپنے قلم سے تحریر فرمائی ہے، لکھتے ہیں:

"مرزا غالب کے آخری عہد کے ایک شاگرد نادر شاہ خاں[۱] شوخیؔ رام پور کے باشندے کلکتہ میں مقیم تھے، انھیں کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ جو غزلیں میں سناتا ہوں میری ہی کہی ہوئی ہیں، ایک دن مسجد سے نکل رہا تھا کہ ان سے مڈبھیڑ ہو گئی، مجھے پکڑ کر ایک کتب فروش کی دکان پر لے گئے جس کی دکان مسجد سے متصل تھی۔ کہنے لگے ایک شاگرد نے جان عذاب میں ڈال دی ہے، میں بیمار ہوں، وہ غزل کے لیے متقاضی ہے۔ چند شعر اسی وقت کہہ دو۔"

---

[۱] شوخی رام پوری، نادر شاہ خاں رام پوری، شوخؔ تخلص بھی کرتے تھے۔ والد کا نام محمد ضامن خاں تھا۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ دہلی، ڈیرہ دون، بنارس اور کلکتہ میں بہ سلسلۂ تلاش معاش و ملازمت مقیم رہے، (خم خانۂ جاوید) ۱۸۶۰ء میں غالب کے سفر رام پور کے موقع پر ان سے رشتہ تلمذ اختیار کرنے کا دل چسپ واقعہ مولانا آزاد نے غلام رسول مہرؔ کے نام ایک خط میں لکھا ہے (نقش آزاد) بنارس کے قیام کے زمانے میں میرزا قادر بخش صابرؔ سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ آخری زمانہ کلکتہ میں بسر ہوا۔ مولانا آزاد کا امتحان لینے کا واقعہ یقیناً ۱۸۹۹ء کا ہے۔ ۱۳۱۷ھ (۱۹۰۰–۰۱ء) میں کلکتہ میں انتقال ہوا۔ میرے خاندان کے ایک بزرگ حوالدار عبدالغفار خاں جوہرؔ شاہجہانپوری۔ اس زمانے میں کلکتہ میں مقیم، وائسرائے کے باڈی گارڈ میں اور شوخی مرحوم کے شاگرد تھے۔ ان کے دیوان (قلمی) پر شوخی کی اصلاحیں ہیں، اور آخر میں شوخی مرحوم کے انتقال کا قطعۂ تاریخ بہ ایں عنوان و اشعار موجود ہے:

قطعۂ تاریخِ وفات جناب اوستادی نادر شاہ خاں صاحب شوخی مرحوم مغفور

حیف نادر شاہ خاں عالی خیال — رفت از دارِ فنا سوے جناں
بود او قادر کلام و نکتہ سنج — بود او خوش طبع، خوش دِل خوش بیاں
فکرِ عالی داشت چوں رفعت گزیں — او زمینِ شعر را کرد آسماں
شد چناں ماتم بپا از مرگِ او — گوئیا آمد قیامت در جہاں
بہرِ سالِ رحلتش کلکم نوشت — شوخیِ نادر بیان و پاک جاں

۱۳۱۷ھ

میں سمجھ گیا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ انھوں نے زمین تبلائی ــ" یاد نہ ہو۔ شاد نہ ہو" میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے چھ شعر کہہ دیے۔ کہنے لگے" اشعار کی تعداد طاق ہونی چاہیے، میں نے ایک شعر اور کہہ دیا:

وعدۂ وصل بھی کچھ طرفہ تماشے کی ہے بات
میں تو بھولوں نہ کبھی ان کو کبھی یاد نہ ہو!

کہنے لگے" صورت سے تو دس بارہ برس کے صاحبزادے معلوم ہوتے ہو۔ لیکن خدا کی قسم عقل باور نہیں کرتی۔"[۱]

اسی قسم کا واقعہ مولوی ظہیر احسن شوق نیموی کے ساتھ پیش آیا۔ مولانا ان سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے، لیکن جب ملاقات ہوئی تو انھیں شک ہوا کہ جو کلام وہ اصلاح کے لیے بھیجتے ہیں، انھی کا ہوتا ہے۔ لیکن جب دو، چار دن وہ رہے ان سے علمی مسائل پر گفتگوئیں ہوئیں اور پھر ان کے دیے ہوئے مصرعے پر غزل کہہ کر انھیں دکھلا دی تو ان کا شک دور ہوا۔[۲]

(۲)

نیرنگِ عالم:

شاعری کے شوق کی تکمیل کے لیے انھوں نے "نیرنگ عالم" کے نام سے ایک گلدستہ نکالا۔ نیرنگِ عالم کن ولولوں اور تمناؤں کے ساتھ منصۂ شہود پر آیا تھا۔ مولانا کے الفاظ میں پڑھیے:

"طبیعت کا یہ شوق اس قدر بڑھا کہ ایک گل دستہ نکالنے کا خبط ہوا۔ گویا اس وقت یہ خیال ہوا تھا کہ شاعری کی تکمیل کے لیے اس منزل کا طے کرنا بھی ضروری ہے۔ گل دستہ بلا روپے کے نکل نہیں سکتا تھا۔ مگر اس وقت کے خیالات بھی عجیب تھے۔ ہمارا خیال یہ تھا کہ جس قدر بھی روپے کی ضرورت ہے صرف پہلے نمبر کے لیے ہے، اور جہاں ایک نمبر نکل گیا تو تمام دنیا اس

---

[۱] نقشِ آزاد (خطوط مولانا ابوالکلام آزاد) مرتبہ مولانا غلام رسول مہر، کتاب منزل لاہور، ۱۹۵۸ء ص ۸-۱۰۷
[۲] آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، محولۂ بالا: ص ۲۱۲۔

طرح اس کے انتظار میں ہے کہ فوراً ہزاروں آدمی اس کے خریدار ہو جائیں گے۔ پھر روپے کی کیا کمی رہے گی۔

چناں چہ ہم نے اس وقت کے بچپنے اور طالب علمی کی بے سروسامانی میں پچاس روپے کا انتظام کیا۔ لیتھو کا ایک پریس "ہادی پریس" کے نام سے ہریسن روڈ کلکتہ میں تھا۔ والد مرحوم کی بعض چیزیں وہاں چھپا کرتی تھیں۔ ہم نے وہیں طباعت کا انتظام کیا اور فوراً اعلان چھاپ کر شائع کر دیا۔ اعلان کا مضمون عبدالواحد نے لکھا تھا۔ اس کا نام "نیرنگِ عالم" تجویز کیا گیا۔ اس تصور سے کس قدر طبیعت کو مسرت حاصل ہوئی تھی کہ عن قریب ایک ایسی چیز نکلے گی۔ جس کی لوح پر میرا نام بہ حیثیت مہتمم و ایڈیٹر کے درج ہو گا، پہلے نمبر کے لیے۔ طرح "ملنے کے لیے اور مچلنے کے لیے" قرار دی تھی۔ چناں چہ غزلیات کا کافی ذخیرہ فراہم ہو گیا۔ جلال مرحوم شوق، خورشید جاوید، اختر، احسان شاہجہان پوری سے خاص طور پر غزلیں منگوائی تھیں اور انھوں نے بھیج دی تھیں چناں چہ پہلا نمبر چھپ کر شائع ہوا، اور اب اپنی توقع کے مطابق ہم اس انتظار میں ہوئے کہ کم از کم ایک ہزار خریدار دوسرے نمبر کی اشاعت سے پہلے فراہم ہو جائیں گے۔ لیکن اس کا نتیجہ ظاہر تھا۔ بہ مشکل ڈیڑھ سو درخواستیں آئیں، اور ان میں سے تھوڑے ہی آدمیوں نے پیشگی قیمت بھیجی۔ تاہم ہم نے ہمت نہ ہاری، اور چند مہینوں تک اسے جاری رکھا۔"[1]

نیرنگِ عالم کے پرچے ابھی تک کہیں دستیاب نہیں ہوئے، اس لیے اس کے زمانۂ اشاعت کا قطعی تعین تو مشکل ہے۔ لیکن زمانے کا اندازہ ضرور لگایا جا سکتا ہے۔ خدنگ نظر لکھنؤ بابت ماہ جون ۱۸۹۹ء میں مولانا کی جو غزل چھپی ہے۔ اس میں ان کا نام اس طرح چھپا ہے:

"آزاد۔ جناب مولوی غلام محی الدین مہتمم گلدستہ نیرنگِ عالم" ان الفاظ نے یہ مسئلہ صاف کر دیا کہ نیرنگ عالم کا زمانہ ۱۸۹۹ء ہے، اگرچہ اس کے اجرا و بندش کے مہینوں کا تعین اس سے بھی زیادہ نہیں ہوتا۔ لیکن سال اور اس کے حصے کے بارے میں کوئی شبہ نہیں۔

---

[1] آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی ص ۲۴۳۔

یعنی وسط ۱۸۹۹ء میں نیرنگ عالم کے وجود کا پتا چلتا ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا کی شاعری کی ابتداء ۱۸۹۸ء میں ہوئی ہوگی۔ چند ماہ کی مشق کے بعد انھوں نے وہ غزل کہی جو مولوی عبدالواحد سہسرامی کو سنائی اور ارمغان فرخ کی اشاعت جنوری ۱۸۹۹ء میں چھپی تھی۔ اس کے بعد کچھ کلام کی اشاعت، مشاعروں میں شرکت اور لوگوں کی داد و تحسین نے انھیں گلدستہ نیرنگِ عالم نکالنے کی ہمت دلائی ہوگی۔

نیرنگِ عالم کا ابھی تک کہیں کوئی پرچہ دستیاب نہیں ہوا۔ اس لیے مولانا کے اس میں مطبوعہ کلام پر بھی پردہ پڑا ہوا ہے۔

مثنوی اور دیوان :

۱۹۰۰ء سے ۱۹۰۳ء کی درمیانی مدت مولانا کی شاعری کے عروج کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں انھوں نے فارسی شاعری کی طرف بھی توجہ کی۔ اس زمانے میں مولانا نے فارسی میں ایک مثنوی بھی لکھی تھی۔ فرماتے ہیں :

> "اس زمانے میں فارسی شاعری کی طرف بھی طبیعت کو توجہ ہوئی اور نل و دمن کے وزن پر ایک مثنوی لکھنا شروع کی۔"[1]

"ذکرِ آزاد" میں جہاں مولانا نے اپنی ۱۳ برس سے ۱۸ برس کی عمر تک کی تصانیف کا ذکر کیا ہے، وہاں دیوان غزلیات کا نام بھی ملتا ہے[2]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے اپنی غزلیات کو مجموعے کی صورت میں مرتب کر دیا تھا۔

مولانا کی وفات کے بعد ان کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ جن مصنفات و مسودات کا علم ہوا ہے۔ ان میں مثنوی یا دیوان غزلیات نہیں ہے۔ اس لیے یقین کر لینا چاہیے کہ مولانا کا کلام ان کی زندگی ہی میں ضائع ہو گیا تھا۔

---

[1] ایضاً ص۲۲۳

[2] ذکرِ آزاد ص۲۸۱

(۳)

عبدالواحد خاں :

مولانا آزاد کو شاعری کا شوق مولوی عبدالواحد خاں سہسرامی المتخلص بہ ادیب کی وجہ سے ہوا، ابتداءً انھیں سے مولانا مشورہ سخن کرتے تھے۔ اس لیے شاعری میں مولانا کا پہلا استاد انھیں کو سمجھنا چاہیے۔ موصوف مولوی محمد فاروق چریا کوٹی کے ایک مستعد شاگرد تھے۔ مولانا کے یہاں ان کی آمد و رفت ہوئی تو وہ مولانا کو اپنی غزلیں سناتے، اردو شعرا کا ذکر کرتے، ان کے مقابلوں اور معرکوں کے قصے اور لطیفے سناتے، خاص خاص اشعار کے متعلق جو واقعات مشہور ہیں ان کا ذکر کرتے، اس سے مولانا کی دلچسپی شاعری سے روز بروز بڑھنے لگی۔ اسی شوق میں مولانا نے مختلف شعرا کے دواوین منگوائے اور مطالعہ شروع کیا۔ ساتھ ہی خود بھی طبع آزمائی کرنے لگے۔ لیکن اس وقت مولانا کے الفاظ میں حالت یہ تھی کہ "چوں کہ خود اعتمادی پیدا نہیں ہوئی تھی اس لیے مولوی عبدالواحد خاں کو بھی نہیں سنائے" چوں کہ اس وقت تک مولانا کا شوق کسی پر ظاہر نہیں ہوا تھا۔ خود ہی غور و فکر سے کام لیتے اور کاٹ چھانٹ کرتے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد جب مولانا کا یہ شوق مولوی عبدالواحد خاں پر ظاہر ہو گیا تو ان سے مشورہ بھی کرنے لگے تھے۔ اور مولانا ہی کے بقول ان سے بہت مدد ملتی تھی۔ مولانا کے الفاظ یہ ہیں :

> "اب رات دن طبیعت پر غالب ذوق اس کا رہنے لگا تھا، اس وقت تک شعر گوئی کی حالت یہ تھی کہ نہایت فکر و کاوش سے خود کہنا اور خود ہی کاٹ چھانٹ کرتا رہتا۔ باقاعدہ کسی سے اصلاح نہیں لی تھی۔ مولوی عبدالواحد خاں سے بہت مدد ملتی رہتی تھی۔ گو وہ خود کچھ بہتر نہیں کہتے تھے۔ لیکن واقفیت اچھی تھی۔" [۱]

اس لیے باقاعدہ تو نہیں غیر رسمی طور پر مولوی عبدالواحد خاں کو شاعری میں مولانا آزاد کے استاد ہونے کا شرف حاصل ہے۔

---

[۱] آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی ص۲۴۱۔

امیر مینائی :

مولانا پوری طرح اس میدان میں آگئے اور اپنے ذاتی غور و فکر کاٹ چھانٹ اور عبدالواحد خاں کے مشورے اور اصلاح اور ان کی مدد کو کافی نہ سمجھا تو کسی باقاعدہ استاد کی تلاش ہوئی۔ امیر مینائی چوں کہ اس زمانے میں استاد کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے۔ مولانا کی نظر نے آپ ہی کا انتخاب کیا۔ اور اپنی دو غزلیں ان کی خدمت میں اصلاح کے لیے بھیجیں۔ انھوں نے اصلاح کرکے فوراً واپس کر دیں لیکن مولانا کی طبیعت ان کی اصلاح سے مطمئن نہ ہوئی مولانا فرماتے ہیں :

"اب خیال پیدا ہوا کہ کسی مستند استاد کی شاگردی بھی کرنی چاہیے۔ چناں چہ پہلے منشی امیر احمد مرحوم کو دو غزلیں بھیجیں، اور انھوں نے اصلاح کرکے فوراً واپس بھیج دیں۔ لیکن میری طبیعت کچھ زیادہ خوش نہ ہوئی۔"[۵]

میرا خیال ہے کہ امیر مینائی کی شاگردی کا زمانہ اواخر ۱۸۹۹ء ہوگا، اس لیے کہ ۱۹۰۰ء کے شروع میں امیر نے حیدر آباد دکن کا سفر کیا تھا۔ ۱۳ر اکتوبر ۱۹۰۰ء کو ایک ماہ نو دن بیمار رہ کر حیدر آباد دکن ہی میں انتقال کیا :

افسوس تجھ کو رحم نہ آیا کچھ اے اجل　　　مارا کہاں امیر غریب الدیار کو

داغ مرحوم نے دعائیہ تاریخ کہی :

ہے دعا بھی داغ کی تاریخ بھی　　　قصر عالی پائے جنت میں امیر

مولانا آزاد نے بھی اپنے استاد مرحوم کے انتقال پر قطعۂ تاریخِ وفات کہا جو خدنگ نظر کے شمارہ نومبر ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا تھا۔

شوق نیموی :

امیر مینائی کے بعد مولانا کی نگہ انتخاب شوق نیموی پر پڑی۔ ان سے متاثر ہونے اور ان سے اصلاح لینے پر آمادگی کے اسباب کے سلسلے میں مولانا فرماتے ہیں :

۵۔ ایضاً ص ۲۴

"اس زمانے میں ایسا ہوا کہ شاعری کے متعلق کتابوں کی جستجو میں رسالۂ اصلاح، اور" ازاحتہ الاغلاط،، لکھنؤ سے منگوایا، یہ دونوں رسالے مولوی ظہیر احسن شوق نیموی کے تھے، اور فوائد متعلقہ شعر گوئی اور مباحث متروکات و تصحیح اغلاط میں نہایت مستند ہیں۔ ان رسالوں سے ان کی دیگر تصانیف کا حال معلوم ہوا۔ اور پھر براہِ راست انھیں لکھ کر پٹنہ سے تمام کتابیں منگوائیں۔ ان میں سرمۂ تحقیق" اور" یادگارِ وطن" بھی تھی، سرمۂ تحقیق جلال مرحوم کے رد میں ہے، اور ان کے اُردو لغتوں پر اعتراضات کیے ہیں۔" یادگارِ وطن" میں اپنے وہ معرکے بیان کیے ہیں۔ جو جگنو اور جگنی اور بعض دیگر الفاظ و محاورات کے بارے میں، ان کے جلال مرحوم سے ہوئے تھے۔"

"اس وقت جیسی طبیعت اور جیسے معاملات تھے اس کے لحاظ سے ان حالات کا بہت زیادہ اثر پڑا۔ اور ان کی شاعرانہ واقفیت دل پر نقش ہو گئی، علی الخصوص یہ کہ شعر گوئی کے ساتھ قواعد واصول اور زبان کے مباحث پر ان کو ایسا اچھا عبور تھا کہ ایک پوربی دیہاتی ہو کر جلال مرحوم جیسے صاحبِ دعویٰ کو شکست فاش دے دی۔"

نتیجہ یہ نکلا کہ میں نے ان سے خط و کتابت کی۔ اور اصلاح لینی شروع کی۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بہت جی لگا کر اصلاح دیتے تھے اور بعض اوقات غزل کے ساتھ ایک ایک صفحے کے فوائد بھی، جن کا کچھ تعلق اشعارِ زیرِ اصلاح سے ہوتا تھا، لکھتے تھے۔"[1]

اگرچہ اس زمانے میں داغ کی استادی کا ڈنکا بج رہا تھا، اور عوام و خواص میں بہت ہر دل عزیز اور مشہور تھے اور اکثر بتدی شعرا اصلاح کلام کے لیے ان سے رجوع کرتے تھے، خود مولانا آزاد کے بڑے بھائی مولوی غلام یٰسین آہ داغ کی اسی شہرت اور ہر دلعزیزی سے متاثر ہو کر ان سے اصلاح لینے لگے تھے۔ لیکن مولانا آزاد کے نزدیک استادی کے لیے جو معیار تھا وہ شہرت اور ہر دلعزیزی سے مختلف تھا۔ اس معیار پہ داغ تو پورے نہ اترے۔

---

[1] ایضاً ص۲۱۲

یہ دستارِ فضیلت اور جبۂ استادی حضرت ظہیر احسن شوقؔ نیموی کے قامت زیبا پہ موزوں ہوا۔ یہ اصول کیا تھا ؟ مولانا فرماتے ہیں :

"بھائی مرحوم نے داغ سے اصلاح لینا شروع کر دیا تھا مجھے اس وقت یہ خیال ہوا تھا کہ اصلاح میں شہرت سے زیادہ اس بات کو دیکھنا چاہیے کہ معلومات اور فن کے اعتبار سے کون شخص زیادہ مفید ہو سکتا ہے۔" ؎۱

اگرچہ مولانا آزاد نے شہرت کے مقابلے میں وسعتِ معلومات اور فنی مہارت و واقفیت کو ترجیح دی۔ لیکن اگر عام نفسیات کے پیش نظر غور کیا جائے تو عام بتدی شعرا کے لیے مولانا آزاد کے بتائے ہوئے اصول میں کوئی کشش نہیں ہے۔ عام شعرا کے پیش نظر اصلاح کلام کے ساتھ متعارف ہونے اور شہرت حاصل کرنے کا جذبہ بھی ہوتا ہے ، اور اس جذبے کی تسکین اسی طرح ممکن ہے کہ کسی مشہور اور ہر دلعزیز شاعر کو استاد بنایا جائے ، تاکہ اس کے سہارے سے خود کو بھی متعارف ہونے اور شہرت حاصل کرنے کا موقع ملے۔ لیکن اس صورت میں یہ خطرہ ہے کہ شہرت حاصل کرنے اور مداحین کا ایک حلقہ پیدا کرنے میں تو کامیابی حاصل ہو جائے ، لیکن فنی اصلاح اور پختگی پس پشت پڑ جائے۔ دوسری صورت میں یہ ممکن ہے کہ بتدی شاعر کے کلام میں رفتہ رفتہ فنی پختگی پیدا ہو جائے۔ اور زبان و بیان اور عروض و لغت کے اسقام تو کلام سے دُور ہو جائیں ، لیکن اُس قدر شہرت حاصل نہ ہو۔

ظہیر احسن شوقؔ اپنے وقت کے ایک بڑے عالم ، فاضل اور دین دار بزرگ تھے۔ حدیث پر انھیں خصوصاً عبور حاصل تھا اور اس لیے محدث مشہور تھے۔ شاعری میں بھی اپنے وقت کے مانے ہوئے استاد تھے قواعد ، اصولِ زبان کے مباحث اور عروض پر ان کو جس درجے کمال حاصل تھا ، خود مولانا اس کے معترف تھے۔

مولانا کو اصلاح لیتے اگرچہ ایک مدت گزر چکی تھی۔ لیکن ملاقات کی نوبت ابھی تک نہ آئی تھی۔ ۲ / اپریل ۱۹۰۲ء میں جب شوقؔ نیموی نے کلکتہ کا سفر کیا۔ اور مولانا آزاد کے مکان پر قیام کیا ، ملاقات اس وقت ہوئی ، مولانا آزاد چوں کہ ۱۴ ، ۱۵ برس کی عمر میں بھی اچھے خاصے شعر نکال لیتے تھے۔ اس لیے شوقؔ مرحوم کے وہم و خیال میں بھی نہ تھا کہ آزاد ایک پختہ عمر کا

؎۱ ایضاً ص ۲۱۲

فاضل شخص نہیں بلکہ ۱۴-۱۵ سال کا لڑکا ہے۔ چنانچہ جب وہ کلکتہ تشریف لائے اور مولانا آزاد ان کو اسٹیشن پر لینے گئے، اور اپنا تعارف کرایا تو انھیں یقین ہی نہ آیا کہ یہ وہی آزاد .... ہے جو اصلاح کے لیے انھیں اپنا کلام بھیجتا ہے۔ انھیں شبہ تھا کہ یا تو یہ آزاد نہیں یا پھر جو کلام انھیں بھیجا جاتا ہے وہ کسی اور کا ہوگا، مولانا فرماتے ہیں :

"مولوی ظہیر احسن مرحوم، جن سے میں نے شاعری میں اصلاح لینی شروع کی تھی، عرصے کی خط و کتابت اور معائنہ کلام کے بعد جب کلکتہ آئے اور اسٹیشن پر میں ان سے ملا تو مکان تک، راستے بھر وہ بالکل گم رہے اور بار بار اس طرح پوچھتے رہے کہ گویا ان کو ابھی اس میں شک ہے کہ جو کلام میں ان کو بھیجتا ہوں، وہ میرا نہیں کسی اور کا لکھا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ دو چار دن رہے اور ہر طرح کی گفتگو اور مباحث میرے سُنے اور اُسی زمانے میں ایک مختصر مشاعرہ بھی ترتیب پایا، جس میں خود انھوں نے دوپہر کے وقت مصرعِ طرح مجھے دیا اور مغرب تک میں نے اکتالیس شعر لکھ کر انھیں دے دیے تب ان کی بدگمانی تو دُور ہوئی، مگر استعجاب باقی رہا۔" [1]

شوق نیموی کا ۲۵ / نومبر ۱۹۰۲ء کو جمعے کے روز انتقال ہوا۔

ظہور میرٹھی :

مولانا کے کلام میں جو سب سے پہلی نعت سفینۂ نجات کے حوالے سے نقل کی گئی ہے اس میں مولانا کے نام کے ساتھ "شاگرد مولوی امداد حسین ظہورؔ میرٹھی" لکھا ہے۔ اس رشتہ تلمذ کی مولانا کے کسی بیان یا تحریر سے تصدیق نہیں ہوتی یا کم از کم میری نظر سے کوئی ایسی تحریر نہیں گزری جس میں ظہورؔ میرٹھی سے تلمذ کا اظہار یا اعتراف کیا گیا ہو۔ اس سے انکار کی بھی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اس لیے کہ یہ قطعی ممکن ہے کہ بمبئی کے سفر و قیام کے زمانے میں مولانا نے ان کو بھی اپنی کوئی غزل یا نعت دکھائی ہو، اور اصلاح لی ہو۔ ایک اور تعجب انگیز بات یہ ہے کہ اس نعت کے ساتھ مولانا کا جو نام اور تعارفی الفاظ درج ہیں وہ بھی عام

---

[1] ایضاً ص ۲۱۲۔

رسم سے کچھ مختلف ہیں۔ مثلاً پورا نام اس طرح درج ہے "غلام محی الدین خاں آزاد رئیس بمبئی"۔ اس میں خان اور رئیس بمبئی کے الفاظ کھٹکتے ہیں۔ لیکن صحن چمن نگینہ میں مولانا کی جو نعت چھپی ہے اس میں اس نعت کے چار شعر مشترک ہیں اور مولوی محمد یوسف جعفری رنجور مرحوم کے ذخیرۂ علمی سے مولانا کی ایک طویل غزل جو ۵۹ اشعار پر مشتمل ہے دستیاب ہوئی ہے اس میں اس غزل کے ۲۷ اشعار شامل ہیں۔ اس اشتراک اشعار کی وجہ سے اس بات میں کوئی شبہ نہیں باقی رہ جاتا کہ سفینۂ نجات اور صحن چمن کی مطبوعہ نعت اور غزل ایک ہی شاعر کا کلام ہے، اور وہ شاعر ہمارا ممدوح محی الدین ابوالکلام آزاد ہے۔ مولانا کی سج دھج اور رئیسانہ ٹھاٹ دیکھ کر ایڈیٹر نے رئیس بمبئی لکھ دیا، اور کسی رئیس کو خان صاحب بنا دینا معمولی بات ہے۔

مرزا محمد حسین طبیلسی:

فارسی کلام کی اصلاح انھوں نے مرزا محمد حسین طبیلسی سے لی۔ مولانا نے ان کی قابلیت اور حکیمانہ مشرب کا ذکر کیا ہے۔ مرزا صاحب موصوف عراق کے رہنے والے تھے۔ وہ آغا محمد سنجر کے ساتھ ہندوستان آئے تھے۔ کلکتہ میں کچھ مدت ان کا قیام رہا تھا۔ مولانا آزاد نے جس زمانے کا تذکرہ کیا ہے، میرے اندازے کے مطابق ۱۹۰۰ء سے ۱۹۰۳ء تک کا زمانہ تھا۔ مولانا نے عربی و فارسی میں ان کے کمال انشا پردازی کا اعتراف کیا ہے فرماتے ہیں:

> "عربی کے بہت اچھے ادیب تھے اور فارسی تحریر میں تو میں نے ان سے بہتر لکھنے والا شخص کوئی نہیں دیکھا۔"

مولانا کو موصوف کی صحبت سے بہت فایدہ پہنچا۔ مولانا فرماتے ہیں:

> "پہلا فایدہ تو یہ تھا کہ گفتگو ان سے فارسی میں ہوتی تھی، اور وہ برابر غلط محاورات اور ہندی ترکیبوں پر ٹوکتے رہتے تھے۔ اس طرح فارسی بول چال اور محاورات کے وہ صدہا بھید جو کتابوں سے کسی طرح حاصل ہی نہیں ہو سکتے تھے، ان سے حاصل ہوئے۔ ساتھ ہی میں ان کو اپنی فارسی تحریریں دکھلاتا اور اصلاح لیتا تھا، طریقہ یہ تھا کہ میں کسی اردو کتاب کو لے لیتا اور اس کا فارسی ترجمہ کرنے لگتا۔ چناں چہ تذکرہ آب حیات، حصہ اول دو یا دوم تک فارسی

میں ترجمہ کر کے ان کو دکھلایا اور اصلاح لی۔ شاعری میں بھی ان سے اصلاح لیتا تھا۔" [1]

(۴)

مولانا آزاد کو شاعری کا ملکہ قدرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا تھا۔ شعر انھوں نے نہیں کہے، ان کی شاعرانہ طبیعت نے کہلوائے۔ وہ پیدائشی شاعر تھے، اس لیے جوں ہی مولوی عبدالواحد خاں کی صحبتوں میں ان کی شاعرانہ فطرت جاگی اور خیالات کو تحریک ہوئی۔ ان کا کلام قالبِ موزوں اختیار کرتا گیا۔

فطری مناسبت کے ساتھ انھوں نے خارجی ضروریات پر بھی توجہ دی۔ شعرا کے تذکروں، کلام کے مجموعوں، گلدستوں، قواعد و عروض اور لغت و بیان کے مباحث کے مطالعے سے انھوں نے زبان پر بھی بہت جلد عبور حاصل کر لیا۔ اس طرح شاعری کے لیے فطری مناسبت کے ساتھ زبان و بیان پر عبور اور فن سے واقفیت تمام ضروری چیزیں مہیا ہوگئیں۔

مولانا نے غالباً ہر صنف شاعری میں طبع آزمائی کی، غزل، مثنوی، رباعی، قطعہ، تاریخ ..... نعت وغیرہ میں ان کا کلام موجود ہے۔ اور ہر صنف کا کلام حسن الفاظ و معنی کے لحاظ سے اس سے بہت بلند ہے جتنا کہ ان کی عمر کے ایک بچے کا کلام تصور کیا جا سکتا ہے۔

اردو کلام کے ساتھ فارسی کلام بھی ہے، اور اس میں بھی۔ نظم مثنوی، غزل اور رباعی موجود ہے۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ جو خصوصیات ان کے اُردو کلام میں ہیں وہ فارسی کلام میں بھی موجود ہیں۔

مولانا آزاد کا کلام اس لیے موضوع مطالعہ نہیں ہونا چاہیے کہ یہ کوئی اعلیٰ درجے کا کلام ہے۔ بلکہ اس لیے کہ یہ ان کی ۱۰ برس سے لے کر ۱۵، ۱۶ برس کی عمر تک کی تک بندیوں کے نمونے ہیں۔ اور اس آئینے میں ہم ان کی شخصیت کی اٹھان کو دیکھ سکتے ہیں۔ ان سے مولانا کے ابتدائی رجحانات ان کے افکار کی تعمیر اور شخصیت کے نشو و نما کے بارے میں اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

---

[1] ایضاً ص ۲۲۶۔

یہ ۱۶ برس سے کم عمر کے ایک بچے کا کلام ہے۔ اگر اس کو اس زمانے میں پسند کیا گیا تو اس لیے کہ اس عمر میں صحیح اُردو نثر کی دو سطریں لکھنے کی توقع بھی کم از کم مولانا آزاد سے نہیں کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ اُردو نہ تو اُن کی مادری زبان تھی، نہ اُنھوں نے باقاعدہ کسی سے اس کی تحصیل کی تھی۔ صرف اپنی ذاتی محنت اور شوق سے انھوں نے یہ استعداد بہم پہنچائی تھی، یہ بات جس طرح اس وقت باعثِ حیرت تھی، آج بھی اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ مولانا آزاد واقعی ابوالکلام تو بعد کو ہوئے لیکن ان کی ابوالکلامیت کی جھلک ان کی ان تک بندیوں میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کی شخصیت کے مطالعے اور تجزیے میں ان ابتدائی نقوش کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

کلام

مولانا ابوالکلام آزاد

نعتیہ کلام

نعت

موزوں کلام میں جو ثنا سے بنی ہوئی
تو ابتدا میں طبعِ رواں منتہی ہوئی

ہر بیت میں جو وصفِ پیمبر کیے رقم
کاشانۂ سخن میں مرے روشنی ہوئی

کچھ تازہ رونقیں قدمِ مصطفےٰؐ سے ہیں
رضواں یہ کہہ رہا ہے کہ جنت نئی ہوئی

تاریک شب میں آپ نے رکھا جہاں قدم
مہتابِ نقشِ پا سے وہاں روشنی ہوئی

آزادؔ اور فکر جگہ پائے گی کہاں
الفت ہے دل میں شاہِ زمن کی بھری ہوئی

سفینۂ نجات بمبئی اپریل سنہ ۱۹۰۰ئہ بشکریہ جناب افسر صدیقی امروہوی۔

نعت

موزوں کلام میں جو ثنائے نبیؐ ہوئی
تو ابتدا سے طبع رواں منتہی ہوئی

ہر بیت میں جو وصف پیمبرؐ رقم کیے
کاشانۂ سخن میں بڑی روشنی ہوئی

ظلمت رہی نہ پر توِ حسنِ رسولؐ سے
بیکار اسے فلک شبِ مہتاب بھی ہوئی

ساقیِ سلسبیل کے اوصاف جب پڑھے
محفل تمام مست مے بے خودی ہوئی

دل کھول کر رسولؐ سے میں نے کیے سوال
ہرگز طلب میں عار نہ پیشِ سخی ہوئی

تاریک شب میں آپؐ نے رکھا جہاں قدم
مہتابِ نقشِ پا سے وہاں روشنی ہوئی

ہے شاہِ دیں سے کوثر و تسنیم کا کلام
یہ آبرو تمام ہے حضرتؐ کی دی ہوئی

سالک ہے جو کہ جادۂ عشقِ رسولؐ کا
جنّت کی راہ اس کے لیے ہے کھلی ہوئی

آزادؔ اور فکر جگہ پائے گی کہاں
الفت ہے دل میں شاہِ زمن کی بھری ہوئی

ایضاً

بہ قافیۂ حرف روی

وصفِ نبیؐ سے نظم کی یہ برتری ہوئی
طوبیٰ کی طرح شاخِ مضامیں ہری ہوئی

مژدہ گدائے شہ کو دیا یہ سروش نے
حاصل دیارِ دیں میں تجھے افسری ہوئی

پہنچوں گا حشر سے چمنستانِ خُلد میں
عشقِ رسولِ حق کی اگر رہبری ہوئی

شمّہ ثنائے شاہِ رسلؐ کا نہ لکھ سکے
بے کار شاعروں کی سخن گستری ہوئی

اوصاف جب لکھے دُرِ دندان پاک کے
عالم میں اپنی طبع رسا جوہری ہوئی

یادِ نبیؐ میں دولتِ عقبیٰ حصول ہے
کیا غم جو اِس جہاں میں مجھے بے زری ہوئی

اعجازِ مصطفےٰؐ کے ہوئے دل سے معتقد
باطل فسوں گروں کی جو افسوں گری ہوئی

حسنِ حبیبؐ حق کی تجلّی کے رُو برو
تاریک تر ضیاءِ مہ و مشتری ہوئی

آزادؔ وصفِ نورِ نبیؐ جب رقم کیا
شہرت زمانے میں صفتِ انوری ہوئی

ایضاً

بہ تبدیلِ قافیہ

ہے اُمّتِ رسولؐ سے جنّت بھری ہوئی
جنّت میں ہے رسولؐ کی امّت بھری ہوئی

معمور دل ہے یادِ شہِ مشرقین سے
اس گھر میں دو جہاں کی ہے دولت بھری ہوئی

میں افصح العربؐ کا ثنا گو ہوں دوستو
کیوں کر نہ ہو سخن میں فصاحت بھری ہوئی

پاتے تھے لوگ خطبۂ احمدؐ سے لذتیں
کیا بات بات میں تھی حلاوت بھری ہوئی

ہے قدسیانِ خاص کو بھی آپ سے خلوص
دل میں ہے ہر مَلَک کے ارادت بھری ہوئی

کعبہ سے منزلت میں نہیں کم دلِ حزیں
ختمِ رسلؐ کی ہے جو محبت بھری ہوئی

آزادؔ پر بھی ہونگے لطف یا رسولؐ
ہے دل میں آرزوے شفاعت بھری ہوئی[1]

---

[1] ماہنامہ "صحن چمن" نگینہ ضلع بجنور بابت ماہ ستمبر ۱۹۰۲ء

غزلیات

غزل

کیوں اسیرِ گیسوئے خم دار قاتل ہوگیا
ہائے کیا بیٹھے بٹھائے تجھ کو اے دل ہوگیا

کوئی نالاں کوئی گریاں، کوئی بسمل ہوگیا
اُس کے اُٹھتے ہی دگرگوں رنگ محفل ہوگیا

تم نے مارا غیر کو اور رشک نے مارا مجھے
اس نے تن پر کھائیں تلواریں میں بسمل ہوگیا

اس نے تلواریں لگائیں ایسے کچھ انداز سے
دل کا ہر ارماں فدائے دستِ قاتل ہوگیا

انتظار اس گل کا اس درجہ کیا گلزار میں
نورِ آخر دیدۂ نرگس کا زائل ہوگیا

یہ بھی قیدی بن گیا آخر کمندِ زلف کا
لے اسیروں میں ترے آزادؔ شامل ہوگیا

خدنگِ نظر لکھنؤ جون ۱۸۹۹ء

یہی غزل ہے جو مخزن لاہور بابت ماہ اپریل ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں تیسرا شعر نہیں ہے، اور پانچویں نمبر پر یہ شعر ہے۔

قیس مجنوں کا تصور بڑھ گیا جب نجد میں ہر بگولا دشت کا لیلےٰ کا محمل ہوگیا

نیز مخزن والی غزل کے مقطع کے مصرع اُولیٰ میں "بن گیا" کی جگہ "ہوگیا" ہے: اشعار کی تعداد (۶) دونوں میں برابر ہے۔

قیس مجنوں کا تصور بڑھ گیا جب نجد میں ہر بگولا دشت کا لیلےٰ کا محمل ہوگیا۔

باسمہٖ سبحانہٗ

غزل

برطرح مشاعرہ تاریخ ۱۹ر اکتوبر ۱۹۰۱ء مرتبہ مشفقی میر اخلاق حسین
صاحب اخلاق دہلوی دام لطفہٗ
از خادم العلماء بندہ محی الدین احمد المتخلص بہ آزاد دہلوی مقیم کلکتہ

مصرع طرح
"توبہ کا نام لیں مرے دشمن بہار میں"

چھوڑا نہ غم نے کچھ بھی مرے جسم زار میں
اک جان ہے سو وہ بھی ترے اختیار میں

ٹھہری نہ خاک قیس بھی دم بھر مزار میں
پیدا ہوئے ہیں لاکھ بگولے غبار میں

ہے عکس روئے یار دلِ داغ دار میں
کچھ تیرگی نہیں ہے ہمارے مزار میں

کچھ ایسے محو ہو گئے اقرارِ یار میں
لطف انتظار کا نہ ملا انتظار میں

پیدا ہے رنگ حسن جوانی سے یار میں
جوبن پہ جس طرح سے ہو گلشن بہار میں

نکلی ہے جان حسرتِ دیدارِ یار میں
آنکھیں کھلی ہوئی ہیں ابھی تک مزار میں

ہو میل کیوں نہ گیسو و رخسارِ یار میں
روزِ ازل سے ربط ہے لیل و نہار میں

محفل میں اپنی دیکھ کے مجھ کو وہ کہہ اٹھے
رسوا نہ کیجیے مجھے سو میں ہزار میں

لے نکلے گا تڑپ کے وہ مجھ کو بھی قبر سے
میں دل کے ساتھ نہ رہ سکوں گا مزار میں

آتش کدہ گلوں سے بنا ہے تمام باغ
چاروں طرف، اک آگ لگی ہے بہار میں

دل دے کے فرضِ عشق تو ہم کر چکے ادا
جو کچھ ہو اب مشیّتِ پروردگار میں

دو چند اس سے حسن پہ ان کو غرور ہے
جتنا نیاز و عجز ہے مجھ خاکسار میں

یوسف نہ تھا عزیز بہ چشم برادراں
اچھوں کی ہو گی قدر نہ اس روزگار میں

وہ پیاری پیاری شکل وہ اندازِ دلفریب
رہتا نہیں ہے دیکھ کے دل اختیار میں

کرتے ہو کیوں وہ کام کہ ملتا نہیں ہے چین
رہتے ہو کیوں کسی کے دلِ بے قرار میں

اے باغبان تو نے یہ کیسا غضب کیا
بلبل کا آشیانہ اجاڑا بہار میں!

ایسی بھری ہیں یار کے دل میں کدورتیں
نامہ لکھا ہے مجھ کو تو خطِ غبار میں

ہم کچھ بھی وصفِ کاکلِ پیچاں نہ لکھ سکے
مضموں اولجھ رہے ہیں قلم مشک بار میں

کچھ بھی نہ اس کی وعدہ خلافی کا رنج ہو
آجائے موت ہی جو شبِ انتظار میں

غمِ ہجر کے سہوں کہ محبت سے ہاتھ اٹھاؤں
افسوس کوئی بات نہیں اختیار میں

اے موت! تو ہی آ، کہ نہ آئیں گے وہ کبھی
آنکھیں ہیں ایک عمر سے وا انتظار میں

تصویر ہی وہ اپنی شبِ وعدہ بھیج دیں
تکلیفِ انتظار نہ ہو انتظار میں

افسردگیٔ عاشقِ بے کس کی حد نہیں
سینے میں دل ہے یا کوئی مردہ مزار میں

خونِ جگر کے پینے میں آتا ہے جو مزا
وہ ذائقہ نہیں ہے مئے خوش گوار میں

موقوف آرزو پہ ہیں سامان ہجر کے
بہلا سا طول اب نہیں شب ہائے تار میں

سمجھو! کہ کس کو کہتے ہیں تکلیفِ انتظار
بیٹھو! کبھی جو دیدۂ خوں نابہ بار میں

سودائے زلف و رخ میں غضب کا ہے انتشار
اب آ گئے ہیں گردشِ لیل و نہار میں

فرقت کی رات جس کے تصور میں کٹ گئی
ایسی تھی باڑھ خنجرِ ابروئے یار میں

کل تک مریضِ عشق تڑپتا تھا درد سے
جنبش کی تاب آج نہیں جسمِ زار میں

وہ پوچھتے ہیں نزع میں کیسا مزاج ہے
اب کیا کہوں؟ زبان نہیں اختیار میں

بیٹھے ہیں آج آپ تو پہلو میں غیر کے
ہم ہوں گے کل عروسِ اجل کے کنار میں

کھٹکیں نہ کیوں نگاہ میں غیروں کے رات دن
ہیں زلف و رخ کے عشق میں مژگانِ یار میں

مٹ کر ہوں خاک سرمے کے مانند بھی اگر
پھر بھی کبھی سمائیں نہ ہم چشمِ یار میں

مجبور ہو کے زیرِ زمیں جا کے لی پناہ
جب سختیاں اٹھا نہ سکے کوئے یار میں

ہوتے یونہیں کسی سے ہم آغوش تھے کبھی
آتا ہے ہم کو لطف لحد کے فشار میں

سب آرزوئیں دل کی نکالو شبِ وصال
دو چار بوسے آج بھلا کس شمار میں

میں آپ سے کدورتِ غم میں بھی صاف ہوں
منہ دیکھ لیجیے میرے دل کے غبار میں

پوچھا کسی عزیز نے آکر نہ بعدِ دفن
بتلا کہ کیا گزرتی ہے تجھ پہ مزار میں

کہنے لگے کہ آپ کی نیت تو ٹھیک ہے
بیتاب مجھ کو دیکھ کے بوس و کنار میں

شکوہ کریں تو کیا کریں جور و جفا کا ہم
سب عمر کٹ گئی ستمِ روزگار میں

مرنے کے بعد بھی ہے اسی طرح کشمکش
میں قبر میں ہوں دل ہے مرا کوئے یار میں

تقدیر کے لکھے کو مٹانا محال ہے
کیا دخل ہے مشیتِ پروردگار میں

بجلی سی کوند جاتی ہے گھونگھٹ کی آڑ میں
کیا شوخیاں ہیں اس نگہِ شرمسار میں

جس کو پہن کے سویا تھا گردن میں وہ حسین
خوشبوئے تازہ پاتا ہوں اس باسی ہار میں

دعوائے عاشقی پہ یہ کہنے لگا وہ بت
اللہ کی شان! آپ بھی ہیں اس شمار میں

پامال کیجیے گا سمجھ کر ذرا اسے
ہے آپ ہی کا گھر دلِ بے اختیار میں

کھٹکیں نہ کیوں نگاہ میں غیروں کی رات دن
رہتے ہیں ہم تصورِ مژگانِ یار میں

مجھ کو شبِ وصال نہیں ہے خیالِ ہجر
آتا نہیں ہے نام خزاں کا بہار میں

تیرے خیالِ دید نے بیدار کر دیا
جب آنکھ لگ گئی مری دم بھر مزار میں

اچھا ہوا کہ دل بھی گیا جان بھی گئی
دونوں عذاب تھے مجھے کنجِ مزار میں

اے دل خدا کی یاد میں اب صرف عمر ہو
کچھ کم پھرے صنم کدۂ روزگار میں

چپکے سے جب رقیب کو بیدار واں کیا
اللہ رے جذب! چونک گئے ہم مزار میں

میرا دلِ شگفتہ بھی اس نے پرو لیا
اک پھول اور بڑھ گیا پھولوں کے ہار میں

افشاں کی یاد میں مرا یہ حال ہو گیا
ذرے بھی سوجھتے نہیں گردِ غبار میں

گر ان پہ اختیار نہیں ہے نہیں سہی
غم ہے یہی کہ دل بھی نہیں اختیار میں

غیروں کے ساتھ فاتحہ پڑھنے جو آئے ہیں | یعنی نہ چین پاؤں میں دم بھر مزار میں
دل پر لگی وہ چوٹ کہ اُف کر کے رہ گئے | ٹوٹا جو گر کے جام کوئی بزمِ یار میں°
سودا نیا جنوں ہے نیا ولولے نئے | کچھ اور ہی بہار ہے اب کی بہار میں

وغیرہ وغیرہ وغیرہ [۱]

آزاد کو ہو اپنی تباہی کا کیا ملال
کس کو قیام ہستی ناپائیدار میں°

اس غزل کے ستائیس اشعار جن پر نشان ° لگا ہے ۔ ماہنامہ "صحنِ چمن" نگینہ ضلع بجنور بابت ماہ ستمبر ۱۹۰۲ء میں چھپ چکے ہیں ص۲۶۔

[۱] وغیرہ وغیرہ" تحریر فرمادینے سے شاید مولانا یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ اس غزل میں اور بھی کچھ اشعار تھے۔ جنھیں کسی وجہ سے چھوڑ دیا گیا ۔

باسمہٖ سبحانہٗ تعالیٰ

غزل

بہ فرمایش مکرمی و مخدومی مجتبیٰ مولانا مولوی محمد یوسف صاحب بجوز عظیم آبادی صادق پوری

از

بندۂ آزاد ابوالکلام محی الدین احمد دہلوی مقیم کلکتہ

(یہ غزل مولانا آزاد کے قلم سے دو جگہ نقل ہوئی ہے دونوں غزلوں میں نہ صرف ترتیب اشعار مختلف ہے بلکہ بعض لفظی فرق بھی موجود ہیں ۔ دوسری غزل میں ترتیب اشعار کو نمبروں کے ذریعے ظاہر کیا گیا ہے اور لفظی فرق کو حاشیہ میں ۔ کس غزل کا کونسا لفظ درست اور مناسب ہے ۔ یہاں اس سے بحث نہیں کی گئی ہے) ۔

۱- فراقِ یار میں دل یا جگر کو دیکھتے ہیں
جدھر لگی ہے ہمیں چوٹ اُدھر کو دیکھتے ہیں

۵- جفا کا شوق ہے کہتے ہیں ناز کی بھی ہیں
وہ پہلے تیغ کو اور پھر کمر کو دیکھتے ہیں

۳- کھلا ہے منہ جو لحد میں کھلا ہی رہنے دو
جگہ نئی ہے مسافر ہیں، گھر کو دیکھتے ہیں

۸- ہمارے درد کو جاتا ہے لا دوا کہہ کر
نگاہِ یاس سے ہم چارہ گر کو دیکھتے ہیں

۷- کسی میں تو نظر آجائے گا ترا جلوہ
اسی خیال سے ہم ہر بشر کو دیکھتے ہیں

۲- یہاں تک اپنی طبیعت ہے، بدگمان ان سے
کہ ان کی بزم میں ہر اک نظر کو دیکھتے ہیں

۹- جوانی آتے ہی ان کو غرورِ حسن آیا
کچھ اب بھری ہوئی ان کی نظر کو دیکھتے ہیں

۶- یہ کیوں؟ زباں سے ارشاد ہوگا خط کا جواب
کہ نامہ دیکھ کے اب نامہ بر کو دیکھتے ہیں

۱۲- غضب ہے، دیکھ کے غیروں کو وہ کنکھیوں سے
یہ پوچھتے ہیں کہو! ہم کدھر کو دیکھتے ہیں

۱۰- ہر اک سخن میں نہاں ہیں وہ صورتِ معنی
ہم ان کے حسن کے حسنِ اثر کو دیکھتے ہیں

۱۱- ستانے کو مجھے کہتے ہیں غیر کی نظریں
یہ وہ نظر ہیں کہ ہم جن نظر کو دیکھتے ہیں

۴۔ تسلیاں شبِ فرقت میں دیں گے آخرکار　　ابھی ترقی دردِ جگر کو دیکھتے ہیں

۱۲۔ پڑے لچک نہ کہیں راہ میں بوقتِ خرام　　سنبھل سنبھل کے وہ اپنی کمر کو دیکھتے ہیں

۴۔ وہ خود ہی ہو گئے آزاد طالبِ دیدار[۸]
ہم[۹] آہ آہ کے حسنِ اثر کو دیکھتے ہیں

---

[۱] دوسری غزل میں "ہے" ہے۔ [۲] دوسری غزل میں "کر" کے بجائے "کے" ہے۔
[۳] دوسری غزل میں "اک اک" ہے۔ [۴] دوسری غزل میں "آتی ہے" ہے۔
[۵] دوسری غزل میں "ایک" ہے۔ [۶] دوسری غزل میں "ستانے کے لیے" ہے۔
[۷] دوسری غزل میں "نظر ہیں" اور لفظ "جس" آیا ہے۔ [۸] دوسری غزل میں مصرع
اس طرح ہے "وہ خود ہی طالبِ دیدار ہو گئے آزاد"۔
[۹] دوسری غزل میں "ہم" کے بجائے "اس" ہے۔

غزل

کُشتہ ہے اُن کی ترچھی نظر کی تمام خلق — حیرت ہے ایک تیر کا عالم شکار ہو
پیش خدا کھڑے ہیں وہ محشر میں بے نقاب — کیا ہی مزا ہو اب جو ہماری پکار ہو
کہتا ہے عاشقوں کو ستا کے دکھا کے چرخ — سینہ نہ یوں کسی کا کبھی داغ دار ہو
آزادؔ اُن کی ترچھی نظر سے نہ خوف کر
یہ تیر وہ نہیں جو کلیجے کے پار ہو[1]

ایک شعر

وقت نظارہ نہیں جمتی کبھی اس پہ نگاہ
جوہر آئینہ ہے ظالم تری تصویر بھی[2]

---

[1] ارمغان آزاد کے پہلے ایڈیشن کی ترتیب کے وقت یہ غزل دستیاب نہیں ہوئی۔ اب ارمغان فرخ، بمبئی بابت ماہ فروری ۱۸۹۹ء جلد ۲ نمبر ۲ (ص ۴) کے حوالے سے پیش کی جا رہی ہے۔

[2] مولانا آزاد کا یہ شعر اثر بن یحییٰ انصاری نے اپنی تالیف "مولانا آزاد کی سیاسی ڈائری" میں خدنگ نظر، لکھنو جنوری ۱۹۰۱ء کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

غزل

نشتر بہ دل ہے آہ کسی سخت جان کی
نکلی صدا تو فصد کھُلے کی زبان کی

یوں تو جہاں میں قاتل و جلّاد ہیں بہت
تم فرد ظلم میں ہو قسم آسمان کی

وہ نرم دل ہوں، دوست کے مانند رو دیا
دشمن نے بھی جو اپنی مصیبت بیان کی

بر لائیے کبھی نہ کبھی تو مرادِ دل
لے لیجیے دعائیں کسی بے زبان کی

خجلت کے مارے لعلِ یمن ہو گیا سفید
اُن کے لبوں پہ دیکھ لی سرخی جو پان کی

گنبد ہے گرد باد تو ہے شامیانہ گرد
شرمندہ میری قبر نہیں سائبان کی

آزاؔد بے خودی کے نشیب و فراز دیکھ
پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

مولانا آزاد کے دریافت شدہ کلام میں مولانا آزاد کے کلام میں یہ سب سے پہلی مطبوعہ غزل ہے، اور مولانا کے بیان کے مطابق پہلی کہی ہوئی بھی یہی غزل ہے۔ (آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص ۴۰-۲۳۹) - اس غزل کے چار شعر (نمبر ۲ تا ۵) ارمغانِ فرخ بمبئی کے شمارہ بابت ماہ جنوری ۱۸۹۹ء جلد ۲ نمبر ۱ (ص ۴) میں شائع ہوئی ہے۔ غزل پر شاعر کا نام اس طرح درج ہے:

آزاد، جناب غلام محی الدین صاحب۔ از کلکتہ

یہ غزل اِس مصرعِ طرح میں تھی: "پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی"

مولانا آزاد کے بیان کے مطابق اس غزل کے سترہ شعر انھوں نے منتخب کر کے بھیجے تھے لیکن ارمغانِ فرخ کے ایڈیٹر حکیم عبدالحمید فرخ دہلوی کے انتخاب کے بعد صرف چار شعر (نمبر ۲ تا ۵) ارمغانِ فرخ میں جگہ پا سکے تھے۔ اس کا مطلع اور مقطع ایڈیٹر کے معیار پر پورا نہ اترا تھا۔

اس غزل کا مطلع، مقطع اور چھٹا شعر مولانا نے مولانا غلام رسول مہر کے نام ایک خط مورخہ ۳ر دسمبر ۱۹۳۶ء میں (نقش آزاد ص ۱۰۷) تحریر فرمایا تھا۔ غزل کا تیسرا شعر جو ارمغانِ فرخ میں درج ہے۔ مولانا کی بہن فاطمہ بیگم عرف آرزو بیگم نے ایک انٹرویو میں خواجہ احمد فاروقی کو بہ تغیرِ ادنیٰ سنایا تھا۔ اس کا پہلا مصرع اس طرح سنایا

ہوں نرم دل کہ دوست کے مانند رو دیا

(آج کل، دہلی۔ نومبر ۱۹۵۹ء)

غزل

(مشاعرہ منعقدہ کلکتہ مورخہ ۲۵۔جون ۱۹۰۲ء۔شب پنجشنبہ برمکان مولوی عبدالباری صاحب رئیس کلکتہ۔بہ تحریکِ مولوی محمد یوسف جعفری رنجورؔ صاحب بہ سلسلۂ جشنِ تاجپوشی شاہِ برطانیہ)

ان شوخ حسینوں کی ادا اور ہی کچھ ہے
ایسوں کی اداؤں میں مزا اور ہی کچھ ہے
یہ دل ہے مگر دل میں بسا اور ہی کچھ ہے
دل آئینہ ہے جلوہ نما اور ہی کچھ ہے
ہم آپ کی محفل میں نہ آنے کو نہ آتے
کچھ اور ہی سمجھتے تھے ہوا اور ہی کچھ ہے
بے خود بھی ہیں ہشیار بھی ہیں دیکھنے والے
ان مست نگاہوں کی ادا اور ہی کچھ ہے
آزاد ہوں اور گیسوے پیچاں میں گرفتار
کہہ دو مجھے کیا تم نے سنا اور ہی کچھ ہے۔

پنچ پٹنہ ۵ جولائی ۱۹۰۲ء بحوالہ اُردو ادب علی گڑھ آزاد نمبر)

غزل

یہ غزل شائستہ خان سلمہا نے مولوی محمد یوسف جعفری رنجورؔ عظیم آبادی کی بیاض (مخزونہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ) سے دریافت کی ہے۔ عزیزہ سلمہا کے شکریے کے ساتھ درج کی جاتی ہے۔ (مرتب)

وہ مقدر میں نہیں ہے جو ہمارے دل میں ہے
اب خیالِ سعی حاصل سعیِ لا حاصل میں ہے

میرے دل میں ہے نہ وہ اغیار کی محفل میں ہے
یا الٰہی! اب مقامِ دوست کس منزل میں ہے

وصل سے انکار ان کو، یاں تمنائے وصال
واں وفا مشکل میں ہے یاں آرزو مشکل میں ہے

اک قدم بڑھتا ہوں تو بڑھتی ہے منزل دو قدم
یا الٰہی! کس کا بختِ نارسا منزل میں ہے

آتشیں جلوے اُدھر ہیں آہ شعلہ زن اِدھر
مژدہ اے ذوقِ نظر! کیا پردہ حائل میں ہے

اُس کا گھر، اُس کا تصوّر، اُس کی یاد، اُس کا خیال
یا ہماری آنکھ میں ہے یا ہمارے دل میں ہے

وہ ہوں اور ہو رنجشِ اغیار! ہے بالکل غلط
کچھ نہ کچھ طرزِ شرارت طینتِ ناقل میں ہے

حسن پردہ در ہوا پیشِ نگاہِ رخنہ گر
قیس جنگل میں، نہ لیلیٰ پردۂ محمل میں ہے

بیٹھے بیٹھے یا الٰہی! یادِ کس کی آگئی؟
آنکھ میں آنسو بھرے ہیں درد کچھ کچھ دل میں ہے

رازِ الفت کھُل گیا باطن جو تھا ظاہر ہوا
اب تو ہے سب کی زباں پر جو ہمارے دل میں ہے[1]

مے گسارانِ محبت پی چکے اب ہوش کی
آنکھ میں رکھتے تھے پہلے جو نشہ، وہ دل میں ہے

حورِ جنت کے بیاں سے آگئی یادِ بتاں
بے اثر واعظ! تری تقریرِ لاطائل میں ہے،

---

[1] یہ شعر مولانا نے اپنے مضمون "ممالک اسلامیہ اور سید احمد خانی خیالات" (مطبوعہ وکیل امرتسر ۱۹۰۴ء منقولہ ہفت روزہ الکلام، پٹنہ مورخہ ۲۵ ستمبر ۱۹۶۰ء) میں نقل کیا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ غزل ۱۹۰۴ء سے قبل کی یادگار ہے۔ میرے خیال میں ۱۹۰۱ء یا ۱۹۰۲ء کی ہے کہ وہی ان کے شاعری کے شوق کا زمانہ ہے۔ (مرتب)۔

ایک حسرت دل سے نکلی ایک حسرت رہ گئی
ایک پیکاں دل سے نکلا، ایک پیکاں دل میں ہے

چھوڑ بھی سکتے نہیں اور ضبط بھی ممکن نہیں
عشق کے ہاتھوں ہماری جان کس مشکل میں ہے

ڈر رہا ہے، گو سوالِ وصل کی ہمت نہیں
پھر بھی کچھ اٹکا ہوا مطلب لبِ سائل میں ہے

بعد مدت کے مرا دل پھیرتے ہیں ہائے ہائے
سن لیا دشمن سے کوئی آرزو اس دل میں ہے

ہم تو سن لیتے ہیں جی بھر کر تمہاری گالیاں
تم بھی سن لو بندہ پرور! جو ہمارے دل میں ہے

المدد اے المدد، شوقِ شہادت المدد
مژدہ باد اے مرگ! خنجر پھر کفِ قاتل میں ہے

دخترِ رز کا ذکر ہے یاں، حور کا ہے واں بیاں
میکدے میں ہے وہی جو شیخ کی محفل میں ہے

کیا کریں مجبور ہو کر نذر کر دیتے ہیں جاں
لب پہ آ سکتی نہیں وہ بات جو قاتل میں ہے

ہوں تمہارا مدعی اور گردِ راہِ مدعا
خاکساری، پائمالی، میرے آب و گل میں ہے

اب تو ہم سرمست صہبائے محبت ہو چکے
کیفِ مے آنکھوں میں ہے جوشِ مسرت دل میں ہے

سخت جانی! تو نہ ہمت ہاریو ہنگام قتل
دیکھنا ہے زور کتنا بازوے قاتل میں ہے

قبر پر آکر وہ کہتے ہیں یہ کس افسوس سے
مرنے والے کی جگہ خالی مری محفل میں ہے

غیر کی دعوت میں بے حد ہے خیالِ انتظام
اک قدم محفل سے باہر، اک قدم محفل میں ہے

سیکڑوں صدمے، ہزاروں درد، لاکھوں آفتیں
ایک جاں عاشق کی، اے اللہ! کس مشکل میں ہے

واہ کیا خوب! آپ نے سیکھی ہے یہ تیر افگنی
زہ میں ہے سوفار اور پیکاں ہمارے دل میں ہے

جب کوئی دیکھا حسیں فوراً دل اس پر آ گیا
سخت ہوں حیراں کہ یہ کیا چیز آب و گل میں ہے

ہو گیا تیرِ محبت کا اثر دونوں طرف
کچھ تمہارے دل میں ہے اور کچھ ہمارے دل میں ہے

ہم نے کثرت میں وہی دیکھا ہے جو وحدت میں ہے
ہم کو خلوت میں وہی ہے لطف جو محفل میں ہے

دوستی منہ پر عداوت دل میں یہ بہتر نہیں
منہ پہ کیوں کہتے نہیں جو کچھ تمہارے دل میں ہے

ہے دلِ آزادؔ اک مہماں سرائے مہوشاں
ڈھونڈیے جس مہ جبیں کو صورت اس کی دل میں ہے

کچھ اثر آزادؔ میرے جذبِ الفت نے کیا
آج سنتا ہوں وہاں بھی بے قراری دل میں ہے

رباعیات

باسمہٖ سُبحانَہٗ

کلام آزاد

نوتصنیف رباعیتیں

کیوں طعنۂ خویش و اقربا سہتے ہیں
ہے بات کوئی کہ آپ چپ رہتے ہیں
ہیں کس کے خیال میں جنابِ آزادؔ
سنتے ہیں کسی کی اور نہ کچھ کہتے ہیں

افسوس وہ بے غمی کی طفلی نہ رہی
افسوس وہ عیش کی جوانی نہ رہی
لے دے کے رہی تھی ایک پیری اے مرگ[1]
تو کیا آئی کہ ہائے وہ بھی نہ رہی

---

*۔غزل بہ فرمایش مولوی رنجور مرحوم سے یہاں تک کا تمام کلام مولانا مولوی محمد یوسف جعفری رنجورؒ کے ذخیرۂ علمی سے دستیاب ہوا ہے۔ اور بہ شکریہ جناب قدرت اللہ فاطمی صاحب پیش کیا جارہا ہے۔ ان رباعیوں پر کوئی تاریخ درج نہیں تھی لیکن حضرت رنجورؒ کے ذخیرے سے جو اشعار دستیاب ہوئے ہیں وہ تمام ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۲ء کا سرمایہ ہے۔ بعض پر تو تاریخ مکتوب ہیں، اس لیے اغلب خیال یہ ہے کہ یہ رباعیات بھی ۱۹۰۱ء و ۱۹۰۲ء ہی کی ہوں گی۔ [1] مولانا کے قلمی مسودے میں "پیری" کی جگہ "جوانی" لکھا تھا۔ لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ مقام "جوانی" کا نہیں "پیری" کا ہے، اور مولانا محض روانی اور بے خیالی میں لکھ گئے ہیں۔ اس لیے ہم نے یہاں پیری بنا دیا۔

رباعی

کیوں ہے یہ خراب اور کیوں ہے یہ بُرا
چاہ اپنی ہے اور شوق اپنا اپنا
ہے وعظ کی لت اُسے ہمیں شرابِ مدام
اُس کو اُس کا ہے شوق ہم کو اِس کا

اُردو رُباعیات[1]

(۱)

سنتے ہیں رقیب سے ملاقاتیں ہیں
صحبت دن رات ہے مداراتیں ہیں
ہم کو نہیں اعتبار جو چاہو کہو
عاشق سے وہ منہ لگائے، یہ باتیں ہیں

(۲)

آفتِ جاں ہے قصۂ جوانی میرا
ظاہر ہے حالِ نوحہ خوانی میرا
اک جان بچاؤں میں کس طرح آزاد
دل کا دشمن ہے یادِ جانی میرا

۱۹۲۰ء

---

[1] یہ دو رباعیاں ماہنامہ مہر نیم روز کراچی مئی، جون، جولائی ۱۹۵۸ء کی اشاعت میں ایڈیٹر جناب مولانا حسن مثنیٰ ندوی صاحب نے شائع کی تھیں۔

رباعی

تھا جوش و خروش اتفاقی ساقی
اب زندہ دلی کہاں ہے، باقی ساقی
مے خانے نے رنگ روپ بدلا ایسا
مے کش مے کش رہا نہ ساقی ساقی[1]

۱۹۱۷ء

---

[1] یہ رباعی مولانا نے تذکرہ (۱۹۱۷ء) میں اور ایک دو جگہ اور بھی استعمال کی ہے۔ لیکن مولانا کے بھائی ابوالنصر آہ کی ہے اور خدنگ نظر لکھنو بابت ماہ جون ۱۹۰۳ء میں، ان کی رباعیات میں ان کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

قطعات

اور

قطعاتِ تاریخ

باسمہٖ

قطعہ فی البدیہہ

میرے شفیق رنجور!

گرچہ ہے وعدہ خلافی مری ثابت تم پر
اور وعدہ مرا پورا کبھی ہوتا ہی نہیں
پھر جو وعدہ بھی ہو پورا تو یہ شکوہ ہے تمہیں
کہ کبھی وقت معیّن پہ مَیں آتا ہی نہیں
یعنی فی الجملہ نتیجہ یہ نکالا تم نے
میں گیا وقت ہوں! جاتا ہوں تو آتا ہی نہیں
"وقت" کہتے ہو مجھے! سچ ہے، مگر یہ تو کہو!
پہلے تو وقت میسّر کبھی ہوتا ہی نہیں
اور میسّر ہو تو پھر قدر کرو قدر کرو
کہ جو جاتا ہے تو پھر حشر تک آتا ہی نہیں
میں تو ہوں "وقت" ملو گر تو غنیمت سمجھو
میں بھی سمجھا ہوں تمھیں وقت کہ ملتا ہی نہیں
آؤں گا "آٹھ بجے ٹھیک" میں انشاء اللہ"
پھر نہ کہنا مجھے رنجور کہ آتا ہی نہیں

ابوالکلام محی الدین احمد

خاک بر سرم باد کہ امروز باز فکر شعر کردم، استغفر اللہ، استغفر اللہ۔

قطعہ

آزاد کل جو سیر کو صحرا کی میں گیا
دیکھا کہ ایک شخص وہاں بے قرار تھا
اپنی بنا کے قبر اسے دیکھتا تھا وہ
پھر دیکھ کر اسے وہ بہت زار زار تھا
کہتی تھی اس کو خلق کہ دیوانہ ہو گیا
دیکھا جو مَیں نے ایک ہی وہ ہوشیار تھا

قطعہ

تضمین بر مصرع ہائے حضرت امیر مینائی

چھیڑو نہ مجھے، کہ ہم صفیرو
"مجھ مست کو مے کی بُو بہت ہے"
مجھ سے نہ کہو فسانۂ قیس
"دیوانے کو ایک ہُو بہت ہے"

قطعۂ تاریخ انتقال امیر مینائی

دریغا امیر احمد لکھنوی
کہ تھے ہند میں شاعر بے نظیر

وہ طورِ سخن کے تھے گویا کلیم
سپہر معانی کے بدرِ منیر

فراہم کیا شاعروں کے لیے
تصانیف سے اپنی گنجِ خطیر

فصیح و بلیغ و متیں سب کلام
ہر اک شعر دیوان کا دل پذیر

لغت میں لکھا وہ امیر اللغات
ہیں مداح جس کے صغیر و کبیر

سمجھتے وہی لوگ ہی ان کی قدر
اگر ہوتے اس وقت سودا و میر

صد افسوس دنیا سے وہ چل بسے
کرے مغفرت ان کی ربِ قدیر

دکن کھینچ کر لے گئی ان کو موت
اُسی سرزمیں کا تھا شاید خمیر

لکھو ان کی رحلت کا آزاد سال
جگر سوز بزمِ سخن بے امیر

۱۳۱۸ھ

(خدنگ نظر لکھنو۔ نومبر ۱۹۰۰ء بہ حوالۂ مولانا آزاد البم)

قطعۂ تاریخ تصنیف تذکرۂ صادقہ[1]

مژدہ اے والہانِ صادق پور
مژدہ اے عاشقانِ روے وطن
حضرتِ مولویِ "عبدِ رحیم"
صاحبِ علم و ماہرِ ہر فن
تذکرہ یہ انھوں نے لکھا ہے
جس کی تعریف میں زباں الکن
نقطہ نقطہ ہے خالِ روے بتاں
صفحہ صفحہ بیاضِ صحنِ چمن
واقعاتِ صحیح لکھے ہیں
جس میں کچھ بھی نہیں ہے جاے سخن
تذکرہ یہ وطن کا لکھا ہے
اس پہ شیدا ہیں عاشقانِ وطن
اس میں لکھا ہے حالِ "صادقپور"
جو کبھی تھا علوم کا گلشن
جو بزرگوں کا تھا کبھی ملجا
جو بزرگوں کا تھا کبھی مسکن

---

[1] تذکرۂ صادقہ (پہلا ایڈیشن) صفحہ ۲۷۳ تا ۲۷۴۔ غیر مطبوعہ فارسی تقریظ فارسی کلام کے ضمن میں ملاحظہ ہو۔

عالم و فاضل و ادیب و حکیم
الغرض کاملوں کا تھا مخزن
شمع بزمِ کمال کہیے انھیں
جن سے بیت العلوم تھا روشن
ان کو کہیے زرِ کمال اگر
اس کو کہیے کمال کا معدن
ہائے دیکھو یہ گردشِ دوراں
ہائے دیکھو زمانے کے یہ چلن
اک خزاں لوٹ لے گئی سب کچھ
اب نہ وہ پھول ہیں نہ وہ گلشن
ہاں فقط یادگار ہیں باقی
جن سے اب نام ان کا ہے روشن
میرے مخدوم حضرتِ رنجور
جن کی توصیف ، یعنی نا ممکن
ان کا ارشاد تھا لکھو! تاریخ
ان کا اصرار تھا کہ تعجیلاً
تھی اسی فکر میں پریشانی
غور میں تھا کہ ناگہاں فوراً
دل سے آزاد کو ملی تاریخ
ہے طرا زندہ ذکر اہل وطن

۱۳۱۹ھ

ولہ

اس رسالے کی کس سے ہو تعریف
واقعی فیض کا مقالہ ہے
ہر روایت ہے مستند اس کی
معتبر اس کا ہر حوالہ ہے
سر سے آزاد لکھ دو ہجری سال
خیرِ آفاق یہ رسالہ ہے

۱ + ۱۳۱۸ = ۱۳۱۹ھ

ولہ

تاریخِ طبع کتابِ مذکور

چاپ کردند ایں کتابِ نفیس
فکر شاں را صد آفریں بادا
از لبِ ہاتف ایں ندا آمد
سرمۂ چشم ناظریں بادا

۵ + ۱۳۱۵ = ۱۳۲۰ھ

قطعۂ تاریخ جشنِ تاجپوشی حضور ملک معظّم

ہوئی لندن میں از فضلِ الٰہی
نہایت شان سے جب تاج پوشی
کہا آزاد نے بڑھ کر ادب سے
مبارک شاہ کو اب تاج پوشی

۱۳۲۰ھ

قطعۂ تاریخ از اثرِ خامہ خادم العلماء ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی مقیم کلکتہ

تھے معظّم مولوی احمد کبیر — دے گئے دنیا کو رنج لازوال
عاشقِ صادق رسولُ اللہ کے — جاں نثارِ حسنِ ربِّ ذوالجلال
ماہرِ تفسیر و اسرارِ حدیث — تھے سپہرِ علم کے بدرِ کمال
لب پہ ہر دم ان کے تھا ذکرِ رسول — ذاکرِ اللہ ان کا بال بال
تھا خیال اللہ کا ہر دم انہیں — گر خیال آیا یہی آیا خیال
دوڑے خوش خوش عشق میں حق کی طرف — جب کہا حق نے انہیں عبدی تعال
جس سے پھیلی تھی جہاں میں روشنی — ہوگیا اس بدرِ کامل کا زوال
ہے دعا آزاد کی ہر دم یونہیں — ان پہ رحمت ہو تری اے ذوالجلال
سالِ رحلت یہ ملائک نے کہا — تھے بڑے درویشِ کاملِ اہلِ حال[1]

۱۳۱۹ھ

---

[1] مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ قطعۂ ”تاریخ“ مجموعۂ قطعاتِ تاریخ بر رحلتِ مولوی احمد کبیر ساکن قصبہ پھلواری“ سے ماخوذ ہے۔ بشکریہ محمد عالم مختارِ حق۔ لاہور

ساقی نامہ کے دو شعر

مولانا آزاد نے یہ دو شعر مولانا محمد یوسف جعفری رنجور مرحوم کے نام ایک خط میں تحریر فرمائے ہیں ۔ لکھا ہے کہ ساقی نامہ کی ابتدا کر دی ہے دو شعر لکھ چکا ہوں، اِس کے بعد یہ دونوں شعر تحریر کیے ہیں اور دریافت کیا ہے :
'کیا یہ بحر مناسب ہے ؟ خط میں ساقی نامہ کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں شاید یہ وہ ساقی نامہ ہو جو تہنیت جشنِ تاجپوشی ملک معظم کی تقریب سے لکھی جانے والی مثنوی میں شامل ہے ۔ اس خط پر تو کوئی تاریخ درج نہیں جس سے یہ دونوں شعر نقل ہوئے ہیں البتہ جشن تاج پوشی کے سلسلے کا مشاعرہ ۲۵ جون ۱۹۰۲ء کو کلکتہ میں ہوا تھا اور مثنوی اور قطعات تاریخ اسی موقعے کے لیے لکھے گئے تھے ۔ ممکن ہے ساقی نامہ کے اِن اشعار سے تذکرۂ صادق پر تقریظ میں مثنوی کا آغاز کیا ہو۔ اشعار یہ ہیں :

ساقیِ ماہ لقا نیک شیم   یک نگہ بر من محزوں ز کرم
اے خدا اے تو شوم بندہ نواز   جام دادہ ز مئے رازو نیاز[1]

---

[1] خدا بخش لائبریری جرنل ۔ پٹنہ نمبر ۲۷ صفحہ ۱۰۔

ابیات

اے گلشنِ سخن کے ہواخواہ شائقو
آؤ مزے بہارِ گلستاں کے لوٹ لو [1]

رازِ الفت کھُل گیا باطن جو تھا ظاہر ہوا
اب تو ہے سب کی زباں پر جو ہمارے دل میں ہے [2]

ہوتا ہے مجازی سے حقیقت کا توصّل
ہے نفع بھی اس عشق کے ہمراہ ضرر بھی [3]

بھاگتی پھرتی تھی دنیا جب طلب کرتے تھے ہم
اب کہ جب نفرت ہوئی خود بیقرار آنے کو ہے [4]

---

[1] مولانا نے یہ شعر حکیم خاقانی شروانی والے مضمون میں استعمال کیا ہے۔ اصل میں مصرعۂ ثانی اس طرح تھا "آؤ بہارِ بے خزاں کے مزے لوٹ لو"۔ اس میں یقیناً سہو ہے [2] مولانا نے اپنے مضمون "ممالکِ اسلامیہ اور سید احمد خانی خیالات" کی ابتدا اسی شعر سے کی ہے۔ [3] عربی کا مشہور مقولہ ہے "المجاز قنطرۃ الحقیقۃ" مولانا آزاد نے اسی کا ترجمہ کر دیا ہے فرماتے ہیں" اس کا لطیف ترجمہ دیکھنا ہو اور وہ بھی نظم میں تو راقم الحروف آزاد کا یہ اُردو شعر دیکھ لو۔ مخزن لاہور اگست ۱۹۰۲ء مضمون "خاقانی شروانی۔ [4] اردو ادب آزاد نمبر علی گڑھ صـ۲۲۳ مضمون "مولانا ابوالکلام آزاد اور شاعری" از جناب عبدالغفار شکیل۔

ترے فراق میں جینا بشر کا کام نہیں
ہزار شکر کہ اس عمر کو دوام نہیں[1]

وعدۂ وصل بھی اک طرفہ تماشے کی ہے بات
میں تو بھولوں نہ کبھی ان کو کبھی یاد نہ ہو[2]

غنچوں میں اہتزاز ہے پروازِ حسن کی
سینچا ہے کس نے باغ کو بلبل کے خون سے[3]

---

[1] بہ روایت و بہ شکریہ شورش کاشمیری مرحوم۔ [2] نقشِ آزاد (مکتوب مورخہ ۳ دسمبر ۱۹۴۶ء)
ص ۱۰۸۔ مولانا کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شعر ۱۹۰۱ء کا یادگار ہے۔
[3] غبارِ خاطر (مکتوب مورخہ ۱۹ مارچ ۱۹۴۳ء)

قصد کرتا ہوں جو اس جا سے کہیں جانے کا
دل یہ کہتا ہے کہ تو جا، میں نہیں جانے کا[۵۴]

---

۵۴ رانچی میں نظربندی سے رہائی کے وقت - اواخر ۱۹۱۹ء یا آغاز ۱۹۲۰ء - اسی مضمون کا ایک شعر نواب خان بہادر خان بہادر معروف کا ہے :

قصد کرتا ہوں ترے گھر سے جو میں جانے کا
دل یہ کہتا ہے کہ تو چل، میں نہیں آنے کا

خان بہادر خان، نواب ذوالفقار خان کے بیٹے اور روہیل کھنڈ کے حکمراں حافظ الملک حافظ رحمت خان کے پوتے تھے - ۱۸۵۷ء کے جہاد حریت میں حصہ لینے کے جرم میں ۲۴ ، مارچ ۱۸۶۰ء کو انھیں بریلی میں پھانسی دے دی گئی تھی - مولانا حسرت موہانی کو ان کا دیوان مل گیا تھا - اور انھوں نے اردوے معلّٰی (کان پور شمارہ جولائی تا ستمبر ۱۹۲۷ء) میں اس کا انتخاب شائع کر دیا تھا - ممکن ہے مولانا نے اسے معروف کے شعر ہی کی حیثیت سے پڑھا ہو اور حافظے میں یہ شعر اسی طرح محفوظ ہو - مولانا نے اپنا شعر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ہے -

فارسی کلام

غزلِ فارسی

(مشاعرہ منعقدۂ کلکتہ مورخہ ۲۵ جون ۱۹۰۲ء بہ سلسلۂ جشنِ تاجپوشی شاہِ برطانیہ)

کنی ز گریہ اگر منع چشمِ گریاں را
رواں بود کہ ندیدی شبانِ ہجراں را

توانم آں کہ کنم ضبطِ آہ و افغاں را
مگر علاج بگو چیست چشمِ گریاں را

الٰہی ایں چشمِ فسوں ساز راچہ مستی ہاست
کہ مست و بے خبر انداخت ہوشیاراں را

دریں مشاعرہ حرفم نمی تواں فہمید
بہ طورِ گویم الٰہی بیانِ پنہاں را

برو برو تو طبیبا! چرا بمن آئی
بغیرِ مرگ دوانیست دردِ ہجراں را[1]

---

[1] اپنچ پٹنہ۔ ۵ جولائی ۱۹۰۲ء بحوالہ اردو ادب علی گڑھ (آزاد نمبر)

فارسی رباعیات

(۱)

نقاش چو نقش ساز اند از تو بود
دل دادۂ صورت گری نازِ تو بود
یک شب ہمہ صرف زلفِ مشکیں تو کرد
یک روز تمام چہرہ پردازِ تو بود

(۲)

ساقی! ساقی! بدہ بدہ جام بجام
عمرِ تو دراز باد و وقتِ تو بکام
ایں تشنہ لبیِ من و ایں شورِ عطش
پر کن پر کن کہ کارِ من تمام است تمام

(۳)

گر عیش طلب کنی زمستاں آموز
واز غم خود زتنگ دستاں آموز
مردنِ خویش حقِ تست لیکن زاہد؛
خوش زیستن از بادہ پرستاں آموز

(۴)

ساقی تو نگاہ کن بریں ابر و بہار
یک ساغر مے دہد و بیں لطف خمار
وقتیست کہ ماہ روے با ناز و ادا
یک زیر نظر باشد و یک زیرِ کنار[1]

(۵)

دردا ہر ز لطفِ او نہ شد طبعم سیر
بر بالا روم کہ خود نہ بالاست نہ زیر
اے عمر بر و برو کہ یادِ تو زیاد
اے مرگ بیا بیا کہ یاد تو بخیر[2]

---

[1] ماہ نامہ مہر نیم روز کراچی مئی، جون، جولائی ۱۹۵۸ء۔
[2] اپنچ بمبئی ۵ جولائی ۱۹۰۲ء بحوالہ علم اردو ادب علی گڑھ (آزاد نمبر)

تقریظ بر تذکرۂ صادقہ

تذکرۂ صادقہ کے پہلے ایڈیشن میں مولانا آزاد کی جو تقریظ شائع ہوئی تھی۔ اس کے آخر میں مولانا نے فرمایا تھا:

"اپنے مکرم دوست جناب مولانا محمد یوسف جعفری چیف مولوی بورڈ آف اگزامنرس کلکتہ کی فرمایش سے میں نے ایک مثنوی فارسی تقریظ میں نظم کی تھی جو دقّت گنجایش کے سبب سے یہاں درج نہ ہوسکی۔ تین قطعات درج کرتا ہوں"

نثر میں مولانا کی تقریظ کے علاوہ قطعات تاریخ تذکرہ صادقہ کے پہلے ایڈیشن میں شائع ہوگئے تھے۔ لیکن فارسی نظم میں یہ تقریظ جیسا کہ مولانا نے تحریر فرمایا ہے کہ دقّت گنجایش کی وجہ سے شامل نہ ہوسکی تھی۔ فارسی کی یہ تقریظ مولانا نے حضرت رنجور مرحوم کی فرمایش پر لکھی تھی اور انہیں کو دے دی تھی۔ یہ فارسی تقریظ دستبردِ زمانہ سے محفوظ رہ گئی جو محترم قدرت اللہ فاطمی صاحب کے شکریے کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔

اے ساقی خوش خرام برخیز — از مے بہ بہارِ گل چہ پرہیز
ابریکہ ز کوہسار آمد — در موسم پر بہار آمد
کایام ربیع و نو بہار است — ایں وقتِ نشاط وصلِ یار است
شادیم کہ ابر ہم رسیدہ — بر دوش ہوائے خوش پریدہ

اس تقریظ کے وہ اشعار جن پر نشان ÷ بنا ہے اس مثنوی میں بھی شامل ہیں جو مولانا نے جشن تاجپوشی کے مشاعرہ منعقدہ کلکتہ بتاریخ ۲۵ رجون ۱۹۰۲ء کے لیے لکھی تھی اور "اپنچ" مورخہ ۲۲ جنوری ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی تھی۔

وقتے است کہ دورِ ساغرِ مے | مطرب بدر آید از دف و نے
چوں نغمہ شود بہ شورِ قلقل | کاں سیر بود بہ صوتِ بلبل
از محتسباں مترس گاہے | بر ابرِ محیط کن نگاہے
خنداں چو گل اند گل فروشاں | سرشارِ رحیقِ بادہ نوشاں
پر کن مئے بیخودی بہ ساغر | تا ایں لبِ خشک خود کنم تر
از بادۂ معرفت بدہ جام | تا کارِ خرد شود بانجام
گل جام بکف در انتظارت | مل آں کہ غم رود بغارت
گر بادۂ ناب نیست ساقی | از بادۂ علم کن تلافی
آں علم کہ زاں شود منوّر | ایں سینۂ عالماں برتر[1]
آں عبدِ رحیمِ اہلِ عرفاں | آں شمع فروزِ بزمِ ایماں
دیں پرور و پیرِ مشائخ | ہر ہر قدمش بہ شرع راسخ
کیفیتِ شاں بہ دُرِّ منثور | بہ خوبی و حسن کرد مذکور
احوالِ خدا رسیدگانست | حرفش ز سواد نورِ جانست
مہریست کہ بے زوال آمد | ماہیست کہ با کمال آمد
آں را کہ سرے بہ ہنر دانیست | داند کہ چہ ریزشِ معانی ست
باشد بہ کفِ خرد پسنداں | چوں ساغرِ مے بہ دستِ رنداں
یارب بہ طفیلِ بے نیازی | وز صدقۂ آں شہِ حجازی

"ایں نامہ کہ خامہ کرد بنیاد
توقیعِ قبول روزیش باد[2]"

---

[1] مولانا نے یہ شعر لکھ کر کاٹ دیا ہے، جیسا کہ عکس سے ظاہر ہے۔

[2] یہ شعر حضرت میر خسرو کا ہے۔ مثنوی لیلیٰ مجنوں (قلمی) مخزونہ کتب خانہ اردو ڈکشنری بورڈ۔ کراچی

تاریخِ طبع تذکرۂ صادقہ

چاپ کردند ایں کتاب نفیس
فکر شاں را صد آفریں بادا
ازلب ہاتف ایں ندا آمد
سرمۂ چشم ناظریں بادا

۵ + ۱۳۱۵ھ = ۱۳۲۰ھ

ایک شعر

مولانا آزاد کا یہ شعر "ارمغان آزاد" میں شامل نہیں۔ محترم حکیم نصیرالدین اجمیری (کراچی) کے حافظے میں محفوظ تھا۔ "ارمغان آزاد" آں موصوف کی نظر سے گزری تو انھوں نے یہ شعر حکیم سید محمود احمد برکاتی کو سنایا۔ برکاتی صاحب نے خاکسار کو تحریر فرما دیا۔

بعد میں یہ شعر خود مولانا کے قلم سے البلاغ میں (شمارہ (۱) ص ۵) چھپا ہوا نظر آگیا۔ مولانا نے البلاغ ۱۲ ر نومبر ۱۹۱۵ء کے شمارے میں "دارالارشاد" کے تحت لکھا تھا: "اب سے آٹھ سال پہلے میں نے ایک قصیدے کی تشبیب میں کہا تھا" اور پھر یہ شعر نقل کیا۔ یہ قصیدہ ابھی تک دستیاب نہیں ہوا۔ معلوم نہیں موضوع کوئی شخصیت تھی یا علم و فن؟

ہر موجِ معانی کہ ز جیحونِ دلم خاست
تا ساحلِ لب آمدہ برتافت عناں را

مثنوی

متضمن بہ تہنیتِ تاجپوشی حضور ملک معظم از اثرِ خامہ جناب ابوالکلام محی الدین احمد صاحب آزاد دہلوی مقیم کلکتہ، مؤلف رسالہ الہیئت فی علوم الجدیدہ والاسلام۔

تمہید عاشقانہ وطلب مے از ساقی

اے ساقیِ مستِ عشق مستم — مے دہ، مے دہ کہ مے پرستم
اے بادہ فروشِ ملکِ ہستی — دے ہستیِ جان و جانِ ہستی
مستیم بذوقِ بادۂ تو — اے منزلِ امن جادہ تو
کایامِ بہارِ شادمانی ست — ایں وقتِ نشاط و کامرانی ست
از کسبِ ضیا نمود موجود — ہر گل بچمن چراغِ بے دود
شادیم کہ ابر ہم رسیدہ — بر دوشِ ہوائے خوش پریدہ
امروز چراغِ گل بہ گلشن — کردست نسیمِ صبح روشن
خنداں چو گل اند گل فروشاں — سرشار رحیقِ بادہ نوشاں
وقتے ست کہ دورِ ساغرِ مے — مطرب بدر آید از دف و نے
چوں نغمہ شود بہ شورِ قلقل — کاں سرمہ بود بصوتِ بلبل
زاہد بحدیثِ مستیِ ما — شاکی ز طریقِ ہستیِ ما

اَلپنچ، پٹنہ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۲ء بہ حوالہ اردو ادب، علی گڑھ (آزاد نمبر)

اما ز کلام او میندیش کاں راز فراق مے غم خویش
از محتسباں مترس گاہے بر ابر محیط کن نگاہے
قاضی چو زما شود نہ راضی در شیشہ کنیم ریش قاضی
اے ساقی جام ارغوانی تا چند زدرد قصہ خوانی
مائیم نگار مادر آغوش آواز سرود عشق در گوش
ہم پیش نظر شراب رنگیں لیکن زغمت دلست غمگیں
اے پیر مغاں تساہلی چیست؟ با بادہ کشاں تغافلی چیست ؟
ایں پستی زہمتت زمستاں بالا خوانی زمے پرستاں !

تجاہلِ عارفانہ وکیفیّتِ وجدانی

ساقی در دستِ تو چہ چیز است ساقی ساقی بگو چہ چیز است
ایں چیست شراب ارغوانیست یا گویم آب ارغوانیست
ہاں ہاں بوے کسے شمیدم یعنی گلہاے حسن دمیدم
نے نے ایں رنگ روے یارست نے نے ایں بوے گل عذارست
ایں پیرِ مغان نیک فرجام کایں بادہ زشیشہ ریخت در جام
ہاں ہاں یعنی اشارۂ کرد حیراں یعنی اشارۂ کرد
مے دہ مے دہ دگر صداے یعنی عنقا صفت نواے
چشمے دارم بگو نہ بینم گل می بینم چرا نہ چینم
مفتوں شدم و دگر چہ گویم مجنوں شدم و دگر چہ گویم

تشبیہ عاشقانہ از شرابِ ناب

رحمے رحمے علیل ہستم یعنی بے قال و قیل ہستم

ایں بادۂ ناب وحال آزاد — یعنی خانہ خراب و آباد
آں درد چو بود ایں دوا شد — آں ساز چو بود ایں دوا شد
بلقیس چو اوست ایں سلیماں — قبلہ است گر اوست ایں مسلماں
آں ناز بود نیاز ایں است — واں پردہ بود کہ راز ایں است[1]

غایت طلبِ شراب

پر کن مے بےخودی بہ ساغر — تا ایں لب خشک خود کنم تر
جز بادہ دگر سرے نہ دارم — جز مے ہوسے بدل نہ آرم

تمہید دگر بہ گریز طرفِ مقصود

ہاں ساقی خوش جمال برخیز — در جام بلور بادہ را ریز
بیروں ز سرائے خود قدم نہ — ساغر ز مے کہن بہم بہ
ہر سوز طرب صدا بلند است — ہر شخص بہ عیش پائے بند است
ہر سمت صدائے عشرت انگیز — مینائے جہاں ز بادہ لبریز
ہر ذرہ ز جوشش صفائی — می کردۂ آئینہ نمائی
آئینہ یک و تمام دیدہ — یک جلوہ جا بجا رسیدہ
ہر حوض چو جام بادہ ناب — در شوق کسے دہن پُر از آب
ہر دل بہ طرب سرور دارد — ہر سر بہ سرش غرور دارد
بلبل بہ چمن ز نغمہ خوانی — مست است بنازِ خوش بیانی
پر کن بہ مے بہار مخمور — خون ست بہ خوشہ ہائے انگور

---

[1] یہ شعر حضرت امیر خسرو کا ہے۔

جشنِ تاجپوشی

ایوان فلک چہ زرنگار است | در بزم فلک چہ این بہار است
زد نعرۂ مست بادہ نوشاں | شوریست بگوے مے فروشاں
عیش است براہِ سر نہادہ | آغوشِ طلب رہے کشادہ
ہر شاہدِ حسن جلوہ آرا | ہر شوق طرب بدست آرا
در گوشِ دلم عجب صدائے | مستم چو رباب زیں نوائے
جشنیست کہ جشنِ شادمانی | خوش راحت و عیش زندگانی
شد تخت نشیں بہ تختِ انگلینڈ | خوش بخت شد است بختِ انگلینڈ
یعنی اڈورڈ شاہِ جمجاہ | شد تخت نشین بہ عزت و جاہ
شاہیست چہ شاہ مہربانی | در کشور علم حکمرانی!
اقبال ز پاے او مقیم است | از رشک دل شہاں دو نیم است
محسود کہ شغل او شب و روز | فریاد و فغان و آہِ دلسوز
دولت چو غلام خانہ زادش | صولت ز صداے او بپاش
آہوے کرم بہ او رمیدہ | شہباز ہمم بہ او پریدہ
اطراف زمیں تہِ نگینش | شوکت بہ جہاں شدہ مکینش
صد گنج مراد زیرِ پایش | صد راہِ نشاط سوے جایش
افراختہ رایتِ سیاست | ممتاز بہ حشمت و فراست
اے غازۂ حسن خاک راہش | خورشید ستارۂ کلاہش

فرخندہ بہ چشمِ دل نگاہش
ماراز جہاں سزد پناہش

گریز بہ دُعا

سرخوش ز شراب مدح بودم — غوطہ زنِ آبِ مدح بودم
کامد ناگہ صدائے دلبر — ہش دار مقام خویش بنگر
تو لائق مدح نیست آزاد — بس کُن، بس کُن دعائے دلشاد
دستم بدعاء کنوں بر آرم — کائے ربِ قدیر کردگارم
باشد بہ ادب قیام شاہی — باصولت درعب عز و جاہی

قطعۂ تاریخ[1]

نتیجۂ طبع وقار مولوی محی الدین احمد صاحب آزاد دہلوی

ہوئی لندن میں از فضلِ الٰہی
نہایت شان سے جب تاجپوشی
کہا آزاد نے جوشِ طرب میں[2]
مبارک شاہ کو اب تاجپوشی

۱۳۲۰ھ

---

[1] خدنگ نظر، لکھنو۔ اگست ۱۹۰۲ء [2] اپنچ پٹنہ کے حوالے سے اُردو ادب علی گڑھ میں جو قطعہ
ہوا ہے، اس میں یہ مصرع اس طرح ہے: کہا آزاد نے بڑھ کر ادب سے۔

عکسِ کلام

مولانا ابوالکلام آزاد

۱/

غزلیات

[illegible] مشاہدۂ تاریخ [illegible] مرتبہ منشی میر اخلاق حسین صاحب
[illegible]

بر مصرع طرح

[illegible] بہار میں

۱۳ [illegible] جسم زار میں
[illegible] رخسار میں

۳ [illegible] سرو قد سبزہ زار میں
[illegible] غبار میں

[illegible] زار میں
[illegible] مزار میں

۳ [illegible] اقرار یار میں
[illegible] انتظار میں

[illegible] بہار میں
[illegible] بہار میں

۳ نکلی ہے جان حسرت دیدار یار میں
[illegible] میں

۳ [illegible] بہار میں
[illegible] میں

۳ [illegible]
[illegible] ہزار میں

۳ [illegible]
[illegible] میں

۳ آتشکدہ [illegible]
[illegible] بہار میں

۳ [illegible]
[illegible] میں

۳ [illegible]
[illegible] میں

۳ یوسف [illegible] چشم برادران
[illegible] میں

[illegible]
[illegible] اختیار میں

ت

۳ [illegible] — رنجیدہ ہوں نہ کسی کے دل بیقرار رہیں

دل [illegible] — [illegible] رہیں

[illegible] — [illegible] بہار رہیں !!!!!

۳ ایسی [illegible] — نامہ [illegible] رہیں

۴ [illegible] — [illegible] شرمسار رہیں

۳ [illegible] — [illegible] انتظار رہیں

۳ ۴ [illegible] — [illegible] رہیں

۳ ۴ [illegible] — [illegible] انتظار رہیں

۴ [illegible] — [illegible] انتظار رہیں

۳ [illegible] — [illegible] رہیں

۴ [illegible] — [illegible] خوشگوار رہیں

۴ مرتوف [illegible] — [illegible] رہیں

۳ ۴ [illegible] — [illegible] رہیں

۴ [illegible] — [illegible] رہیں

۴ [illegible] — [illegible] رہیں

۴ [illegible] — [illegible] رہیں

۳ [illegible] — [illegible] رہیں

[illegible]

ہنستے ہیں تیرے جا آپ تو پہلو ہیں مزے کے — ہائے ہم تنگ کیوں ہو دیں آنکھیں جو نثار رہیں

۳ کوچہ یار میں نہ گئے ہم نہ جہاں جانا تھا — ہیں زلف و رخ کے عشق میں گرفتار رہیں

۲ مت کر [illegible] خاک کہ مانند [illegible] اگر — پھر ان کیوں [illegible] چشم [illegible]

۴ [illegible] زیر زمیں جا [illegible] — جب تیغ [illegible] نہ [illegible] یار رہیں

۳ ہم [illegible] ہم آغوش [illegible] + — آنکھیں لطف [illegible] رفت رہیں

سب آرزو [illegible] شب وصال — دو چار [illegible] آج [illegible] شاد رہیں

۲ ہیں آپ [illegible] عمر ہیں [illegible] — [illegible] ر ہیں

۳ [illegible] آرزو [illegible] — [illegible] قرار رہیں

۲ [illegible] آپ [illegible] — [illegible] رہیں

[illegible] — [illegible] روز [illegible] رہیں

۴ [illegible] — [illegible] رہیں

۲ [illegible] کمال ہے — [illegible] رہیں

[illegible] — [illegible] رہیں

۲ [illegible] — [illegible] رہیں

۲ [illegible] — [illegible] فصل بہار رہیں

۲ [illegible] — [illegible] رہیں

۲ وہ رات گئی پیہ پیا کی نگاہ رہ گئی بت
اٹھے گی شان پا آپ پیا میں راتیں ہنس

۴ ۲ ہا ہاں لیکے گا مجھکو ذرا سا
جیسے آپ ہی گا گرد لگا کے اختیار رہیں

۳ کھٹکھٹیں نہ لیوں نگاہ میں ذرہ کا ذرا نہ
رہتے ہیں ہا ہا ہی تصور زیاں ان یار ہیں

۲ پا کہو شب وصال ہیں بیچ خیال ہا کر
آنا نہیں بیچ ہا خزاں کا بہار ہیں

۳ تیرے خیال و دید بیدار کرو یا
جب آنکھ تنگ لگی کی پیا وہ بہر قرار ہیں

۳ اجا میرا اروں ہی پیا جان پیا کی
ہو ہو ذرا ب تھم مجھے گنج ہزار ہیں

۳ ایکدوں خدا یاد میں اب عزت کا کام ٭
ہا نہ کو کم بیر پا صد ہا روز گار ہیں

۲ جیسے گئی ہے جب رقیب کو بیدار روز ہیں
رہتے رہے خوب پا بیچ سینے گا ہزار ہیں

۳ میرا دل شگفتہ ہی یادش بیدار ہیں
ایک پہول اور بہار کی تا پہول رنگ ہا رہیں

۳ افسانہ کیا یاد میں تیرے وصال ہو بیا ہے
ذرے ہی کو بچے نہیں گرد و غبار ہیں

۴ ۲ سر و پیہ اختیار نہیں ہے نہیں کسی !!
تم ہے ہی کو دل ہا نہیں اختیار ہیں

۲ یہ روز کے سا تمہ کا تمہ پیا نہ ہی چرا کے ہیں
یعنی نہ چین یا لوٹ ہیں وہ بہر قرار ہیں

۲ دیر گھڑی کو ذرا ٹھیرے کر آ وہ ترا زنگ
ترانا ہو گزرے جاں کو ہر نیز پا یار ہیں

۳ ہو دانیا حیرتاں ہا بیا و لوٹ گئے
اب اور ہی بہار ہے ابکے بہار ہیں

دوڑہ دیدہ دیدہ دوڑہ

۳ ذرا اور کو ہوا نہیں تیرا کہا یہ ملال
سکو وصال ہیں نہ پا پا چور ہیں

بانگ

قطعہ فی البدیہہ

بہ تعیین نور !

یہ جو ہے وعدۂ فردا مرے نابستہ پر ہے — اور وعدہ مرا پورا کبھی ہوتا ہی نہیں !

پھر جو وعدہ بھی ہو پورا تو یہ شکوہ ہے تمہیں — کہ میں وقت معین پہ نہیں آتا ہی نہیں !!

یعنی فی البدیہہ تجھ پہ تکلف لاتعنے !! — میں بھی وقت ہوں اجی ! ہوں تو آتا ہی نہیں !

وقت کہتے ہو جسے ! سچ ہے ! اگر یہ تو ہو ! — پہلے تو وقت میسر ہی ہوتا ہی نہیں !

اور میسر ہو ! تو یہ توڑ دو ، قدر کرو ! — کہ جو جاتا ہے تو یہ پھر لوٹ کے آتا ہی نہیں !

میں تو ہوں "وقت" ملو گر تو غنیمت سمجھو ! — میں بھی سمجھا ہوں تمہیں وقت کہ ملتا ہی نہیں !

آؤ لگا "آنکھ" سے ملیں انشاء اللہ !

پھر نہ کہنا مجھے "آ ، ہو ، جو" (!) کہ آتا ہی نہیں

ابوالعلاء محمد اسمٰعیل

... ہا کہ امروز باز نہ شوریدم استغفراللہ ! استغفراللہ !

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]

[illegible]

[illegible]

ای ساقی خوش کرشمه برخیز! — [illegible]

[illegible] — [illegible] بهار آمد

[illegible] — وین وقت [illegible] وصل یار است

[illegible] — بر [illegible] هوا [illegible]

[illegible] — مطرب [illegible]

[illegible] — [illegible]

[illegible] — [illegible]

[illegible] — [illegible]

[illegible] — [illegible]

[illegible] — [illegible]

[illegible] — [illegible]

[illegible] ساقی! — [illegible]

~~[illegible]~~ — ~~[illegible]~~ [illegible]

~~[illegible]~~

[illegible]

[illegible] — [illegible]

[illegible] — [illegible]

~~[illegible]~~

[illegible] — [illegible]

[illegible]

[illegible]

غزل — [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

دیگر

هر که چون غنچه نه بشکفت ز راه [illegible]

سنبل [illegible] [illegible]

مه [illegible] آزاده طالب دیدار

ای آه آه [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

غلام آزاد

[illegible]

نو تصنیف رباعیاں

[illegible]

قطعہ

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

— • —

باقی ہے

مولانا آزاد کی ابتدائی نثر نگاری

(۱)

ابتدائی تحریریں :

مضمون نگاری مولانا نے شاعری کے بعد شروع کی۔ ان کی ابتدائی تحریریں وہ ہیں جو درسی کتابوں پر بہ طور حواشی و اشاراتِ حلِ عبارت کے لکھی تھیں۔ شرح وقایہ زیرِ درس تھی، مولانا نے اس کے متعدد شروح و حواشی کا مطالعہ کیا تھا، اور مطالب کی وضاحت اور مشکلات کے حل کے طور پر خود ایک تحریر تیار کر لی۔ مولانا کے والد (مولانا خیرالدین) نے اس طرح مطالعے اور سبق کی تیاری کے اس طریقے کو بہت پسند کیا، اور اس بارے میں مولانا کو ان کے بڑے بھائی غلام یٰسین آہ پر ترجیح دی۔ علمی موضوعات پر اظہار خیال کی یہ پہلی تحریک تھی۔ اس کے بعد مولانا نے جو کتابیں پڑھیں ان میں سبق کی تیاری کا یہی طریقہ اختیار کیا۔ مولانا فرماتے ہیں :

> "جس قدر سوچتا ہوں یہ پہلی تحریک ہے جو مجھے علمی عنوانوں پر کتابت کے لیے ہوئی۔ اس کے بعد تقریباً جتنی کتابیں میں نے پڑھیں سب میں ایسی ہی تحریرات لکھیں، جن کو ایک طرح کی شرح یا ان پر درس یا لکچر سمجھنا چاہیے۔ درس کے بعد جو نئے فواید سننے میں آتے تھے ان کا بھی ان پر اضافہ ہو جاتا تھا۔ مختصر، مطول، میبذی، شمس بازغہ، میر زاہد، ہدایہ، بیضاوی، بعض اجزائے تفسیرِ خازن، سدیدی، رشیدیہ وغیرہ۔ ان پر صدہا صفحے میرے سیاہ کیے ہوئے موجود ہیں۔" [۱]

اس زمانے میں نہ تو مولانا کی زبان منجھی تھی، اور نہ والد کے سوا کسی اہلِ زبان اور ادیب

---

[۱] آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی۔ عبدالرزاق ملیح آبادی۔ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۵۸ء
ص ۶۸-۲۶۷۔

وانشا پرداز کی صحبت ہی میسر تھی۔ والد مرحوم درس کے سوا عام مطالعہ وتحریر کو پسند نہ کرتے تھے۔ لیکن چوں کہ مولانا کو شاعری کا شوق پیدا ہو چکا تھا، اس لیے رفتہ رفتہ زبان صاف ہوتی گئی اور درسی کتابوں پر حواشی اور سبق کی تیاری کے اس طریقے سے تحریر کی مشق بھی بڑھتی گئی، اور اس طرح مولانا اپنے طور پر مضامین لکھنے لگے اور عام موضوعات پر تحریر اور مطالب کے جمع واقتباس کی راہیں کھلنے لگیں۔

ابتدائی تراجم وتالیفات:

کچھ دنوں کے مطالعے اور مشق تحریر کے بعد مولانا نے کئی چھوٹے چھوٹے مضمون لکھے، ان میں ایک مضمون "تعصب کی مضرتیں" تھا، جو امام غزالی کی احیاء العلوم سے ماخوذ تھا۔[1] ایک مضمون "عواید ورسوم" کے عنوان سے لکھا جو قسطنطنیہ سے شائع ہونے والے فارسی کے ایک رسالے میں "عواید ملل" سے ماخوذ تھا۔[2]

اس زمانے میں مولانا نے کئی رسائل کے ترجمے بھی کیے۔ احکام جمعہ پر مشتمل جلال الدین سیوطی کا ایک مختصر رسالہ "نور اللمعہ فی فضائل الجمعہ" کے نام سے ہے۔ مولانا نے اس کا اُردو ترجمہ کیا۔ ترجمے کی تحریک کی یہ صورت پیدا ہوئی کہ مدرسۂ عالیہ کلکتہ کے ایک مدرس مولوی حبیب الرحمٰن کو جو مولانا کے والد کے مرید بھی تھے، اس رسالے کے ترجمے کی ضرورت ہوئی، وہ یہ رسالہ مولانا کے یہاں لے کر آئے، اور ان کے ماموں زاد بھائی محمد سعید کی مدد سے جو مکۂ مکرمہ سے آئے ہوئے تھے، ترجمہ کرانا چاہا۔ محمد سعید اُردو بہت کم جانتے تھے اس لیے ترجمے میں مشکلات پیش آتی تھیں، ایک دن مولانا نے ان سے وہ رسالہ لیا اور انھیں اس کا ترجمہ لکھوا دیا۔ مولوی حبیب الرحمٰن اس سے بہت خوش ہوئے، اور مولانا سے اس کا ترجمہ کر دینے کی درخواست کی۔ چناں چہ مولانا نے انھیں اس کا ترجمہ کر کے دے دیا۔[3] مولانا جامی کی مشہور کتاب "نفحات الانس" کے چند اجزا کا ترجمہ بھی مولانا نے کیا تھا۔[4] فارسی تحریر کی مشق کے لیے مولانا نے محمد حسین آزاد کا تذکرہ آبِ حیات

---

[1] ایضاً ص ۲۶۲۔ [2] ایضاً ص ۲۶۳۔ [3] ایضاً ص ۲۷۰۔
[4] ایضاً ص ۲۷۱۔

کا ترجمہ کرنا بھی شروع کیا تھا اور اس کے حصۂ اول کے دورِ دوم تک کا ترجمہ کر کے محمد حسین طیلسی عراقی کو دکھایا تھا ۔ اور ان سے اصلاح لی تھی[1] ان میں سے کسی مضمون یا ترجمے کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی ۔ غالباً ان میں سے بعض مضامین و تراجم کا مقصد شائع کرانا تھا بھی نہیں ۔ مولانا کے بیان کے مطابق اس قسم کی تحریریں دراصل ایک مشق کا کام دیتی تھیں ۔ مولانا خود ہی لکھتے تھے ، اور پھر ایک نکتہ چیں کی حیثیت سے خود ہی ان پر نظر ڈالتے تھے اور اضافہ و اصلاح کرتے تھے[2] مولانا نے یہ واقعات ۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۰ء کے بتائے ہیں ۔ فرماتے ہیں :

"۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۰ء میں شوقیہ کاغذ سیاہ کرتا رہتا تھا ۔ مگر کسی تحریر کی بغرض اشاعت بھیجنے کی جرأت نہ ہوتی تھی ۔"[3]

اس زمانے کے دو رسالوں کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ شائع بھی ہوئے تھے ۔ پہلا رسالہ جلال الدین سیوطی کے رسالے "انیس اللبیب فی خصائص الحبیب" کا ترجمہ تھا جو خصائص محمدیہ کے نام سے مولوی حبیب الرحمٰن نے شائع کر دیا تھا ۔ دوسرا رسالہ امام غزالی کے رسالے منہاج العابدین کا ترجمہ تھا[4]

مولانا نے امام غزالی کے رسالے "مضنون صغیر و کبیر اور تہافۃ الفلاسفہ" کا ترجمہ کرنا بھی شروع کیا تھا ۔ مضنون کا ترجمہ مکمل ہو گیا تھا ۔ مولانا فرماتے ہیں :

"غالباً یہ پہلی تحریر تھی جس پر طبیعت مطمئن ہوئی تھی ۔"[5]

تہافۃ الفلاسفہ کا ترجمہ تقریباً نصف ہوا تھا کہ پھر طبیعت اچاٹ ہو گئی اور ترجمہ ادھورا رہ گیا ۔

ندوے کی حمایت میں رسائل :

۱۹۰۱ء کے شروع میں ندوۃ العلماء کے اجلاس کلکتہ کے مبادیات شروع ہوئے ۔ ان کے مقابلے میں مولانا احمد رضا خاںؒ بریلوی نے جدوہ کے نام سے ایک مخالفانہ کیمپ قائم کیا ، اور متعدد چھوٹے چھوٹے رسائل شائع کیے مولانا فرماتے ہیں :

"ندوے کے سفر میں ایک شخص مولوی نظام الدین جھجری تھے ۔ وہ مخالفین

---

[1] ایضاً ص ۲۲۶ ۔ [2] ایضاً ص ۲۷۳ ۔ [3] ایضاً ص ۲۷۱ ۔ [4] ایضاً ص ۲۷۱ ۔ [5] ایضاً ص ۲۷۲ ۔

کے تازہ رسائل و مضامین دکھلاتے تھے، اور میں ان کے جوابات لکھ کر دے دیتا تھا۔ اور پھر ندوے کی استقبالیہ کمیٹی انھیں چھاپ کر شائع کر دیتی تھی، اس قسم کے دو تین چھوٹے چھوٹے رسالے شائع ہوئے۔ اور غالباً مذہبی رسائل گزشتہ کے بعد نئی قسم کی چیزوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ اشاعت تک نوبت آئی"۔ [۱]

(۲)

المصباح:

اس زمانے میں شاعری سے زیادہ مضمون نویسی مولانا کے لیے مرغوب غذا ہوتی جاتی تھی اور بقول مولانا:

"سب سے زیادہ بلند تر مقام جو کسی انسان کے لیے ہو سکتا تھا، یہ نظر آتا تھا کہ مضامین لکھے جائیں اور وہ ہمارے نام سے شائع ہوں۔ اس کے بعد اس سے بلند تر مقام یہ تھا کہ کسی اخبار یا رسالے کے ایڈیٹر ہوں"۔ [۲]

اس شوق کی تکمیل کے لیے مولانا نے "المصباح"[۳] کے نام سے ایک پرچہ جاری کیا جس کا پہلا نمبر عید الفطر ۱۳۱۸ھ (۲۲ جنوری ۱۹۰۱ء) کے موقع پر نکلا تھا مولانا فرماتے ہیں:

"محمد موسٰی نامی ایک شخص نے نیا نیا پریس جاری کیا تھا۔ والد مرحوم کے بعض کاغذات وغیرہ لینے کے لیے وہ آمد و رفت رکھتا تھا، اس نے خیال کیا کہ تجارتی اغراض سے کوئی اخبار نکالے۔ یہ میرے خاص ذوق کی بات تھی۔ میں نے اسے اور زیادہ ترغیب دی اور بالآخر وہ آمادہ ہو گیا، "المصباح الشرق" مصر سے نکلتا تھا۔ میں نے اس کا نام "المصباح" تجویز کیا، اور ہفتہ وار اخبار کی شکل میں جاری ہوا، یہ دراصل پہلا اخبار ہے جو میں نے

---

[۱] ایضاً ص ۷۵-۲۷۴ [۲] ایضاً ص ۷۵-۲۷۴ [۳] المصباح سے پہلے مولانا نے ایک گلدستہ نیرنگ عالم کے نام سے بھی نکالا تھا جو ... کا تعلق شاعری سے تھا اس لیے اس کا تذکرہ مولانا کی شاعری کے ضمن میں کیا گیا ہے۔

ایڈٹ کیا۔ یہ ٹھیک سنہ ۱۹۰۰ء کے اواخر کی بات ہے۔ پہلا نمبر عید الفطر کے موقع پر نکلا تھا"۔ [1]

المصباح کے زمانۂ اجرا کے تعین میں مولانا کے ان الفاظ سے مدد ملتی ہے:

"یہ ٹھیک سنہ ۱۹۰۰ء کے اواخر کی بات ہے۔ پہلا پرچہ عید الفطر کے موقع پر نکلا تھا"

غور کیجیے کہ سنہ ۱۹۰۰ء کے اواخر میں عید کس تاریخ کو پڑی تھی؟ تقویم سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۹۰۰ء کے اواخر میں نہ عید الفطر پڑی نہ عید الاضحیٰ۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں عید الفطر ۲، فروری کو ہوئی تھی۔ لیکن اگر ہم سنہ ۱۹۰۰ء کے اواخر کا خیال رکھیں تو اس سے قریب تر عید الفطر ۲۲، جنوری سنہ ۱۹۰۱ء کو ہوئی تھی۔ چوں کہ مولانا کے قیاس (اواخر سنہ ۱۹۰۰ء) اور سنہ ۱۹۰۱ء کی عید الفطر میں صرف اکیس دن کا فرق ہے، اس لیے ایک ایسے اندازے میں جو ۲۰، ۲۱ سال کے بعد کیا جا رہا ہو، غلطی ہو جانا عین ممکن ہے۔ البتہ یہ محال ہے کہ مولانا پورے یقین و اعتماد کے ساتھ کہیں کہ "یہ ٹھیک سنہ ۱۹۰۰ء کے اواخر کی بات ہے" اور وہ بات ٹھیک سنہ ۱۹۰۰ء کے اوائل کی ہو، اس لیے میں نے مولانا کے یقین و اعتماد کا لحاظ کرتے ہوئے اس سے قریب تر زمانے کی عید الفطر کو بنیاد بنایا ہے، اس لیے المصباح کی اشاعت کے بارے میں یہ میری قطعی رائے ہے کہ اس کا پہلا پرچہ اوائل جنوری سنہ ۱۹۰۱ء میں شائع ہوا ہوگا۔

المصباح کے پہلے نمبر کا افتتاحیہ مولانا نے "عید" کے عنوان سے لکھا تھا جسے بہت پسند کیا گیا۔ اور پیسہ اخبار اور بعض دوسرے اخباروں نے اسے نقل کیا۔ مولانا کے لیے اس وقت گویا یہ بڑی رفعت اور منزلت کی بات تھی۔ المصباح کی ترتیب میں اس وقت مسائل و مباحث کے علاوہ علمی، تاریخی اور سوانحی مضامین کے لیے الگ الگ صفحات مقرر کیے گئے تھے۔

اس اخبار میں مولانا کو پہلی مرتبہ واقعات و اخبار پر بہ اسلوب جرائد بحث کرنے کا موقع ملا اور بلا کسی دِقت کے انھوں نے ہر نمبر کے لیے مختلف قسم کے مضامین لکھے، امام غزالی، نیوٹن اور مسئلہ کشش ثقل وغیرہ مضامین اس میں مولانا کے قلم سے نکلے۔ کشش ثقل

---

[1] ایضاً ص ۲۷۵۔

غالباً وہی مضمون ہے جس کا تعارف مولانا نے اپنی ۱۳ برس سے ۱۸ برس تک کی عمر کی تصانیف میں "کششِ مادہ اور کششِ عشق" کے نام سے ان الفاظ میں کرایا ہے :

"اس میں دکھایا ہے کہ جس طرح عالم مادہ ہے، اسی طرح جذبات کا عالم ہے، اور دونوں کے قوانین یکساں ہیں۔"[۱]

مولانا کے بیان کے مطابق المصباح تین چار مہینے سے زیادہ نہ چل سکا اور بند ہوگیا۔[۲]

المصباح کا کوئی پرچہ ابھی تک کسی صاحب کو دستیاب نہیں ہوا۔ اس لیے اس کے اجرا اور بندش کی صحیح تاریخوں کا قطعی تعین نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا کے اس میں مطبوعہ مضامین بھی نایاب ہیں۔

احسن الاخبار :

المصباح کی اشاعت سے مولانا کو مضمون نگاری اور ادارت کا جو شوق پیدا ہوگیا تھا۔ اب وہ ایک نئے میدان کا متلاشی تھا، اتفاق سے انھیں دنوں مولوی سید احمد حسن فتح پوری نے کلکتہ کے ایک کتب فروش اور مصطفائی پریس کے مالک عبدالغفار کو ایک ہفتہ وار اخبار جاری کرنے پر آمادہ کیا۔ چنانچہ "احسن الاخبار" کے نام سے ایک رسالہ جاری ہوگیا۔ مولوی احمد حسن مرحوم کے مولانا آزاد سے بہت گہرے تعلقات تھے، مولوی صاحب اکثر اوقات مولانا آزاد کے یہاں بیٹھتے تھے، اخبار کا دفتر بھی مولانا کے مکان سے قریب تھا۔ اس وجہ سے ہر وقت کا آنا جانا تھا۔ احسن الاخبار کی صورت میں ایک قریبی مصرفِ طبع آزمائی مولانا کے ہاتھ آگیا، اس وقت تک تحریر کی مشق بھی کافی ہوگئی تھی۔ مولوی احمد حسن مرحوم کو مولانا کے قلم اور خیالات پر اعتماد ہوگیا تھا۔ اس لیے مولانا جو کچھ لکھتے بہ راہِ راست کاتبوں کو دے دیتے اور چھپ جاتا۔ احسن الاخبار سے مولانا کو دو فایدے پہنچے، جس کا انھوں نے اعتراف کیا ہے :

---

[۱] ذکرِ آزاد۔ عبدالرزاق ملیح آبادی۔ آزاد ہند۔ کلکتہ، ۱۹۶۰ء صـ۲۸۲۔

[۲] آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی صـ۲۷۵۔

۱۔ پہلا فائدہ یہ تھا کہ احسن الاخبار کے تبادلے میں مصر، قسطنطنیہ، طرابلس، تیونس، الجزائر، امریکہ کے تمام عربی اخبارات ورسائل آتے تھے۔ یہیں انھیں مصر کے علمی رسائل "الہلال" المقتطف، المنار وغیرہ کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ اس سے مولانا کی معلومات میں اضافہ ہوا۔ دنیائے اسلام کے مسائل سے دلچسپی پیدا ہوئی، اور عربی ادب کے ذوق کی بنیاد مستحکم ہوگئی۔ المنار سے مولانا خاص طور پر متاثر ہوئے۔ فرماتے ہیں:

> "المنار کیا باعتبارِ ادب و بلاغت کے اور کیا باعتبارِ مباحث کے میرے لیے بالکل ایک نئی چیز تھی۔ عربی کتابت و بلاغت کے ایسے صحیح وصادق نمونے کا اس وقت طبیعت پر جو اثر پڑا وہ آگے چل کر عربی علم وادب کے ذوق میں نہایت کارآمد ثابت ہوا۔" لے

۲۔ دوسرا فائدہ احسن الاخبار کی وجہ سے مولانا کو یہ پہنچا کہ مولانا کو ہر طرح کی مضمون نویسی کا موقع ملا۔ عربی اخبارات کے مضامین اور خبروں کا انتخاب وترجمہ علمی وادبی مضامین کی ہر نمبر کے لیے تالیف وترتیب، رسالوں اور کتابوں پر ریویو، نیز اخبار وحوادث پر بحث ونظر وغیرہ۔ کے

مولانا کے بیان کے مطابق خواجہ حافظ شیرازی اور عمر خیام پر پورا ایک سلسلۂ مضمون اس میں شائع ہوا تھا۔ اس سلسلے میں یہ بحث چھڑ گئی تھی کہ ان شعرا کے کلام سے ان کی زندگی اور کیریکٹر پر روشنی پڑتی ہے یا نہیں؟ اور اس کا امکان ہے یا نہیں کہ ان کے جام و ساقی کی صدائیں محض شاعرانہ ہی نہ ہوں بلکہ واقعی ہوں؟۔

احسن الاخبار کے مضامین میں معرکے کا مضمون وہ تھا جو "اسلام اور محرم" کے عنوان سے نکلا تھا جس میں بدعات ورسوم محرم پر سخت . . تنقید کی گئی تھی۔ اس کی وجہ سے عوام میں ایک سخت اشتعال پیدا ہو گیا تھا۔

مولانا نے نہایت تفصیل کے ساتھ اس مضمون سے پیدا شدہ حالات بیان کیے ہیں۔ اس ہنگامے کا نتیجہ اور تو کچھ نہ نکلا "احسن الاخبار" بند ہو گیا۔

احسن الاخبار کے اجرا کا زمانہ یقینی طور پر ۱۹۰۲ء کے شروع کا ہے۔ ڈاکٹر عابد رضا

لے ایضاً ص ۲۷۷۔ کے ایضاً ص ۲۷۸۔

بیدار کی نظر سے احسن الاخبار کے ۱۸ جولائی ۱۹۰۲ء سے ۱۹ ستمبر تک کے کچھ پرچے گزرے ہیں ۔ ۱۸ جولائی کا پرچہ پہلی جلد کا ۲۲ واں شمارہ ہے ، اور ۱۹ ستمبر کا پرچہ ۳۱ واں شمارہ ہے ۔ گویا اس مدت میں پابندی کے ساتھ پرچہ نکلتا رہا ۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ ۱۸ جولائی سے پہلے اس کے ابتدائی پرچے بھی پابندی کے ساتھ ہفتہ وار نکلتے رہے ہوں گے تو اس کا پہلا پرچہ ۲۶ مارچ ۱۹۰۲ء یا اس کے قریب کی کسی تاریخ کا ہونا چاہیے ۔

یہاں اس غلط فہمی میں ہرگز مبتلا نہ ہو جانا چاہیے ، کہ عمر خیام پر احسن الاخبار میں جو سلسلۂ مضمون نکلا تھا وہ مولانا کے قلم سے تھا ۔ یہ مضمون ان کے بڑے بھائی مولوی غلام یٰسین آہ کے قلم سے تھا جو بعد میں کتابی صورت میں بھی شائع ہو گیا تھا ۔ [1]

احسن الاخبار کے جو چھ پرچے ڈاکٹر عابد رضا بیدار کی نظر سے گزرے ہیں ان میں مولانا کا کوئی مضمون نہیں ۔ ابتدائی پرچوں میں یقیناً مولانا کے مضامین بھی ہوں گے ، اس لیے کہ مولانا آزاد ، مولوی سید احمد حسن کے شروع سے معاون تھے ۔ رزاق فاروقی صاحب کی نظر سے احسن الاخبار یکم جون ۱۹۰۲ء کا ایک پرچہ گزرا ہے ۔ اس میں مولانا کے ایک مضمون کی دوسری قسط ہے ۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مولانا کے مضامین اس سے پہلے شائع ہوئے ہیں ۔ ممکن ہے ستمبر کے بعد کے پرچوں میں بھی مولانا کا کوئی مضمون ہو ۔

تحفۂ احمدیہ :

احسن الاخبار ۱۹۰۳ء کے شروع میں بند ہو گیا ، تو مولوی سید احمد حسن کو تحفۂ احمدیہ دوبارہ نکالنے کا خیال پیدا ہوا ۔ تحفۂ احمدیہ پہلے کانپور سے تحفۂ محمدیہ کے نام سے مولانا محمد علی مونگیری بانی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی ادارت میں نکلتا تھا ، مولانائے موصوف اس زمانے میں مدرسہ فیض عام ، کانپور میں مدرّس تھے ، عیسائی مشنریوں سے مناظرے اور ان کے رد میں انھیں مضامین و رسائل لکھنے کا بہت شوق تھا ۔ تحفۂ محمدیہ انھوں نے اسی ضرورت سے نکالا تھا ۔ مولوی سید احمد حسن فتح پوری ، مولانا محمد علی مونگیری کے بعد کچھ دنوں تک تحفۂ محمدیہ کے ایڈیٹر بھی رہے تھے ، عیسائی مشنریوں سے ایک مناظرے کے سلسلے میں ایک

---

[1] مولانا ابوالکلام آزاد ۔ عابد رضا بیدار ، انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز ۔ رامپور ، ۱۹۶۸ء ، ۷۹ ، ۸۰ ۔

مقدمے کے بعد ۱۸۹۹ء میں تحفۂ محمدیہ بند ہوگیا۔ کچھ دنوں کے بعد مولوی سید احمد حسن نے تحفۂ احمدیہ کے نام سے اس کا اجرا کیا۔ مولوی صاحب مرحوم ندوۃ العلماء کے نہایت پرزور حامی تھے، ندوے سے اسی دلچسپی کی بنا پر ۱۹۰۰ء کے اواخر یا ۱۹۰۱ء کے شروع میں کلکتہ آگئے تھے، جہاں اس سال ندوے کا سالانہ اجلاس ہونے والا تھا اور اس کی تیاریاں شروع ہوگئی تھیں۔

تحفۂ احمدیہ کے احیا کے لیے مولانا آزاد نے انھیں خاص طور پر ترغیب دی ہو کیونکہ یہ بات ان کے خاص ذوق اور دلچسپی کی تھی اس لیے وہ اس شرط پر اسے نکالنے پر آمادہ ہوگئے کہ مولانا اس کی ترتیب کی ذمے داری لے لیں۔ مولانا تو چاہتے ہی یہ تھے کہ ایک رسالہ ان کے ہاتھ میں ہو، انھوں نے حامی بھرلی اور تحفۂ احمدیہ جاری ہوگیا۔ اس مرتبہ وہ ایک عام علمی و دینی رسالہ تھا، اس کے ایڈیٹر مولوی سید احمد حسن تھے۔ لیکن اس کی ترتیب کی تمام تر ذمے داری مولانا آزاد پر تھی۔

تحفۂ احمدیہ ایک شعلۂ مستعجل تھا جو بھڑکا اور بجھ گیا۔ اس کی مدتِ عمر چند ماہ سے زیادہ نہیں بڑھی، اس کی بندش کی وجہ غالباً یہ تھی کہ مولوی صاحب مرحوم ایک ملازمت کے سلسلے میں دارجلنگ چلے گئے اور وہیں ان کا ۱۰ دسمبر ۱۹۰۲ء کو انتقال ہوگیا۔ [1]

یہ بات ابھی تحقیق طلب ہے کہ تحفۂ احمدیہ میں مولانا آزاد کے قلم سے کون کون سے مضامین نکلے۔ اس زمانے کے دوسرے رسائل کی طرح تحفۂ احمدیہ کا وجود بھی نایاب ہے۔

خدنگِ نظر۔ لکھنؤ:

یہ منشی نوبت رائے نظر کا مشہور گلدستہ تھا۔ ۱۹۰۳ء میں چند ماہ تک مولانا اس کے حصۂ نثر کے اسسٹنٹ ایڈیٹر رہے تھے۔ مارچ ۱۹۰۳ء کے شمارے میں "عرض حال" کے عنوان سے مہتمم خدنگ نظر کی جو تحریر ہے۔ اس میں لکھتے ہیں:

"ہم نے اپنی کوششوں میں اپنے دلی دوست ابوالکلام مولوی محی الدین صاحب آزاد دہلوی کو بھی شریک کرلیا ہے جن کے اکثر مضامین خدنگ اور دوسرے

---

[1] لسان الصدق کلکتہ۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۰۳ء۔

معزز اُردو جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ آیندہ سے وہ خدنگ نظر کے حصّہ مضامین کے لیے اسسٹنٹ ایڈیٹر کے فرائض ادا کریں گے جو انھوں نے بہ خوشی قبول فرمائے ہیں۔" ؎۱

مئی اور جولائی کے پرچوں میں مولانا کے مضمون میں ان کے نام کے ساتھ اسسٹنٹ ایڈیٹر کے الفاظ بھی چھپے ہیں۔ اس زمانے کے خدنگ نظر کے پرچوں کا پاکستان کی کسی لائبریری یا کسی ذاتی علمی ذخیرے میں پتا نہیں چل سکا۔ جناب مشفق خواجہ کے پاس ۱۸۹۹ء کی ایک جلد ہے۔ ۱۹۰۲-۰۳ء کے کچھ شمارے جناب عبدالقوی دسنوی کی نظر سے گزرے ہیں۔ فروری ۱۹۰۲ء سے فروری ۱۹۰۳ء تک کے دس شمارے خاکسار کے پاس ہیں۔ ؎۲

خدنگ نظر میں مولانا کے جو مضامین شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سے مندرجۂ ذیل مضامین ابھی خاکسار کی دسترس سے باہر ہیں۔

۱۔ زمانۂ قدیم میں کبوتروں کی ڈاک (نمبر۱) ..... مئی ۱۹۰۲ء
" " " " (نمبر۲) ..... جون "
۲۔ ہپنوٹیزم (نمبر۲) ...... نومبر ؎۳
۳۔ منار خسرو گر۔ (بسلسلۂ آثار قدیمہ)۔ ..... مارچ ۱۹۰۳ء
۴۔ افغانستان .... اپریل "
۵۔ ضوء غیر مرئی (نمبر۱) ایک جرمن پروفیسر کی حیرت انگیز ایجاد۔ مئی "
" " (نمبر۲) " " " جولائی "

مولانا آزاد کے یہ مضامین اگرچہ ۱۶، ۱۷ برس کی عمر کے ہیں لیکن ایسے نہیں ہیں کہ انھیں یک قلم نظر انداز کر دیا جائے۔ مولانا آزاد کے بارے میں علامہ شبلی مرحوم کی جو بہت اچھی رائے تھی اس کی بنیاد اسی زمانے کی مضمون نگاری پر تھی۔ ایکس ریز یعنی ضوء غیر مرئی کی تاریخ انکشاف و حقیقت پر مولانا کا مضمون شائع ہوا تو علامہ شبلی نے ان کے نام ایک خط میں اپنی پسندیدگی کا اظہار ؎۴ کیا تھا، بعد میں اس مضمون کے حوالے سے الندوہ کے

؎۱ مولانا ابوالکلام آزاد اور خدنگ نظر۔ ہماری زبان علی گڑھ۔ یکم نومبر ۱۹۶۹ء ؎۲ خاکسار کے پاس ۱۹۰۲ء کے فروری مارچ، مئی، جون، جولائی، ستمبر، اکتوبر، نومبر اور ۱۹۰۳ء کے جنوری اور فروری کے شمارے ہیں ؎۳ میرے پاس یہ تینوں پرچے ہیں لیکن ناقص، مضمون شاید پہلے ہی کسی شوقین نے نکال لیے ہیں۔ ؎۴ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی صفحہ ۲۷۔

لیے مضمون لکھنے کی ان سے فرمایش کی تھی۔ ۱۹۰۵ء میں علامہ مرحوم سے اپنی ملاقات کے سلسلے میں مولانا فرماتے ہیں :

"ایک دن [علامہ شبلی] میرے یہاں بیٹھے تھے اور کتابوں کی الماریوں سے کتابیں نکال نکال کر دیکھ رہے تھے۔ اس میں خدنگ نظر کا ایک مجموعہ نکل آیا۔ اس میں میرے مضامین بھی تھے۔ پڑھ کر انھوں نے [حیدر آباد دکن آنے کے لیے] بہت زیادہ اصرار کیا۔ اس میں ایک مضمون ایکس ریز کی ایجاد و حقیقت پر تھا۔ انھوں نے کہا۔ جب تم ایسے مضامین لکھ سکتے ہو تو کیوں اس طرح بلا کسی مشغلے کے ہو؟ کم از کم ایک مضمون الندوہ کے ہر نمبر کے لیے لکھ دیا کرو"۔ [1]

مولانا کے یہی مضامین تھے جن سے متاثر ہو کر علامہ مرحوم نے انھیں الندوہ کی زمام ادارت اپنے ہاتھ میں لینے کی دعوت دی تھی۔

ایڈورڈ گزٹ۔ شاہجہانپور :

کچھ دنوں تک مولانا ہفتہ وار ایڈورڈ گزٹ کے ایڈیٹر بھی رہے تھے۔ لسان الصدق کے شمارۂ آخر بابت ماہ اپریل مئی ۱۹۰۵ء میں "مسلم پریس کانفرنس" پر نوٹ میں لکھتے ہیں :

"ایڈورڈ گزٹ شاہجہانپور کی وقتی ایڈیٹری کے زمانے میں ہم نے ایک نوٹ لکھ کر منشی صاحب [منشی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار لاہور] کو پھر پریس کانفرنس کی طرف توجہ دلائی"۔

ایڈورڈ گزٹ کی ایڈیٹری اور اس میں مضمون نویسی کے بارے میں اس سے زیادہ ابھی تک کوئی علم نہیں ہو سکا۔ عابد رضا بیدار صاحب کا خیال ہے کہ اس کی ایڈیٹری کا زمانہ ۱۹۰۲-۳ء کا کوئی مختصر عرصہ ہے۔[2] میرے خیال میں یہ واقعہ قطعی طور پر ۰۲ء کا ہے۔ یا کم از کم مارچ ۰۳ء میں خدنگِ نظر کے حصۂ نثر کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہونے سے پہلے کا واقعہ ہے۔

لسان الصدق۔ کلکتہ :

نومبر ۱۹۰۳ء میں مولانا نے لسان الصدق کے نام سے ایک ماہوار رسالہ کلکتہ سے جاری

---

[1] آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی ص ۳۱۱-۱۲ [2] مولانا ابوالکلام آزاد ص ۷۹۔

کیا جو وقفوں کے ساتھ مئی ۱۹۰۵ء تک جاری رہا اور اس کے کل دس نمبر شائع ہوئے۔ یہ پرچہ علمی دنیا میں ایسا مقبول ہوا کہ بقول مالک رام "دھوم مچ گئی"۔[۱] ملک کے مشہور جرائد و اخبارات مثلاً وکیل امرت سر، پیسہ اخبار لاہور، مخزن لاہور، افسانہ حیدر آباد دکن، معین الاخبار مراد آباد، ریاض الاخبار گورکھپور، دل چسپ امرت سر، ایڈورڈ گزٹ شاہجہانپور، نظام الملک مراد آباد، نے اس کے معیارِ علم و صحافت، مضامین کے تنوع۔ فکر کی نکتہ آفرینی، مباحث کی بدت طرازی، ترتیب و تہذیب کے حسن، اسلوب کی شگفتگی، انشا کی دل رُبائی، طرزِ ادا کی ندرت، قلم کی پختگی اور مقاصد کی اہمیت پر داد و تحسین کے پھول برسائے۔ جناب عبد القوی دسنوی فرماتے ہیں:

> "اس رسالے کے مطالعے سے آزاد کے جاگے ہوئے شعور کا احساس ہوتا ہے انھوں نے رسالے کی مختصر زندگی کے باوجود اپنے دَور کے اخبارات و رسائل کو متاثر کیا۔ انھیں قومی خدمات کے لیے ابھارا جو اس رسالے کی عظمت کی بڑی دلیل ہے۔"[۲]

لسان الصدق کے تمام پرچے دستیاب ہو گئے ہیں مطبوعات آزاد صدی کے پروگرام میں اس کی عکسی اشاعت پیشِ نظر ہے۔ "مولانا ابو الکلام آزاد کی صحافت" مطبوعات آزاد صدی کی بیسویں کتاب میں لسان الصدق کی تاریخ صحافت میں علمی، ادبی اہمیت اور اس کے خصائص پر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ اس میں لسان الصدق کے مضامین کا مکمل اشاریہ بھی شامل ہے۔

الندوہ۔ لکھنؤ:

اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک مولانا الندوہ کے اسسٹنٹ ایڈیٹر رہے۔ الندوہ میں مولانا کے قلم سے کئی بلند پایہ مضمون نکلے۔ ایک مصری عالم فرید وجدی کی کتاب المراۃ المسلمہ پر ایک نہایت مفصل ریویو کیا جو الندوہ کے تین نمبروں نومبر دسمبر ۱۹۰۵ء اور فروری ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا۔ یہ ریویو وکیل امرت سر میں بھی نقل کیا گیا۔ اور بعد میں اسی

---

[۱] تحریر دہلی ۱۹۶۸ء ج ۲ شمارہ ۱۔ [۲] مضامین لسان الصدق عبد القوی دسنوی نسیم بک ڈپو لکھنؤ۔ ۱۹۶۷ء ص ۲۳۔

اخبار کی طرف سے مطبع روز بازار امرت سر میں چھپوا کر کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ اس کے بعد سے اب تک اس کے بیسیوں ایڈیشن پاک و ہند سے شائع ہو چکے ہیں۔ اگرچہ مولانا نے دوبارہ اس کی اشاعت کی اجازت نہیں دی۔ اس مسئلے میں بعد میں ان کی رائے بدل گئی تھی۔ بعض باتیں ان کے نزدیک سطحی اور علمی تحقیقات کے خلاف ثابت ہو چکی تھیں۔ محمد یونس خالدی مرحوم کے نام ایک خط میں مولانا فرماتے ہیں :

> "یہ مضامین پندرہ سولہ برس کی عمر میں لکھے گئے تھے۔ ان میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جن میں میری رائے بدل گئی ہے، اور بہت سی باتیں اب صحیح نہیں سمجھتا۔ . . . . فرید وجدی نے اس کتاب میں جو کچھ لکھا ہے وہ نہایت سطحی ہے، اور علمی تحقیقات کے خلاف ہے۔ مولانا شبلی مرحوم کی فرمائش پر میں نے ریویو لکھ دیا تھا اس وقت میری معلومات محدود تھیں۔" [۱]

بعض حضرات نے خیال کیا کہ یہ فرید وجدی کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ درحقیقت یہ اس پر تبصرہ یا مولانا مرحوم کے الفاظ میں "ریویو" ہے۔ اس میں مولانا نے بڑی قابلیت کے ساتھ کتاب کے تمام اہم مطالب کا احاطہ کر لیا ہے، اور ریویو ایک مستقل تخلیقی عمل معلوم ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل مضامین مولانا کے قلم سے نکلے اور الندوہ میں شائع ہو کر اہل علم میں مقبول ہوئے۔

۱۔ القضاء فی الاسلام	فروری ۱۹۰۶ء
۲۔ مسلمانوں کا ذخیرۂ علم اور یورپ۔	اکتوبر ۱۹۰۵ء
۳۔ ندوۃ العلماء دہلی کا اجلاس اور قوم کی راہ مقصود۔	اپریل ۱۹۰۶ء
۴۔ ندوۃ العلماء میں ایک کتب خانے کی ضرورت (بسلسلۂ ایڈیٹوریل نوٹس)	فروری ۱۹۰۶ء
۵۔ یورپ میں گونگوں کی تعلیم (بسلسلۂ علمی خبریں)	مارچ ۱۹۰۶ء

---

[۱] امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے افادات علمیہ، محمد یونس خالدی ہفتہ وار الکلام پٹنہ، ۷ مارچ ۱۹۵۹ء۔ نیز دیکھیے "افادات آزاد"، مرتبہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری، کراچی، آزاد صدی ایڈیشن، ۱۹۸۹ء، ص ۱۷۹۔

وکیل امرت سر:

الندوہ سے مولانا وکیل امرت سر میں چلے گئے اور اپریل سے نومبر ۱۹۰۶ئہ تک اس کے مدیر رہے۔ وکیل ہفتے میں دو بار شائع ہوتا تھا۔ مولانا نے اسے ہفتے میں تین بار کر دیا۔ اس دوران میں ان کے بھائی مولوی غلام یٰسین آہ جو اسلامی ممالک کی سیاحت کرنے گئے تھے، بیمار ہو کر وطن واپس لوٹے۔ لیکن وہ اس بیماری سے جاں بر نہ ہو سکے۔ غالباً ستمبر ۱۹۰۶ئہ میں کلکتہ میں ان کا انتقال ہوا۔ اس واقعے سے مولانا کا دل اچاٹ ہو گیا۔ والد کلکتہ واپس آنے کے لیے پہلے سے مصر تھے، پھر انھوں نے مولانا کو کلکتہ واپس لانے کے لیے آدمی بھیج دیا۔ چنانچہ نومبر کی کسی تاریخ کو مولانا کلکتہ کے لیے روانہ ہو گئے۔

دارالسلطنت کلکتہ:

والد مرحوم کی خواہش تھی کہ اب وہ کلکتہ سے باہر نہ جائیں۔ بڑے بیٹے کے انتقال کے بعد اب وہی ان کی امیدوں کا آخری سہارا تھے۔ کلکتہ کے احباب کا اصرار بھی یہی تھا کہ اب مولانا کلکتہ میں مستقل قیام کریں لیکن والد کی جانشینی اور پیری مریدی کی زندگی ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ ان کا شاہینِ فکر علم وصحافت کا وسیع فضاؤں میں پرواز کا عادی تھا۔ زندگی کا کوئی محدود دائرہ اور رسم وروایت کی بندشوں کو ان کا ذہن قبول ہی نہ کر سکتا تھا۔ مولوی محمد یوسف جعفری رنجور جن سے مولانا کے قدیم سے مراسم تھے انھوں نے مولوی عبداللطیف تاجر چرم کو اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ اپنے والد مولوی عبدالباری کی یادگار "دارالسلطنت" کو جو ان کی وفات کے بعد بند ہو گیا تھا دوبارہ جاری کریں، اور مولانا آزاد اس کے مدیر مقرر ہوں۔ مولانا کے لیے یہ ایک دلچسپ مشغلہ تھا۔ مولانا نے اس ذمے داری کو بخوشی قبول کر لیا۔ دارالسلطنت ہفتہ وار اخبار تھا، اور چھپائی اور کتابت کا اچھا انتظام کیا گیا تھا۔ جنوری ۱۹۰۷ئہ سے چند ماہ تک مولانا اس کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ لیکن مولوی عبداللطیف نہ تو صحافت کے آداب سے واقف تھے اور نہ علم و ادب کا ذوق رکھتے تھے لیکن اخبار کی پالیسی اور وقت کے مسائل کی نسبت دخل دیتے تھے۔ مولانا ان کے اس رویے سے دل برداشتہ ہو کر اخبار سے الگ ہو گئے، اور پھر اخبار بھی بند ہو گیا۔

دوبارہ وکیل :

دارالسلطنت سے علاحدگی کے کچھ دنوں بعد مولانا پھر امرت سر چلے گئے اور آٹھ نو ماہ کے وقفے کے بعد دوبارہ وکیل کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پہلی مرتبہ وکیل میں جانے کے بعد وکیل ہفتے میں تین بار شائع ہونے لگا تھا۔ لیکن اب پھر بائی ویکلی کر دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ مولانا فرماتے ہیں :

”اس مرتبہ میں نے محسوس کیا کہ اخبار کا ہفتے میں تین مرتبہ نکلنا تقریباً بے سود ہے۔ روزانہ کا وہ کام دے نہیں سکتا، اور تین ٹکڑے ہو جانے کی وجہ سے محنت بے کار منقسم ہو جاتی ہے۔ شیخ غلام محمد نے بھی اتفاق کیا۔ اور اخبار کو بائی ویکلی کر دیا۔ مگر دو مرتبہ میں ضخامت اس سے کہیں زیادہ تھی جتنی تین مرتبہ میں ہوا کرتی تھی“ [1]

اس مرتبہ وکیل سے مولانا کا تعلق نو دس مہینے رہا۔ میرے اندازے کے مطابق اگست ۱۹۰۷ء کے اواخر یا ستمبر کے شروع میں پہنچے ہوں گے اور جون ۱۹۰۸ء کے آخر یا جولائی کے شروع میں قطع تعلق ہو گیا۔

وکیل میں مولانا دو مرتبہ گئے پہلی مرتبہ ۱۹۰۶ء میں تقریباً سات مہینے اور دوسری مرتبہ ۱۹۰۷-۸ء میں نو دس مہینے تعلق رہا۔ چوں کہ وکیل میں مدیر کی حیثیت سے ان کا نام شائع نہیں ہوتا تھا اور نہ مضامین پر نام کی صراحت ہوتی تھی اس لیے وکیل کے زمانۂ ادارت کا صحیح تعیّن اور مضامین کی نشان دہی مشکل ہے۔ لیکن اگر وکیل کی اس زمانے کی جلدیں دستیاب ہوں تو ان کے زمانۂ ادارت کے تعین میں بھی مدد مل سکتی ہے۔ اور ایسے شواہد بھی موجود ہیں جن سے ان کے بہت سے مضامین کی نشان دہی بھی کی جا سکتی ہے۔ مثلاً

ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کی کتاب ”الحقوق والفرائض“ پر تبصرہ جو نومبر ۱۹۰۶ء تا جنوری ۱۹۰۷ء کے کسی نمبر میں ہونا چاہیے[2] اسی طرح بھوپال کے محمد یوسف قیصر کی ایک نظم ماہنامہ خاتون علی گڑھ میں چھپی تھی۔ اس پر مولانا نے وکیل کے شذرات میں تنقید کی تھی۔ قیصر صاحب کی طرف

---

[1] آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی ص ۲۲-۲۲۳ [2] ایضاً ص ۲۱۸۔

سے اس کا جواب پیسہ اخبار لاہور کے ذریعے دیا گیا۔ مولانا نے جواب الجواب وکیل میں دیا۔ کچھ دنوں تک یہ بحث چلتی رہی پھر ختم ہو گئی۔ [۱] اسی طرح ایک مضمون "دن کا دربار" کے عنوان سے چھپا تھا [۲] یا بھائی (غلام یٰسین آہ) کے انتقال پر مولانا کا پر سوز اداریہ وغیرہ۔

ابھی مولانا کے بعض رسائل اور مضامین کا تذکرہ باقی رہ گیا۔

(۳)

اعلان الحق:

مولانا کا یہ رسالہ اپنے والد مولوی خیرالدین کی حمایت میں اور بعض علمائے کلکتہ کے رد میں ہے۔ مولوی خیرالدین نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ ایک جگہ رؤیت ہلال اور اس کی شہادت شرعی کے بعد جدید ذرائع مثل ٹیلیفون، تار، ریڈیو وغیرہ کے ذریعے اس کے اعلان پر دوسرے مقام کے مسلمانوں پر قیام رمضان وعید لازم آجاتا ہے۔ کلکتہ کے بعض علما نے نہ صرف اس رائے کی سختی کے ساتھ تردید کی بلکہ مولوی خیرالدین پر ذاتی نوعیت کے اعتراضات شروع کر دیے۔ مولانا نے دلائل شرعی کے ساتھ اس رسالے میں اپنے والد مرحوم کے موقف کی حمایت کی ہے۔ یہ رسالہ ۲۵ رمضان المبارک ۱۳۱۹ھ مطابق ۵ جنوری ۱۹۰۲ء کو عثمانی پریس۔ کلکتہ سے شائع ہوا تھا۔ جناب مالک رام نے مولانا کا یہ رسالہ تحریر دہلی ۱۹۶۸ء شمارہ ۱ میں از اول تا آخر اصل کے مطابق چھاپ دیا ہے۔

ہدایت الرشید:

اعلان الحق کے آخر میں مولانا کے ایک اور رسالے ہدایت الرشید کا اشتہار ہے۔ اس میں لعنِ یزید سے متعلق ایک بحث پر جو کلکتہ کے علما میں چھڑ گئی تھی محاکمہ کیا گیا ہے، اس اشتہار ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ امام غزالی، ملا علی قاری اور صاحب قصیدۂ امالی کے برخلاف مولانا جواز لعن کے قایل تھے۔ لیکن بعد میں مولانا کی یہ رائے نہیں رہی تھی۔

---

[۱] مولانا ابوالکلام آزاد اور بھوپال، محمد یوسف قیصر، ماہنامہ آج کل دہلی۔ ستمبر ۱۹۵۸ء۔

[۲] مولانا ابوالکلام آزاد، عابد رضا بیدار ص ۲۱۹۔

احسن المسالک :

ذکر آزاد میں جہاں عبدالرزاق ملیح آبادی نے مولانا کی ابتدائی ادبی زندگی کا تذکرہ کیا ہے۔ وہاں خود مولانا کی ایک تحریر نقل کی ہے جس میں مولانا نے خود اپنی تصانیف کا تعارف کرایا ہے۔ اس کے دو حصے ہیں :

پہلے حصے میں ۱۲ برس سے ۱۸ برس کی عمر تک کی تصانیف ہیں۔

دوسرے حصے میں ۱۸ برس کی عمر کے بعد کی تصانیف ہیں۔ اس ترتیب میں پہلی تصنیف اعلان الحق ہے۔ جس کا تعارف اوپر کی سطروں میں گزر چکا ہے۔ دوسری تصنیف "احسن المسالک" ہے۔ اس کا تعارف مولانا نے ان الفاظ میں کرایا ہے :

"صوفی ازم اور طریق ریاضت کے مختلف اسکولوں کی تشریح"[1]

اس کی تاریخ تحریر کا قطعی تعین تو مشکل ہے لیکن یہ بات بھی قطعی طور پر واضح ہے کہ یہ ۱۹۰۳ء سے پہلے کی تصنیف ہے، اس وقت تک مولانا کے عقاید میں شک و تذبذب کا کوئی کانٹا نہیں چبھا تھا، مولانا نے ایک سطر جو اس کے تعارف میں لکھی ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت مولانا کے خیالات پر صوفیانہ خیالات کا اثر تھا۔ میرا خیال ہے یہ رسالہ انھوں نے امام غزالی کے خیالات سے متاثر ہو کر لکھا ہوگا۔ امام غزالی کی تصانیف سے انھیں ابتدائی علمی زندگی میں خاص دلچسپی تھی، احیاء العلوم، منہاج العابدین، تہافۃ الفلاسفہ، مضنون وغیرہ کتابیں نہ صرف ان کی نظر سے گزر چکی تھیں بلکہ احیاء العلوم سے ماخوذ "تعصب کی مضرتیں" لکھ چکے تھے، منہاج اور مضنون کا مکمل ترجمہ کیا تھا اور تہافۃ الفلاسفہ کا بھی نصف کے قریب ترجمہ کیا تھا۔

العلوم الجدیدہ والاسلام :

۱۹۰۲ء میں مولانا نے ایک مضمون "العلوم الجدیدہ والاسلام" کے نام سے لکھا تھا، اور مرقع عالم۔ ہردوئی میں اشاعت کے لیے بھیجا تھا۔ اس کے ایڈیٹر حکیم محمد علی طبیب کے نام

---

[1] ذکر آزاد ص ۲۸۱۔

اپنے خط مورخہ ۱۱ر جون ۱۹۰۲ء یوم الاربعہ (بدھ) میں لکھتے ہیں :

"اس عریضے کے ہمراہ ایک مضمون "علوم جدیدہ اور اسلام" کے عنوان سے ارسال خدمت کرتا ہوں۔ اسے مرقع میں شامل کیجیے، انشاءاللہ نمبر ۳ و ۴ بھی ارسال خدمت عالی کروں گا۔"

"مولوی محمد عمر نے واقعی یہ بہت اچھا کیا کہ مرقع عالم کو علوم مغربی کا مخزن بنایا۔ ملک اور قوم کو ان کا ممنون ہونا چاہیے۔ مگر ساتھ ہی اگر آپ غور کریں گے تو اشاعت علوم مغربی سے ایک اور زہریلا مرض ہندوستان میں پھیل رہا ہے اور جب اس میں ترقی ہو گی تو اس میں بھی یقیناً ہو گی۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس کا انسداد بھی قبل از وقت کر لیا جائے۔ آپ کہیں گے، وہ کونسا مرض ہے؟ حضرت! وہ دہریت اور لامذہبیت کا مرض ہے جو مذہب کی پاک زندگی کا کام تمام کر دیتا ہے۔ اور جس نے یورپ کو مذہب کی قید سے آزاد کر دیا ہے۔ اور یہ اس وجہ سے ہے کہ اسلام کو ناواقفوں نے سائنس کے خلاف سمجھ لیا ہے۔ اس لیے انھیں مذہب کے خلاف کرنا ضروری ہے میں نے اس خیال سے کہ جب مرقع عالم میں سائنس کے تراجم شائع ہو رہے ہیں تو اس کی خرابیوں کا انسداد بھی ضرور بالضرور ہونا چاہیے۔ یہ مضمون "علوم جدیدہ اور اسلام" آپ کے پرچے کے لیے بھیجا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ سلسلہ ناظرین کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا۔ اور وہ اسے غور و فکر کے ساتھ پڑھیں گے۔"[۵]

"علوم جدیدہ اور اسلام" کا تذکرہ مولانا نے لسان الصدق بابت ماہ اگست ستمبر ۱۹۰۴ء میں المعتزلہ کے دیباچے میں بھی کیا ہے۔ فرماتے ہیں :

"پچھلے دنوں میں نے "العلوم الجدیدۃ والاسلام" کے نام سے ایک کتاب لکھنی شروع کی تھی۔ اس کی اصل غرض یہ تھی کہ آج تک جدید علم کلام کا جس قدر سرمایہ جمع ہو گیا ہے، اس پر مفصل انتقاد کیا جائے اور دکھلایا جائے کہ موجودہ فلسفے کے مقابلے میں سرسید کا کلام کس قدر کامیاب ہو سکتا ہے؟ اور کہاں

---

۵ مکاتیب ابوالکلام آزاد مرتبہ ابوسلمان شاہجہانپوری، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی ۱۹۶۸ء ص ۷۱۔

کہاں اپنے اصول سے باہر ہوگیا ہے ؟ نیز یہ کہ درحقیقت یہ کلام اصولاً خود سرسید کی تحقیقات کا نتیجہ ہے یا کسی جماعت کے خیالات سے ماخوذ ہے "۔ ؎۱

حکیم محمد علی طبیب کے نام خط میں مولانا نے اس تحریر کے لیے "مضمون" کا لفظ اور المعتزلہ کے دیباچے میں اس کے لیے کتاب کا لفظ استعمال کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ شروع میں مولانا اس موضوع پر ایک مفصل مضمون یا مختصر رسالہ لکھنا چاہتے ہوں گے۔ بعد میں ایک جامع تصنیف کا منصوبہ بنایا ہوگا بہر حال اس تحریر کی نوعیت خواہ مضمون کی ہو خواہ کتاب کی یہ بات واضح ہے کہ یہ تحریر نہ تو جون ۱۹۰۳ء میں مکمل ہوئی تھی جب کہ اس کا ابتدائی حصہ حکیم محمد علی طبیب کو بھیجا گیا تھا، اور نہ ستمبر ۱۹۰۴ء میں جب کہ لسان الصدق میں مولانا نے المعتزلہ کا دیباچہ شائع کیا تھا۔ اس لیے کہ اس دیباچے کی آخری سطر میں لکھا ہے کہ "اصل کتاب کی اشاعت میں بوجوہ بہت تاخیر ہے"۔

المعتزلہ :

یہ دراصل "العلوم الجدیدۃ والاسلام" ہی کا ایک باب تھا۔ یہ باب چوں کہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھا گیا تھا۔ اس لیے مولانا نے اسے الگ کتابی صورت میں شائع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ علوم جدیدہ اور اسلام کے سلسلے میں فرماتے ہیں :

"اس میں ایک بڑی بحث معتزلہ کے متعلق تھی۔ کیوں کہ قدیم علم کلام کے درحقیقت یہی بانی اور مدوّن تھے، ان کے اصول اور حکیمانہ خیالات کا خاکہ کھینچ کر مسلمانوں کو یہ دکھلانا تھا کہ آج جس آواز سے وہ متوحش ہو رہے وہ اب سے بہت پہلے دنیائے اسلام میں بلند ہو چکی ہے۔ ہاں ! امتدادِ زمانہ سے مسلمانوں نے اس کو فراموش کر دیا تھا۔ مگر ضرورتوں نے پھر یاد دلانے کی کوشش کی۔

یہ باب اس قدر تفصیل کے ساتھ لکھا گیا کہ ایک مستقل رسالے کی حیثیت تک

؎۱ المعتزلہ از ایڈیٹر صہ ۲۵۔

پہنچ گیا۔ اس لیے مناسب سمجھتا ہوں کہ اس باب کو الگ شائع کر دوں۔" [1]

مولانا نے لسان الصدق میں "المعتزلہ" کا دیباچہ نقل کیا ہے۔ اور اس کے شروع میں جو نوٹ ہے اس سے فرقہ معتزلہ کے بارے میں مولانا کے خیالات بھی معلوم ہوتے ہیں اور کتاب کے مباحث اور ان کی ترتیب کا پتا بھی چلتا ہے۔ فرقہ معتزلہ کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں :

"اسلام میں جتنے نام آور فرقے ہوئے ہیں اور زمانے نے کچھ عرصے تک ان کا ساتھ دیا ہے ان سبھوں میں معتزلہ زیادہ کامیاب رہے۔ مختلف علوم کی انھوں نے بنا ڈالی، فلسفے کی اشاعت کی، سیکڑوں کتابیں تصنیف کیں، بڑے بڑے بادشاہوں نے ان کا مذہب قبول کیا اور ان کے آگے سر جھکایا۔ مخالفینِ اسلام کے مقابلے میں انھیں کی بدولت اسلام سر بلند رہا۔ اور انھیں کی کوششوں سے ہماری مذہبی تصنیفات میں تحقیقات کی باریابی ہوئی، لیکن افسوس ہے کہ اس معزز فرقے پر آج تک کوئی خاص کتاب نہیں لکھی گئی۔ تفسیر و عقاید کی ان کتابوں کے سوا جن میں ان کے متفرق اصول تردید کی غرض سے نقل کیے گئے ہیں۔ ہمارے پاس اور کوئی مستقل ذریعہ ایسا نہیں جس سے معتزلہ کے خیالات کا پتا لگا سکیں۔

اسی خیال نے مجھ کو آمادہ کیا کہ ایک جامع کتاب معتزلہ کے حالات پر ترتیب دی جائے۔ چناں چہ کچھ عرصے سے مَیں اس کی ترتیب میں مصروف ہوں۔"

مولانا نے اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ حصۂ اول میں مندرجہ ذیل مباحث تھے :

"اسلام کی ابتدائی حالت، اسلام کی سادگی، متمدن اقوام میں اسلام کی اشاعت، مذہبی اعتقادات میں باریک بینی کی ابتداء، اختلاف عقاید، اختلاف عقاید کے وجوہ، مختلف فرقوں کا پیدا ہونا، معتزلہ کا آغاز، اعتزال کے چار ادوار،

---

[1] المعتزلہ۔ لسان الصدق کلکتہ۔ اگست، ستمبر ۱۹۰۴ء۔

اعتزال کا تنزل "

حصّہ دوم میں یہ مضامین تھے :

" معتزلہ کے مختلف طبقات اور ان پر ایک اجمالی نظر۔ مشاہیر معتزلہ کے حالات "

حصّہ سوم میں معتزلہ کے عقاید پر مفصّل ریویو کرنا تھا " [1]

مولانا کے بیان کے مطابق اس وقت تک اس کا پہلا حصّہ لکھا جا چکا تھا اور جب اس کا دیباچہ شائع کیا تو دوسرا حصّہ زیر ترتیب تھا۔ تیسرا حصّہ اس وقت تک نہیں لکھا تھا شاید بعد میں مکمل کر لیا ہو۔ رانچی میں نظر بندی (۱۹۱۶ء) کے زمانے تک اس کا مسودہ موجود تھا پھر پولیس کی تلاشیوں میں ضائع ہو گیا۔

اب اس سلسلے میں المعتزلہ کا صرف وہ دیباچہ اور اس پر مختصر نوٹ جو لسان الصدق میں چھپ گیا تھا، باقی رہ گیا ہے یا ایک اور تحریر جو احسن الاخبار کے یکم جون ۱۹۰۲ء کے شمارے میں چھپی تھی، موجود ہے، اور وہ بھی ناقص الاوّل ۔ اس لیے کہ یہ مضمون کی دوسری قسط ہے اور اس سے پہلے کا کوئی شمارہ ابھی تک دستیاب نہیں ہوا ۔

تذکرۃ الشعراء :

۱۹۰۲ء میں مولانا نے فارسی شعرا کا ایک تذکرہ بھی لکھنا شروع کیا تھا۔ حکیم خاقانی شروانی، حافظ شیرازی وغیرہ پر مضامین اسی سلسلے کی کڑی تھے ۔ مخزن لاہور میں خاقانی شروانی پر مولانا کا جو مضمون شائع ہوا اس پر مولانا کے قلم سے ایک نوٹ بھی ہے، اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فارسی شعرا کے تذکروں پر نہ صرف ان کی نظر تھی بلکہ ان کے نقائص سے بھی واقف تھے ۔ اس سلسلے میں انھوں نے خزانۂ عامرہ (آزاد بلگرامی) اور مجمع الفصحا (رضا قلی ہدایت) کا ذکر کیا ہے، اور اس کے نقصِ عدم جامعیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس پس منظر میں مولانا فرماتے ہیں :

" ہم نے یہ حال دیکھ کر ایک تذکرۃ الشعرا کی بنا ڈالی ہے اور کوشش کی

---

[1] المعتزلہ ۔ لسان الصدق ۔ کلکتہ ۔ اگست، ستمبر ۱۹۰۲ء

ہے کہ اس میں جامعیت کا لطف پیدا کیا جائے۔"

لیکن اس سے بڑھ کر قابل غور تذکرہ نویسی کے بارے میں مولانا کا وہ نقطۂ نظر ہے جس کی طرف اس کے بعد کے جملے میں اشارہ کیا ہے۔ یعنی:

"ساتھ ہی پرانی طرز کو ترک کر کے سوانح عمری کے طور پر حالات لکھنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔" [۱]

حکیم خاقانی شروانی کا تذکرہ انھوں نے اسی اصول کے مطابق کیا ہے، اگر اس انداز سے یہ تذکرہ مکمل ہو جاتا تو بلاشبہ اردو ادب میں ایک نہایت قیمتی اضافہ ہوتا۔ مولانا کے اس نوٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ تذکرے کی پہلی جلد انھوں نے اس وقت مکمل بھی کر لی تھی، اور خاقانی شروانی کے ترجمے کی اشاعت بطور نمونے کے تھی، لیکن وائے افسوس کہ دوسری کتب و رسائل کی طرح اس تذکرے کے وجود کا بھی پتا نہیں چلا۔ صرف خاقانی شروانی کا ترجمہ جو مخزن میں چھپا تھا، یادگار رہ گیا۔

الہیئت:

یہ رسالہ کینوں فلاماریاں کے انگریزی رسالے "سولر سسٹم" کے فارسی ترجمے "ہیئت جدیدہ" کا ترجمہ تھا۔ فارسی ترجمہ مولوی عبدالرحیم تبریزی نے کیا تھا اور قسطنطنیہ سے شائع ہوا تھا، مولانا نے اس ترجمے ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ڈاکٹر فانڈیک کی اصول الہیئت جو بیروت سے چھپی تھی اور حدائق النجوم راجہ رتن سنگھ بہادر جنگ زخمی سے بھی مطالب کا اضافہ کیا تھا۔[۲] اس لیے ترجمے کے بجائے اسے مولانا کی تالیف سمجھنا چاہیے۔ خدنگ نظر، لکھنؤ بابت ماہ جون ۱۹۰۳ء میں مولانا آزاد نے اس کے متعلق ایک اعلان چھپوایا تھا۔ جس سے کتاب کی نوعیت کا اندازہ ہوتا ہے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کتاب اس وقت تک شائع نہیں ہوئی تھی۔ اعلان یہ ہے:

"الہیئت"

(جدید علم ہیئت کی ایک مکمل کتاب)

جدید علم ہیئت میں آج تک کوئی ایسی اردو تصنیف شائع نہیں ہوئی جس میں اس علم کے ہر

---

[۱] مخزن لاہور، بابت ماہ اگست ۱۹۰۲ء۔ [۲] آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی ص ۲۸۱۔

پہلو سے بحث کی گئی ہو۔ اس خیال سے میں نے ایک مفصل کتاب الہیئت نامی تصنیف کی ہے۔ (جو ممالک اسلامیہ کی ایک مستند کتاب سے ماخوذ ہے) اس کتاب کا پہلا حصہ "الارض" ہے، جس میں کرۂ زمین کی پوری حالت، اس کی قدرتی وضع، گردش کے وجوہ، کیفیت گردش، جذب وکشش، انقلابِ شب و روز، کسوف، خسوف، رفتارِ روزانہ و سالانہ وغیرہ۔ تمام بیانات کے علاوہ دیباچے میں علم ہیئت کی تاریخ جدید تحقیقات کی کیفیت، بعض موجدین علم ہیئت کی تصویریں، دوربینوں کی مفصل حالت درج کی گئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ جابجا نظائر و مثائل کی غرض سے تصاویر اور نقشے بھی لگائے گئے ہیں۔ یہ کتاب عنقریب شائع ہوگی، جو صاحب قیمت قبلِ اشاعت ارسال فرمائیں گے ان سے ۱۰؍ ورنہ ۱۲؍۔ محصول ڈاک علاوہ۔

المشتہر ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی

کلکتہ۔ تاراچند اسٹریٹ۔ نمبر مکان ۱۶" [۱]

"ذکر آزاد" میں مولانا نے اپنی ابتدائی تصانیف میں ان کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"اس میں دکھایا گیا ہے کہ جدید اسٹرانومی کے تمام اصول مسلمان حکما دریافت کر چکے تھے۔ اور قدیم یونان، مصر اور ہندوستان کے عقاید کے برخلاف انھوں نے جدید نظام شمسی کے اصول تسلیم کر لیے تھے۔" [۲]

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے مولانا کی زبانی یہ روایت بھی نقل کی ہے:

"اس کے مختلف ٹکڑے تدنگ نظر لکھنؤ میں بھیجتا رہا۔ لیکن بڑی دقت نقشوں اور ہاف ٹون تصویروں کے لیے پیش آئی۔ بلا ان کے کتاب کا فہم مشکل اور صور و اشکال کا معائنہ ممکن نہ تھا اور لیتھو میں وہ چھپ نہیں سکتے تھے۔ اس لیے ابھی نصف حصّے کے قریب ترجمہ ہوا تھا کہ طبیعت اچاٹ ہوگئی اور ناتمام رہ گیا۔" [۳]

اس اقتباس میں دو باتیں قابلِ غور ہیں:

---

[۱] ہماری زبان، علی گڑھ، یکم نومبر ۱۹۶۹ء۔ [۲] ذکر آزاد ص ۲۸۲۔

[۳] آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی ص ۲۸۱۔

پہلی بات خدنگ نظر میں اس کے مختلف ٹکڑوں کی اشاعت اور
دوسری بات اس کی عدم تکمیل!

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے ابھی یہ بات تشنۂ ثبوت ہے۔ خدنگ نظر لکھنؤ کے جن شماروں تک دست تحقیق پہنچا ہے، اور نگۂ جستجو کی رسائی ہوئی ہے، ان میں ہیئت سے متعلق مولانا کا کوئی مضمون شائع نہیں ہوا۔

دوسری بات کے سلسلے میں میری گزارش یہ ہے کہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی روایت ۱۹۲۲ء کی ہے۔ اگر اس وقت مولانا یہ فرماتے ہیں کہ "ابھی نصف کے قریب ترجمہ ہوا تھا کہ طبیعت اچاٹ ہو گئی، اور ناتمام رہ گیا" تو یقین رکھنا چاہیے کہ یہ کتاب بھی تشنۂ تکمیل رہی۔

میرا خیال ہے کہ اس پورے بیان میں مولانا ابوالکلام آزاد سے سہو ہوا۔ جہاں تک خدنگ نظر کا تعلق ہے، اس دور کے تمام پرچے ڈاکٹر بیدار، پروفیسر دسنوی، افضل حق قرشی یا خاکسار کی نظر سے گزر چکے ہیں۔ ہیئت کے بارے میں کوئی مضمون مولانا کا خدنگ نظر میں شائع ہی نہیں ہوا۔ البتہ ابوالنصر آہ کا ایک مضمون "عالم اجسام" کے عنوان سے چار قسطوں میں (اگست دسمبر ۱۹۰۲ء، اور فروری و اپریل ۱۹۰۳) خدنگ نظر میں شائع ہوا ہے۔

یہ مضمون اسی موضوع پر ہے۔ چوں کہ اس کے ماخذ اور تالیف کے تمام مراحل مولانا کے سامنے اور گھر کی بات تھی۔ ۱۸، ۲۰ برس کے بعد ذہن سے یہ بات نکل گئی کہ یہ مضمون ان کا نہیں، ان کے بھائی کا تھا۔

خواب کی حقیقت:

مولانا کے بیان کے مطابق یہ مضمون حیدرآباد دکن سے نکلنے والے کسی رسالے میں شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کئی مضمون علمی مباحث و مواضع پر نکلے تھے۔[1] مولانا نے اس مضمون کا جس موقع پر ذکر کیا ہے اس سے گمان ہوتا ہے کہ ۱۹۰۲ء یا ۱۹۰۳ء کے کسی پرچے میں چھپا ہوگا۔

---

[1] ایضاً۔

حقیقتِ معجزات :

اس رسالے کے تعارف میں مولانا فرماتے ہیں :

" بعض اشخاص سے حقیقت معجزات پر بحث چھڑ گئی، مجھے اس زمانے میں سرسید کے مباحث بطریق تقریرات مستحضر تھے، میں نے اس مسلک پر ایک تحریر لکھنی شروع کی جس میں نبوت، معجزات، معجزے کے دلیل نبوت نہ ہونے کے دلائل، پھر معجزات کی حقیقت، خرقِ عادت کا شرعاً امتناع لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ، فطرۃ اللہ اور سنۃ اللہ کا قوانین عادیہ طبیعہ میں استعمال وغیرہ وغیرہ مباحث تھے۔

بمبئی سے ایک رسالہ نکلنا شروع ہوا تھا۔ اس میں (یہ تحریر) عرصے تک نکلتی رہی۔ پھر حکیم محمد حسن شاہجہاں پور کے ایک طبیب تھے اور میری اس وقت کی تقریروں اور مشنریوں اور آریوں سے مباحثوں کے بڑے قدردان۔ انھوں نے رسالے کی شکل میں چھاپ دیا۔ [1]

میرا خیال ہے کہ مولانا کا یہ رسالہ ۱۹۰۴ء یا ۱۹۰۵ء کی تصنیف ہے، اس لیے کہ عیسائیوں اور آریہ سماجیوں سے مناظرہ بازی اور بحث و مباحثہ کی سرگرمی کا یہی زمانہ تھا۔

اسلامی توحید اور مذاہب عالم :

اسی زمانے میں جب کہ عیسائی مشنریوں اور آریہ سماجیوں سے بحث و مباحثہ و مناظرہ ہوتا رہتا تھا، اور اسلام اور اسلامی تعلیمات پر مخالفین کے اعتراضات سامنے آتے رہتے تھے۔ مولانا نے اسلامی توحید اور مذاہب عالم کے نام سے یہ کتاب لکھی۔ اس میں انھوں نے اسلام کے عقیدۂ توحید کے اثرات مذاہب عالم۔ اور برصغیر پاک و ہند اور بیرون برصغیر کی مختلف مذہبی اور اصلاحی تحریکوں پر دکھائے ہیں۔ مولانا نے ان الفاظ میں اس کتاب کا تعارف کرایا ہے :

---

[1] آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی صفحہ ۲۸۲۔

"اس میں دکھلایا ہے کہ اسلامی عقیدہ توحید کی جغرافیائی فتوحات سے اس کی روحانی فتوحات کا دائرہ بہت وسیع ہے، اور گو ابتدا میں پیروانِ مذاہب نے اس سے تغافل کیا لیکن بتدریج یورپ اور ایشیا کے مذاہب اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چناں چہ مسیحیت میں ریفارمیشن اور لوتھر کی تحریک کا ظہور ہوا۔ جس نے قدیم لاطینی ترجمۂ قرآن کا مطالعہ کیا تھا۔ ہندوستان میں بابا نانک اور کبیر کی تحریک اسلامی نفوذ ہی کا نتیجہ ہے۔ پھر یہی چیز راجہ رام موہن رائے اور دیانند سرسوتی کی شکل میں ظاہر ہوئی اور برہمو سماج اور آریہ سماج کی بنیاد پڑی۔ آخر میں مسلمانوں سے التجا کی ہے، کہ وہ اس کا خیر مقدم کریں[۱]۔"

فرہنگ جدید:

مولانا آزاد کی یہ تصنیف فارسی لغت کی تحقیق میں تھی[۲]، کتاب کی وجہ تصنیف کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں:

"ہندوستان میں فارسی لغت نویسی کی کچھ عجیب حالت رہی ہے۔ ادبیات کے کسی حصے میں اس قدر تمسخر انگیز اغلاط اور گمراہیاں نظر نہیں آئیں گی جس قدر ہندوستان کے فارسی لغتوں میں۔ مثلاً محاورات میں مرزا غالب کی قاطع برہان اور ہدایت قلی کی فرہنگ ناصری اس کا ایک اچھا سا نمونہ ہے۔ چوں کہ ان چیزوں سے اس وقت شوق ہو گیا تھا۔ خیال ہوا کہ ایسے تمام لغات اور محاورات اور اصطلاحات کو ایک فرہنگ میں جمع کیا جائے۔ چناں چہ ایک معقول حصہ ایسے الفاظ و محاورات کا جمع کر لیا۔" [۳]

چہار مقالہ:

مقالات کا یہ مجموعہ شاعری کے بعض مباحث کے بیان میں تھا[۴]۔ مباحث کے بارے

۱؎ ذکر آزاد ص ۲۸۲-۲۸۳ ۲؎ ایضاً ص ۲۸۳ ۳؎ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی ص ۲۲۶ ۴؎ ذکر آزاد ص ۲۸۳

بیں کوئی علم نہیں ہو سکا۔

فرہنگ جدید اور چہار مقالہ کی صحیح تاریخ تالیف کا پتا نہیں چل سکا۔ مولانا نے اپنی ۱۸ برس کی عمر تک کی تصانیف میں ان کا ذکر کیا ہے۔ اس سے یہ تو قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ تصانیف ۱۹۰۴ء سے پہلے کی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ ۱۹۰۲-۳ء کی تصانیف ہیں۔ اس لیے کہ مولانا کی شعر و شاعری کا عہد عروج اور تحریر و مطالعہ کے انتہائے شوق کے ایام بھی یہی تھے۔

چند مزید تحریریں:

مولانا کی بعض تحریروں کے بارے میں وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس زمانے کی ہیں۔ چوں کہ میرا گمان یہی ہے کہ وہ ابتدائی دَور کی ہیں۔ اس لیے سرسری طور پر ان کا ذکر کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔

"البیرونی اور جغرافیہ عالم"[۱] کے نام سے مولانا کا ایک مسودہ "آزاد بھون" نئی دہلی میں ہے جو رجسٹر سائز کے ۵۲ صفحوں پر مشتمل ہے۔[۲]

دیوان غالب اور دیوان شرف جہاں قزوینی پر مولانا نے تبصرہ کیا تھا۔[۳] یہ دونوں دیوان اور تبصرے ۱۹۱۶ء میں جب مولانا رانچی میں نظر بند تھے۔ پولیس کی تلاشیوں کی نذر ہو گئے۔

(۴)

نامناسب نہ ہوگا کہ زیر نظر مجموعے کے مضامین پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لی جائے، یہ مضامین مولانا ابوالکلام آزاد کے بہار آفریں قلم کے ابتدائی نمونے ہیں ان کی تحریر کی جو مستقل

---

[۱] یہ کتاب مسیح الحسن صاحب نے مرتب کر کے دہلی سے شائع کر دی ہے۔ اِس کی نقول لاہور اور کراچی سے بھی شائع ہو چکی ہیں۔ اسے خاکسار ابو سلمان نے کئی مضامین کے اضافوں، اصطلاحات کی تخریج، ابوالکلام و البیرونی کے ذہنی علمی اور ذوق و نظر کے موازنے اور البیرونی اور علم ہیئت و جغرافیہ سے مولانا آزاد کی دل چسپی کے تذکرہ و تحقیق پر مبنی مقدمے کے اضافے کے ساتھ "ادارہ تصنیف و تحقیق پاکستان۔ کراچی ۷۵۸۰۰" کی جانب سے شائع کرا دیا ہے۔ [۲] مولانا ابوالکلام آزاد، عابد رضا بیدار ص ۲۱۹ [۳] ایضاً ص ۲۲۰-۲۱۹۔

خصوصیات بعد میں مسلّم ہوئیں - ان کی بنیاد یہیں استوار ہوئی - عربی فارسی الفاظ و تراکیب کا استعمال، اشعار سے تحریر کو پُرزور اور رنگین بنانے اور آیاتِ قرآنی، احادیث نبوی اور آثارِ صحابہ سے مضامین میں استشہاد کا رجحان صاف نظر آتا ہے - وضاحت جو ان کی تحریر کی ایک خاص خوبی ہے - ان تحریروں میں بھی دیکھی جا سکتی ہے - مسائل میں حقیقت پسندانہ نقطہ نظر جو ان کی سیاست اور مذہب میں ایک خاص وصف تھا ان ابتدائی تحریروں میں بھی پایا جاتا ہے -

مولانا کی تحریروں کے ان ابتدائی نمونوں سے ان کے قلم کے ارتقا کی رفتار اور پختگی کے ایک ایک قدم کی نشان دہی کی جا سکتی ہے، اگرچہ اس دَور کے سارے مضامین نہیں ہیں لیکن جو ہیں ان میں ارتقا کا تدریجی عمل صاف دیکھا جا سکتا ہے، تا آں کہ ان کا قلم اسلوبِ نگارش کی وہ پختہ بنیاد تلاش کر لیتا ہے جو "سرمد شہید" میں ہے - یہاں سے الہلال کے معیار و اسلوب میں ایک قدم کا فاصلہ رہ جاتا ہے، اور یہ فاصلہ بھی درحقیقت زمانی ہے - سرمد اور الہلال کی تحریروں میں حسن و کمالِ اسلوب اور ندرتِ فکر کا کوئی فرق نہیں - سرمد کے اسلوب بیان کے لحاظ سے اسے دوسرے دَور یعنی الہلال کے مضامین کے ساتھ رکھا جا سکتا ہے - لیکن زمانی کے لحاظ سے اس کا مقام وہی ہے جو اسے دیا گیا - اس سے مقصد یہ بھی ہے کہ ایک نظر میں مولانا کی تحریر کے نقطہ آغاز سے ارتقائے کمال کا اندازہ ہو جائے، اور یہ معلوم ہو جائے کہ اس طفلِ مکتب کو واقعی ابوالکلام بننے میں کتنی مدت لگی، اور تحصیلِ کمال کی رفتار و نوعیت کیا تھی؟ -

یہ مضامین صرف اس لحاظ ہی سے قابلِ غور نہیں کہ یہ ابوالکلام آزاد کی تحریر کے ابتدائی نمونے اور ان کے اسلوبِ نگارش کے اوّلین نقوش ہیں - بلکہ علمی اور فکری طرف سے بھی ان کی اہمیت ہے -

مولانا آزاد کی ایک یہ خوبی بھی معلوم ہے کہ ان کا کمالِ اسلوب کسی ایک دائرۂ فکر و مضمون تک محدود نہ تھا - ادب اور اس کے مختلف اصناف، مذہب اور اس کے علوم و معارف کے مختلف گوشے تعلیم اور اس کے مسائل، سیاست، تاریخ، فلسفہ، کلام وغیرہ - جس علم و فن کی طرف بھی توجہ فرماتے ان کے قلم کے لیے معلومات، اصطلاحات، اسلوب وغیرہ کی کوئی رکاوٹ پیش نہ آتی - وہ اپنے قلم کی ندرت کاری سے شالامار سجاتے اور تاج محل

تعمیر کرتے چلے جاتے، ان کی یہ خوبی نکھر کر ۱۹۱۲ء کے بعد سامنے آئی۔ یا یوں کہ اسی دور کی تحریریں اصحابِ نقد و نظر کے سامنے نہ تھیں۔ اس لیے ابتدائی تحریروں کے بارے میں کچھ کہنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ لیکن اب یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ خوبی ان کے ابتدائی مضامین میں بھی موجود ہے۔ ان کے مضامین و مباحث میں تنوع اور ہر موضوع و مبحث کے لیے مناسب زبان و اندازِ بیان کے استعمال و اختیار پر یہ قدرت ان میں شروع سے موجود تھی۔

جو مضامین پیش نظر ہیں ان میں سوانحی اور ادبی و تنقیدی مضامین بھی ہیں۔ افسانہ بھی ہے۔ اور طنز و مزاح کا نمونہ بھی ہے، رو داد نویسی اور مرقع نگاری کا گوشہ بھی خالی نہیں۔ خالص دینی مسائل اور علم کلام میں بھی تحریر ہے، تعلیم و تاریخ پر مضامین بھی ہیں۔ فکری و نظری مباحث بھی ہیں اور بعض مضامین میں دادِ تحقیق بھی دی گئی ہے۔ اور لسانیات کا گوشہ بھی اُن کی توجہ فرمائی سے محروم نہیں رہا۔ پھر جو کچھ ہے زیادہ تر ۲۳، ۲۴ برس کی عمر تک کے نمونے ہیں اور معیار سے قطع نظر مضامین میں یہ تنوع اور جامعیت بہ ذات خود ایک ایسا شرف ہے جس سے بہت سے اکابر کا نہ صرف دامن عہدِ طفلی میں بلکہ پورے عرصۂ حیات میں خالی نظر آتا ہے۔ اور عام طور پر بھی اس کی مثالیں کم ہی ملیں گی۔

علمی لحاظ سے ان کے بعض خیالات اور آرا اتنی بلند ہیں کہ تقریباً ۸۵، ۹۰ سال گزرنے کے بعد بھی عام علمائے کرام کے ذہن و فکر کی سطح اس سے زیادہ بلند نہیں ہو سکی۔ رؤیت ہلال اور جدید ذرائع سے اس کے اعلان و تشہیر پر افطار و قیام صوم کے بارے میں انھوں نے ۱۹۰۲ء میں جو کچھ لکھا تھا علمائے کرام کا ایک طبقہ اسے اب بھی انشراحِ صدر کے ساتھ قبول کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتا۔ لیکن حقیقت وہی ہے جو اب سے اٹھاسی برس پہلے اس پندرہ سولہ سالہ بچے کے قلم سے نکلی تھی۔ بیشتر علما نے اسے تسلیم کر لیا ہے اور آج وقت کا تحقیقی مسلک بنا ہے۔

اعلان الحق

التماس مؤلف

اس رسالہ سے خاکسار آزاد کو کسی خاص شخص کا رد منظور نہیں ہے، بلکہ صرف اہلِ انصاف کی آگاہی مقصود ہے۔ جناب مولانا خیر الدین صاحب کے متعلق مخالفین نے بڑے بڑے اہتمام اپنی تحریروں میں زور و شور سے کیے ہیں، اور وہ سخت الفاظ مولانا کی شان میں لکھے ہیں جو علماء کی شان سے بعید ہیں، شر الدین کے نام سے تو مولانا مخالفین میں یاد کیے جاتے ہیں۔ اور یہ بمقابلہ ان سب و شتم آمیز الفاظ کے جو رسالوں میں اور اشتہاروں میں لکھے ہیں کچھ حقیقت نہیں رکھتا لیکن ناظرین خود معلوم کر لیں گے کہ میں نے تمام تحریر میں کوئی ایک لفظ بھی کسی خاص شخص کا نام لے کر یا مجملاً یا کنایتاً نہیں لکھا ہے۔ بلکہ ہر مقام میں تہذیب کو ملحوظ رکھا ہے، اور انشاء اللہ تعالیٰ کبھی میری یا مولانا کی زبان سے کوئی جملہ سب و شتم آمیز مخالفین کی شان میں نہیں نکلے گا۔ مولانا کی تہذیب تو قابل ملاحظہ ہے۔ کہ مخالفین کے رد میں اور درج الدر البہیہ کی تائید میں "حفظ المتین" لکھی تو معترض کا نام بھی نہیں لکھا کما لا یخفی علی الناظر۔ اس کے سوا ذاتیات سے بحث جیسی خود ہماری مخالف جماعت میں واقع ہوئی ہے۔ اس تحریر میں کہیں نہیں کی گئی۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس سلسلہ اعلان الحق میں اور اعتراضات اور اتہامات کا رد جو مولانا پر کیے ہیں شائع کیا جائے گا اور دکھایا جائے گا کہ ہمارے معزز مخالفین نے کن کن پیچیدہ طریقوں سے اعتراضات کیے ہیں۔

خاکسار آزاد مؤلف رسالہ ہذا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حَامِدًا وَّمُصَلِّیًا

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اِتِّبَاعَہٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اِجْتِنَابَہٗ

آج کل زمانے میں عجیب عجیب پُر آشوب فتنے اٹھا کرتے ہیں، طرح طرح کے شگوفے چھوٹتے ہیں۔ مسائل کاسدہ اور عقائد فاسدہ کی اس قدر شہرت عام ہے کہ ہر خواندہ ناخواندہ مجتہد وقت اور امام ہے، عجب دور ہے، طرفہ طور ہے۔ نئے نئے گل پھولے ہیں، لوگ اپنی پرانی روش بھولے ہیں، دین میں قسم قسم کے جھگڑے نکالتے ہیں، اسلام میں فساد کے رخنے ڈالتے ہیں۔ تعصب کی گھٹا چار طرف چھائی ہوئی ہے، جہالت کا طوفان جوش زن ہے، ایک لکھا نہ پڑھا فاضل مشہور ہے، دوسرا دوحرفی لیاقت کے نشہ میں چور ہے، ایک اچھے کو برا، برے کو اچھا بتاتا ہے۔ دوسرا نام آوری اور شہرت کے لیے مذہب پر چھری پھیرتا ہے۔ ایک نے تمام جہان کو مشرک و بدعتی قرار دیا ہے۔ دوسرے نے تمام کتب فقہیہ کو طاقِ نسیان پر رکھ کر نئی تحقیق اور نئے اجتہاد کا سبق یاد کیا ہے۔ ایک صاحب فقہاء پر تبرے کی لیتے ہیں، دوسرے صوفیۂ کرام کو برا بھلا سناتے ہیں، علماء نے ہٹ دھرمی اور شہرت اپنا اصول قرار دیا ہے، جہلاء نے ادھا دھند تقلید اور وہم تحقیق کو اپنا مذہب سمجھا ہے، اور بایں ہمہ لطف یہ کہ حضرات غیر مقلدین تو آئے دن علماء سے اختلاف کرتے ہی تھے، اب حضرات حنفیہ بھی اپنی نام آوری اور شہرت کے لیے ان مسائل سے جو عند الفقہاء مسلّم ہیں، اور جن کے ثبوت سے تمام فقہ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ اختلاف کرتے ہیں، اور جو کچھ جی میں آتا ہے لکھ کر شائع کر دیتے ہیں۔ گو پھر اہل حق سے معقول ہوتے ہیں، لیکن ان کے اختلاف کا اثر عوام پر بہت ہی برا پڑتا ہے۔ بہت سے بے علم جاہل اُن پر اعتماد کر کے دام تزویر میں پھنس جاتے ہیں، اور نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ بیٹھے بٹھائے گمراہ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ کلکتہ میں تقریبًا بارہ سال سے حضرت مجمع الفضائل

مولانا محمد خیر الدین صاحب مد فیوضہ دہلوی مصنف نجم المبین لرجم الشیاطین عشر مجلدات درج البہیہ وحفظ المتین وغیرہ کتب کثیرہ مطبوعہ وغیر مطبوعہ، تشریف فرما ہیں، آپ کے وجود سے ہزاروں مستفیض ہوتے سیکڑوں اپنی مرادوں میں کامیاب ہوئے، کلکتہ اُمڈ آیا، ہزاروں معتقد اور مرید ہو گئے۔ تمام شہر میں مولانا کا طوطی بول اٹھا۔ یہ کیفیت دیکھ کر حضرات علمائے کلکتہ بہ تحریک طبیعت ایک مخالفانہ پالیسی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے، اور مختلف ذرائع سے مولانا مدظلہٗ سے اختلاف کرنا شروع کر دیا۔ کسی وقت دیکھیے تو ایک لمبا چوڑا فتویٰ جس پہ کالی کالی مہریں جو مفتیوں کے سیاہی قلب پر دال ہیں۔ گلی کوچے میں گشت کر رہا ہے۔ ہیں! یہ کیا؟ اجی ذکرِ شہادت کرنے والے بدعتی مشرک ہیں۔ چونکہ مولانا نے ذکرِ شہادت بیان کیا ہے۔ لہٰذا یہ "مشرک" ہیں۔ غیر کچھ دنوں کے بعد ایک رسالہ چار ورقی شائع ہو رہا ہے۔ مسجدوں کے دروازوں پر بٹ رہا ہے۔ یہ کیا؟ یعنی یہ کہ مولانا کاذب ہیں۔ الغرض مختلف ذرائع سے مخالفت کی گئی۔

جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو پھر آٹھ نو سال سے (تقریباً) مولانا سے رویت ہلال ماہ رمضان اور عید کے بارے میں اختلاف کر بیٹھے، اور اپنی وہی بے پر کی باتیں معمول کے موافق چھاپ کر شائع کرنا شروع کر دیا۔ اب عوام بے چارے انھیں حق بجانب سمجھ کر انھیں کی تقلید کرنے لگے، اور عین عید کے دن کہ روزہ حرام ہے روزہ رکھنے لگے۔

یہ حال پُرملال دیکھ کر یہ تو ممکن نہ تھا کہ جان بوجھ کر کھڈے میں گرتے، ناچار علٰحدہ قلعے کے میدان میں نماز عیدین پڑھنی شروع کر دی۔ جہاں تک ممکن تھا پہلے پہلے سمجھایا بوجھایا۔ جب دیکھا کر پتھر پر جونک نہیں لگتی، سکوت اختیار کیا۔ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِہٖ وَمَنْ اَسَاءَ فَعَلَیْہَا وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ۔

مگر یہ عجیب بات ہے کہ ہمارے معزز مخالفین نے اپنے اشتہاروں میں اور رسالوں میں اپنی مختلف تقریروں میں چھاپنا، کہنا شروع کر دیا کہ "مولانا اپنے کشف اور نجوم اور رمل پر اعتبار کرتے ہیں، اور حکم روزہ اور عید اسی حساب سے دیتے ہیں۔ غالباً اس کہنے سے یہ غرض ملحوظ ہے کہ دُور دراز کے علماء جو اصل واقعے سے

بے خبر ہیں مولانا سے بدگمان ہو جائیں۔ اس لیے میرا ارادہ تھا کہ اس بارے میں ایک رسالہ شائع کیا جائے، جس میں اول تو اس دھوکے کو رفع کیا جائے۔ اور پھر جن امور میں اختلاف ہے اُن پر بحث کر کے دودھ کا دودھ پانی کا پانی باطل کو حق سے جُدا کیا جائے۔ مگر آج تک اس کی نوبت نہ آئی۔ چونکہ گزشتہ سال مسجد ناخدا میں بالائے مدرسہ قبل العصر ایک عابد زاہد مولوی صاحب مکرم معظم سے اس بارے میں گفتگو ہوئی ہے اور تنگیٔ وقت کی وجہ سے میں اپنے دلائل پیش نہیں کر سکا۔ بدیں وجہ یہ مختصر رسالہ جامع تحریر کر کے انصاف کا امیدوار ہوتا ہوں، مجھے امید قوی ہے کہ ہمارے معزز مخالفین علمائے کلکتہ چشم انصاف سے ملاحظہ فرما کر راہِ حق کے جویاں پویاں ہوں گے۔

وھہنا اشرح بالمقصود وما توفیقی اِلّا باللہ الودود۔

"مخالفین کا یہ اعتراض کہ مولانا اپنے کشف و نجوم کے اعتبار پر حکم عید و صیام فرماتے ہیں اس کا رد۔ اور ثبوت میں ایک چشم دید حال کا واقعہ"

ناظرین! مولانا پر منجملہ اور اتہامات کے ایک اتہام یہ کیا جاتا ہے کہ یہ اپنے کشف اور نجوم کے اعتبار پر حکم عید و صیام فرمایا کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات خلاف شرع ہے۔ کیوں کہ شرع کی باتوں میں نجوم اور کشف کو کیا دخل۔ پس یہ بات محض خلاف ہے۔ اور اکثر واقعات ان کے خلاف صریح طور سے شہادت پیش کرتے ہیں۔

(۱) جب سے مولانا علیحدہ روزہ اور عید رکھنے اور کرنے لگے، آج تک کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ بلا کسی دلیل کے مولانا نے حکم صادر فرمایا ہو۔ جب فرمایا تو متواتر خطوط اور تار اور گواہی وغیرہ معتبر دلائل پر اور اس سے تمام اہل کلکتہ واقف ہیں چنانچہ مولانا نے اکثر خطوط بر سر منبر دکھائے ہیں، اور گواہ شاہد پیش کیے ہیں جس سے کوئی اہل انصاف انکار نہیں کر سکتا۔

(۲) ایک سال کا واقعہ ہم درج کرتے ہیں۔ جس سے یہ بات واضح طور سے متحقق ہو جائے گی، وہ یہ ہے: کہ ایک تار جناب حاجی عبدالرزاق صاحب کے پاس جو کلکتہ کے ایک معزز تاجر ہیں، آیا۔ جس میں صاف طور سے تو یہ نہیں لکھا تھا کہ یہاں چاند ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دلیل شرعی ہوتی۔ ہاں یہ لکھا تھا کہ یہاں چاند ہوا۔ یہاں عید ہوگی۔ غرضیکہ مبہم طور سے کہ دلیل معتبر نہیں ہو سکتی۔ اس کے سوا ایک

میر صاحب بھی گواہ تھے۔ چونکہ بے حکم مولانا کے مسجد میں عید نہیں ہو سکتی تھی، تار اور گواہ میر صاحب مولانا کے پاس آئے۔ مولانا نے فرمایا کہ گواہ کیا کہتا ہے۔ پہلے اُس سے استماع کرنا چاہیے۔ میر صاحب نے ارشاد کیا کہ میں آج شام کو مرشد آباد سے آرہا تھا ہوگلی کے قبل ہی ریل میں ایک بوڑھی غالباً گوالن بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ لگی کہنے کہ دیکھنا میر صاحب! یہ چاند نظر آرہا ہے۔ جناب میں نے جو نظر اُٹھا کے دیکھا تو فی الواقع ناک کی سیدھ چاند دمکتا رہا تھا۔ مولانا نے دریافت فرمایا کہ حضرت ابر بھی تھا۔ کہنے لگے کہ نہیں صاحب مطلع صاف تھا۔ مولانا نے تعجباً فرمایا کہ ہیں میر صاحب ہوگلی جو یہاں سے بہت ہی قریب ہے وہاں تو بالکل مطلع صاف ہو۔ اور یہاں کلکتہ میں عصر سے ابر ہو! خیر جب تار کی نوبت آئی، تو اس میں مبہم طور سے لکھا تھا، اس لیے اس پر شرعی عمل درآمد ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ الغرض مولانا نے حکم عید صادر نہیں فرمایا۔ اتفاقاً جناب عبدالقدوس عطار صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ وہ میر صاحب سے فرمانے لگے کہ میر صاحب اس قدر کذب گوئی! ابھی تو آپ پانچ بجے میری دوکان پر لکھنؤ کے خربوزے خرید رہے تھے، اور پانچ سے چھ تک آپ مرشد آباد بھی چلے گئے اور وہاں سے ازراہ ہوگلی تشریف فرما بھی ہو گئے۔

اُسْکُتْ اُسْکُتْ یَا اَیُّهَا الْکَذَّاب، اُسْکُتْ اُسْکُتْ یَا اَیُّهَا الْکَذَّاب

میر صاحب تو وہاں سے چلتے ہوئے۔ لیکن دوسرے دن جب معتبر گواہیاں آئیں مولانا نے حکم افطار عصر کے قریب فرمایا۔ اس واقعے سے تمام حضرات واقف ہیں۔ اب جائے غور ہے کہ اگر مولانا کو اپنے کشف اور نجوم پر حکم صادر فرمانا ہوتا، تو نجوم کے حساب سے تو ضرور اس روز عید ہوئی تھی۔ تار اور گواہ میر صاحب کا بہانہ موجود تھا، فوراً حکم صادر فرما دیتے۔ مگر چونکہ ان کو محض شرعی اعتبار درکار تھا، اور عمل درآمد بھی عین ظاہری شرع پر تھا۔ ہرگز حکم عید نہیں فرمایا: فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَلْبَابِ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ○ ان دلائل سے یہ مخالفین کا اعتراض کہ نجوم پر حکم فرماتے ہیں هَبَاءً مَّنْثُوْرًا ہو گیا۔ اب ہم اصل بحث پر آتے ہیں، کہ جناب مولانا اور حضرات مخالفین علما۔ کلکتہ میں جہاں تک غور کیا گیا صرف اِن اُمور میں اختلاف ہے:

(۱) مولانا فرماتے ہیں کہ اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں، مشرق سے گواہی یا خبر معتبرہ چاند کی اگر مغرب میں پہنچے، تو مغرب والے اس پر اعتبار کریں اور روزہ رکھیں، عید کریں۔ لیکن معززمخالفین فرماتے ہیں کہ نہیں جب تک ہم اپنی آنکھوں سے کلکتہ میں چاند نہیں دیکھیں گے، تب تک نہ روزہ رکھیں گے، اور نہ عید۔ بس اعتبار گواہی وخبر متواترہ نیست۔

(۲) مخالفین یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ حدیث شریف میں آیا ہے۔ صوموا لرویته وافطروا لرویته۔

(۳) بعض مخالف مجبوراً اختلاف مطالع کے نامعتبر ہونے کے اگر قائل بھی ہو جاتے ہیں تو پھر یہ مشکل پیش کرتے ہیں کہ عید کی خبر شب بھر میں کسی گواہ سے پہنچ نہیں سکتی۔ سوائے تار کے اور تار کا اعتبار نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ کفار کے ذریعے سے آتا ہے۔

حضرات ناظرین! یہ تین بحثیں، خصوصاً تار کی بحث، ایک معرکۃ الآراء بحث ہے، اور اس لائق ہے کہ اس کو نہایت طوالت کے ساتھ مع مالہ وماعلیہ تفصیلاً لکھا جائے، لیکن چونکہ مجھے سردست صرف اہل انصاف کی آگاہی کے لیے مختصراً تحریر کرنا ہے، اس لیے نہایت مختصر طور سے پیش کرتا ہوں۔ والعاقل تکفیہ الاشارۃ۔

پہلی بحث اختلاف مطالع کے معتبر ہونے نہ ہونے کی:

پہلا اختلاف مولانا وعلماء کلکتہ کا یہ ہے کہ "اختلاف مطالع کے سبب سے اور ملکوں کے رخ کا اعتبار نہیں ہے" اگرچہ یہ بحث طول طلب ہے لیکن جہاں تک ہم سے ممکن ہوگا ہم اختصار کے ساتھ تحریر کریں گے۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ علماء کلکتہ کا یہ انوکھا مسئلہ جس سے اور علماء کے کان نا آشنا ہوں گے، خدا جانے کس کتاب میں لکھا ہے، آج ہندوستان میں متون وحواشی، شروح۔ فتاوی ہر قسم کی کتابوں کا کافی سرمایہ مطبوعہ غیر مطبوعہ موجود ہے۔ کوئی شمس العلماء صاحب ہم کو یہ انوکھا مسئلہ کہ بسبب اختلاف مطالع اور ملکوں کا اعتبار نہیں" کسی کتاب معتبر میں دکھلادیں۔ تمام کتب فقہ میں صاف طور سے مثالیں دے کر لکھا ہے" کہ

اختلاف مطالع کا رمضان المبارک میں اعتبار نہیں ہے۔ ہرگز نہیں ہے۔ اگر مغرب والوں نے یک شنبہ کے دن چاند دیکھا۔ اور مشرق والوں نے دوشنبہ کو۔ تو جب شرقیوں کو غربیوں کے پاس سے یکشنبہ کی خبر ہو جائے، اور وہ خبر معتبر شرعی ہو، تو انہیں یعنی شرقیوں کو یک شنبہ ہی سے روزہ رکھنا چاہیے، اور اسی کے حساب سے افطار کرنا چاہیے۔

الغرض اختلاف مطالع کا کچھ اعتبار نہیں ہے جس مقام پر گو بعد المشرقین ہو، پہلا روزہ ہو اس کا اعتبار ہے۔ اور ایسا ہی تمام معتبر کتب فقہ میں بالتفصیل لکھا ہے:

اب ہم دس معتبر فقہ کی کتابوں سے عبارتیں نقل کیے دیتے ہیں جو فی زمانہ معروف اور متداول ہیں، اور ہر جگہ میسر ہو سکتی ہیں۔ اور جن میں صاف طور سے یہ مسئلہ تحریر ہے، بچشم انصاف سے ملاحظہ فرمائیں:

(۱) "فیلزم اهل المشرق برویة اهل المغرب) اذا ثبت عندهم رویة اولئك بطریق موجب" (در المختار)

(۲) "یلزم اهل المشرق برویة اهل المغرب فی ظاهر المذهب وعلیه الفتوی کذا فی الخلاصة" (نهر الفائق)

(۳) "اذا ثبت الهلال فی بلدة لزم سائر الناس فی ظاهر الروایة وعلیه الفتوی وهو قول اکثر المشائخ" (مراقی الفلاح)

(۴) "بلدة اذا رأوا الهلال هل یلزم فی حق کل بلدة؟ (الی قوله) وفی الخانیة لا عبرة باختلاف المطالع فی ظاهر الروایة وفی الظهیریة عن ابن عباس انه کان یعتبر فی حق کل بلدة رویة اهلها۔ انتهی" (تاتارخانیة)

(۵) "لا عبرة لاختلاف المطالع وعلیه کثیرًا من متون المعتبرة کصاحب الکنز۔ انتهی" (در جواهر نفیه شرح جواهر منیحة)

(۶) والصحیح من مذهب اصحابنا انه یلزم اذا استفاض الخبر فی بلدة الاخری وان لا عبرة لاتحاد المطالع واختلافها او

هذا ظاهر الرواية - انتهى ۔" (جامع الرموز)

(۷) قوله احوط - اىّ لعموم الخطاب فى قوله صلعم صوموا لرؤية وافطروا لرؤية بمطلق الرؤية وهى حاصلة برؤية فيثبت عموم الحكم احتياطاً ۔" (طحطاوى)

(۸) فى الشامى بعد ذكر مذهب الشافعى " وظاهر الرواية الثانى وهو المعتمد عندنا اى لا عبرة باختلاف المطالع" (شامى)

(۹) لا عبرة باختلاف المطالع ومعناه اذا رأى الهلال اهل بلدة ولم رأى اهل بلدة اخرى يجب ان يصوموا برؤية الخ ۔" (تبيين الحقائق)

(۱۰) لا عبرة الاختلاف المطالع فى ظاهر الرواية وعليه فتوى (الى قوله) لو رأى هلال رمضان اهل مغرب يجب الصوم اهل مشرق ۔" (عالم گیری)

(۱۱) صاحب درالمختار نے تو صاف فیصلہ ہی کر دیا ہے - اور اس بارے میں اس نے ایک رسالہ لکھا ہے کہ اختلاف المطالع کا کچھ اعتبار نہیں ہے - ہم علامہ ابن عابدین صاحب درالمختار کی پوری عبارت چوں کہ طویل ہے نقل نہیں کر سکتے ، درالمختار میں دیکھ لینا چاہیے -
(مطبوعہ مصر صفحہ ۱۵۴)

"قوله على ظاهر المذهب اعلم ان نفس اختلاف المطالع لا نزاع فيه بمعنى انه قد يلون بين البلدتين بعد الخ ۔"

اب ہم نے گیارہ کتب معتبرہ فقہ سے جیسے درالمختار ، مراقی الفلاح ، جامع الرموز ، طحطاوی ، عالم گیری وغیرہ جن سے فی زمانا بڑھ کر اور کوئی معتبر کتاب موجود نہیں ہے ، عبارات نقل کر دی ہیں جن میں صاف طور سے لکھا ہے :

لا عبرة الاختلاف المطالع فيلزم اهل المشرق برؤية اهل المغرب --

جن سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا ، اور اس کے سوا متون شروح میں لکھا ہے کہ :

عليه فتوى فى ظاهر الرواية - عليه كثيراً من متون المعتبرة -

اب اگر اس پر بھی کوئی نہ مانے اور وہی مرغے کی ایک ٹانگ کہے جائے تو وہ تعصب اور تقلید ہوائے نفس نہیں تو کیا ہے ؟

الغرض ان تمام عبارات بالا سے یہ بات متفق ہوگئی کہ اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں ہے ۔ جہاں پہلے رویت ہوا، اُسی کا اعتبار ہے ۔ اور اسی پر تمام شہروں کو اعتبار اور عمل کرنا چاہیے، اگرچہ بعد المشرقین ہو ۔

دوسری بحث :

حدیث " صوموا لرؤیۃ وافطروا لرؤیۃ " پر اور اس بات کا ثبوت کہ یہاں رویت سے مراد علم الیقین ہے ، اور اس پر قرآنی دلائل ۔

اب ہم کو اُس حدیث اور ہم معنی اور حدیثوں پر بحث کرنی باقی ہے ، کیوں کہ جب علماء کلکتہ اس صورت میں عاجز ہو جاتے ہیں ، تو پھر مسلم کی یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ :

" صوموا لرؤیۃ وافطروا لرؤیۃ " " اے لوگو! روزہ رکھو چاند دیکھ کر، اور اسی طرح افطار کرو یعنی عید کرو چاند دیکھ کر ۔

پس اس سے ہمارے مخالفین ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ یہاں رویت کا لفظ آیا ہے جس کے معنے ہیں دیکھنے کے ، تو پھر جب تک ہم اپنی دونوں آنکھوں سے ناک کی سیدھ چاند نہ دیکھیں روزہ اور افطار نہ کریں گے ، پس اعتبار گواہی و خبر متواترہ نیست ۔ لیکن افسوس ہے ، اور سخت افسوس ہے کہ یہ حضرات علماء کلکتہ کہ جن کی عمر کا ایک بہت بڑا حصہ پڑھنے اور پڑھانے میں صرف ہو چکا ہے ، ایک حدیث پر غور نہیں فرماتے اور ذرا فقہ کی کتابوں کو کھول کر نہیں دیکھتے جن میں صاف طور سے لکھا ہے کہ " یہاں رویت سے مراد علم الیقین ہے " ۔

خیر تو اس حدیث کی علماء نے دو طور سے تفسیر کی ہے ۔ اول یہ کہ یہاں رویت کے معنی علم الیقین کے ہیں ۔ جب یقینی معلوم ہو جائے کہ مقام فلاں میں " رویت " ہوئی ہے ، تو گویا اس کو رویت ہو گئی ، اور اب اس کو اس پر عمل کرنا چاہیے ۔ اور یہ عرب کا قاعدہ ہے کہ جس مقام پر " سامع " کو علم الیقین حاصل ہو جائے تو اس مقام پر رویت کا لفظ " قائل " استعمال کرتا ہے ، اور ہم کلام عرب سے اس کی دلیل پیش کر سکتے ہیں ۔ مگر اس وقت تین ایسی دلیلیں تحریر کرتے ہیں کہ اس سے انکار

ہو ہی نہیں سکتا یعنی - قرآن شریف میں بھی تین موقعوں پر اللہ جل شانہٗ نے اسی طرح علم الیقین کے موقع پر "رویت" کا لفظ فرمایا ہے - اگر وہاں رویت کے "ذعلم الیقین کے نہ لیے جائیں تو معنی ہی خبط ہو جائیں - اور کسی مفسر نے یہ معنی یعنی دیکھنے کے نہیں لیے ہیں، اور کیسے لیں جب کہ معنی ہی خبط ہو جائیں. اب وہ آیتیں ملاحظہ فرمائیے :

(۱) سورہ والصّٰفّٰت کے تیسرے رکوع [آیت نمبر ۱۰۲] میں جہاں حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہے کہ اے پروردگار ھَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ یعنی مجھ کو ایک فرزند صالح عطا فرما - اللہ تعالیٰ جل جلالہٗ نے انھیں حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام عطا فرمایا - اور جب وہ جوان ہوئے ایک دن حضرت ابراہیم حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام سے فرماتے ہیں کہ :

قَالَ یٰبُنَیَّ اِنِّیْٓ اَرٰی فِی	ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ اے میرے بیٹے میں نے
الْمَنَامِ اَنِّیْٓ اَذْبَحُکَ	خواب میں دیکھا ہے کہ میں جیسے تم کو ذبح کر رہا ہوں - پس تم
فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی -	بھی ذرا سوچو کہ تمہاری رائے میں کیا آتا ہے -

اب جائے غور ہے، کہ اس آیت میں "فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی" آیا ہے - اب اگر یہاں بقول علماءِ کلکتہ رویت کے معنی "دیکھنے" کے لیے جائیں تو یہ معنی خبط ہوں گے کہ "پس دیکھ تو کہ کیا دیکھتا ہے تو" اور یہ کسی مفسر نے نہیں لیے - اور لے تو کیوں کہ جب کہ معنی ہی سرے سے "خبط" ہو جاتا ہے - کیوں کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام تو حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام سے استصواب رائے فرماتے تھے - پھر ان کا کہنا کہ پس دیکھ تو کہ کیا دیکھتا ہے تو "یعنی چہ ؟" پس اس آیت میں بھی وہی "رویت" کے "مجازی" معنی لیے گئے ہیں - فافہم -

(۱) سورہ "فجر" [کی آیت نمبر ۶ تا ۸] میں ہے :

اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ	اے میرے حبیب! کیا تو نے نہیں دیکھا کہ
بِعَادٍ ۝ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝	تیرے پروردگار نے قوم "عاد" کے ساتھ
الَّتِیْ لَمْ یُخْلَقْ مِثْلُھَا فِی	کیا کیا (وہ) ارم صاحبِ ستون کے ایسے تھے
الْبِلَادِ ۝	کہ جن کے مانند کسی شہر میں ہم نے پیدا نہیں کیے -

(۲) آیت میں بھی اللہ تعالیٰ نے علم الیقین کے موقعہ میں وہی "رای" کا لفظ ارشاد فرمایا ہے۔ کما مَرّ

(۳) سورۂ "فیل" میں ارشاد ہوتا ہے:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ	(اے میرے حبیب گناہ گاروں کے طبیب! کیا تم کو
بِاَصْحَابِ الْفِيْلِ ۝ اَلَمْ	یہ بات معلوم نہیں ہے کہ تمہارے پروردگار نے
يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝	ہاتھی والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا، کیا اُس
وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا	نے اُن کے تمام فریب نہیں توڑے؟ (نہیں
اَبَابِيْلَ ۝ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ	بیشک توڑے) اور اُن پر غول در غول پرندے
مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝ فَجَعَلَهُمْ	بھیجے جو اُن پر کنکریاں (ہلاک کرنے والی) پھینکتے تھے
كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝	اور ان کو کھائے ہوئے بھس کی مانند کر دیا۔

ناظرین: ملاحظہ فرمائیں کہ اس سورہ میں بھی اللہ جل شانہ نے "تَرَ" ارشاد کیا ہے جس کے معنی یہ ہونا چاہیے کہ "کیا نہیں دیکھا تو نے" واقعہ اصحاب فیل کا۔ حالانکہ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو اس واقعے کو دیکھ نہیں رہے تھے، اور نہ دیکھ سکتے تھے۔ کیونکہ یہ واقعہ آپ کی ولادت سے کئی سال قبل مکہ معظمہ میں ہو چکا تھا۔ مگر جناب باری نے "تر" کا لفظ ارشاد فرمایا۔ اب ذرا ہمارے مخاطبین ارشاد فرمائیں کہ یہاں "یہ دیکھنا" کیوں ارشاد ہوا؟ بس یہاں وہی مجازی معنی "علم الیقین" کے ہیں کہ "کیا نہیں معلوم تم کو میرے حبیب" کیونکہ "قائل جانتا ہے کہ مجھ پر سامع" کو یقین کامل ہے۔ اس لیے وہ وہاں رویت جس کے معنی مجازی علم الیقین کے ہیں استعمال کرتا ہے کما لا یخفی علی المتامل، فاعتبروا یا اولی الابصار۔

اب ان تینوں آیتوں سے یہ بات متحقق ہو گئی کہ بعض مقام میں "رویت" کا حصول "علم الیقین" پر بھی اطلاق ہوتا ہے۔ پس اس حدیث زیر بحث "صوموا لرؤیۃ و افطروا لرؤیۃ" میں رویت کے یہی معنی محققین نے لیے ہیں، اور اس بنا پر صاف لکھ دیا کہ "لا عبرۃ لاختلاف المطالع وعلیہ الفتوی۔"

اور یہ کچھ ہم نے لکھا ہے کچھ ہماری ذاتی رائے نہیں ہے بلکہ اور محققین کی بھی یہی رائے ہے، اور اس کے یہی معنی لیے ہیں۔ اگرچہ ہم کو کسی دلیل کی ضرورت ہی نہیں

ہے جب کہ نفس بیان صحیح ہے۔ اور قرآن شریف سے بھی ثابت ہوتا ہے، لیکن مزید اطمینان کے لیے ہم لکھے دیتے ہیں۔

کہ کتاب "عیون البصائر" جو ایک معتبر اور مشہور و معروف کتاب ہے، اس میں لکھا ہے کہ حدیث "صوموا لرویۃ وافطروا لرویۃ" میں رویت سے مراد "حصول علم بطریق غالب" ہے۔ پھر مثال دی ہے کہ ایک شخص نے اپنی منکوحہ عورت کو بایں الفاظ طلاق دی کہ "ان رایت الھلال فانت طالق" یعنی اگر تو نے چاند دیکھا تو تجھ طلاق۔ اب جب چاند رات آئی، تو وہ عورت مکان میں چھپ رہی کہ میں چاند نہ دیکھنے پاؤں تاکہ "طلاق" نہ پڑ جائے کیوں کہ طالق نے "رایت الھلال" کی قید لگائی ہے، لیکن کسی شخص نے جا کر کہہ دیا کہ ہیں! یہ آپ کہاں بیٹھی ہیں! بی بی صاحب چاند ہوگیا۔ فقہ کہتی ہے کہ طلاق پڑ گئی" کیوں کہ "طالق نے رایت الھلال" کی قید لگائی ہے۔ اور جب کہ عورت کو علم الیقین ہوگیا۔ تو اس کے لیے "رویت" ہوگئی۔ انتہیٰ ملخصًا۔

(۲) دوسرا جواب علمائے محققین نے یہ دیا ہے کہ اس حدیث زیر بحث "صوموا لرویتہ الخ" میں بالعموم خطاب ہے۔ رویت شرط ہے چاہے مشرق میں ہو یا مغرب میں ہو، جہاں پہلے ہو اس پر بشرط خبر معتبر شرعی تمام عمل کریں، ہاں اگر رسولِ اکرم روحی فداہ یوں ارشاد فرماتے کہ "صوموا لرویۃ بلدۃ وافطروا لرویۃ بلدۃ۔ یعنی روزہ رکھو تم اپنے شہر کا چاند دیکھ کر اور اسی طرح افطار کرو تم اپنے شہر کا چاند دیکھ کر، تو بلاشبہ ہر ایک شہر کی رویت کی اپنے لیے تخصیص ہو جاتی جب عام طور سے ارشاد فرمایا ہے۔ تو تخصیص کیوں کر ہو سکتی ہے؟

الغرض حدیث زیر بحث میں رویت سے دیکھنے کے معنی ہر گز نہیں ہیں اس کے معنی علم الیقین کے ہیں۔ یہ بات قرآن مجید سے ثابت ہے۔ اور اہل تحقیق کی بھی یہی رائے ہے۔ بس اس حدیث سے ہمارے مخالفین اپنے مسئلے پر استدلال ہرگز نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ یہ ہمارے لیے دلیل قوی ہے، اور ان کے مدعا کے مخالف ہے۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ۔

تیسری بحث :

اس بارے میں کہ تار کی خبر معتبر ہے یا نہیں - اور اس بات کا ثبوت کہ کافر سے معاملات کے ضمن جو بات متعلق دینیات معلوم ہو وہ عند الفقہا معتبر ہے۔

اب تیسری بحث "تار" کے متعلق ہے، اور یہ ایک بڑی معرکۃ الآرا بحث ہے ہم کو چونکہ طول منظور نہیں ہے - اس لیے ہم نہایت اختصار کے ساتھ لکھیں گے، اس بارے میں ہم نے ایک خاص تحریر لکھی ہے جو عنقریب شائع ہوگی - فمن شاء التحقیق فلیرجع الیہ -

بات یہ ہے کہ آج کل تار نے وہ ترقی کی ہے کہ شاذو نادر ہی کوئی شہر اور قصبہ اس "مفید محکمہ" سے محروم رہا ہو - ایک نہیں سیکڑوں "دینی" اور "دنیوی" کام اس پر موقوف ہیں - یہ ایک ضروری البحث مسئلہ ہے۔ پس اگر اس پر اعتبار نہ کیا جائے (اور کیوں کر نہ کیا جائے) تو تمام کاروبار الٹ پلٹ ہو جائیں۔ اس لیے مختصر طور سے اس کے "معتبر" ہونے کا ثبوت پیش کرتا ہوں، آج کل بہتیرے ایسے مسئلے ہیں جو زمانے کی ترقی سے پیدا ہو گئے ہیں، اور سلف میں مطلقاً نہ تھے اور اس لیے اس کے معتبر ہونے کے بیان سے کتب سلف بالکل خالی ہیں، تو پھر اگر ان پر بحث کی جائے تو کیوں کر؟ پس اس کی یہ صورت ہے کہ ان کو اور مسئلوں پر قیاس کر کے اصول فقہ سے چھان بین کر کے نکالا جائے۔ پس اسی طرح یہ تار کا مسئلہ ہے کہ جسے ایجاد ہوئے تھوڑا عرصہ ہوا ہے، اس لیے کتب فقہ میں اس کی بحث بالکل نہیں ہے - تو اب اس کو کسی اور مسئلے پر قیاس کرنا چاہیے، وغیر ازیں چارہ نیست -

اب اس کو ہم "عقل" اور "شرع" دونوں سے دیکھتے ہیں اور جانچتے ہیں "عقل" تو اس بات کو مانتی ہی نہیں کہ تار میں جس پر آج تمام ہندوستان بلکہ دنیا کا دار و مدار ہے "غلطی" کا احتمال ہو یا جعل کا خوف ہو - کیوں کہ اگر غلطی اور جعل کا احتمال ہو تو اتنا کاروبار اس کے اشارے پر کیوں کر چلے، اگر تار میں لکھا ہو کہ فلاں مر گیا تو آپ اعتبار کر لیتے ہیں، کہ بے شک مر گیا، اگر اس میں لکھا ہو کہ فلاں لڑکا پیدا ہوا تو آپ مان لیتے ہیں - اگر لکھا ہو کہ فلاں کی شادی ہوئی، چناں ہوا، چنیں ہوا تو اس پر آپ

عمل درآمد فرماتے ہیں۔ وقس علی ھذا۔ پس جب ان تمام باتوں میں اعتبار کر لیا جاتا ہے۔ اور سرمو فرق نہیں ہوتا۔ اور پھر اس کی اور خبریں کیوں ناقابل اعتبار ہوں؟ اور کس طور سے اُس پر غلطی کا احتمال ہو؟ جب کہ آج تک کبھی غلطی واقع نہیں ہوئی۔ تو عقل کے اقتضا سے تو انکار ہو ہی نہیں سکتا۔

باقی رہی "شرع" تو اُس پر صرف ..... یہی اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ خبر کفار کے ذریعے سے آتی ہے۔ اور کفار کا ایسی خبروں میں اعتبار نہیں۔ تو اس کا جواب باصواب یہ ہے کہ :

بے شک عبادات میں کفار کا قول معتبر نہیں لیکن معاملات میں معتبر ہے۔ اور یہ تمام کتب فقہ میں مسطور ہے۔ پس اگر معاملات کے ضمن میں کوئی بات متعلق عبادات واقع ہو، تو وہ بلا شک معتبر ہے۔ یہ مسئلہ کسی قدر مثال طلب ہے، اس لیے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں کہ اگر کسی مسلمان کا ایک نوکر کافر ہے، اور چوں کہ معاملات میں کافر کا قول معتبر ہے، اس مسلمان آقا نے اس نوکر کافر کو کچھ پیسے دیے کہ بازار سے گوشت لادے۔ جب وہ گوشت خرید کر واپس آیا تو اس نے اپنے مسلمان آقا سے کہا کہ "اشتریت من مسلم" یعنی یہ گوشت میں نے ایک مسلمان سے خریدا ہے۔ اب یہ قول اس کا معاملات سے تعلق رکھتا ہے، اس لیے مسلمان نے معتبر سمجھا۔ لیکن اس کے ضمن میں یہ بات ثابت ہوگئی کہ اس نے جب مسلمان سے یہ گوشت خریدا ہے تو لامحالہ اس نے بالتسمیہ ذبح کیا ہوگا۔ پس یہ بات جو ضمناً معلوم ہوئی ہے۔ عبادات سے تعلق رکھتی ہے، مگر بوجہ ضمناً واقع ہونے کے معاملات میں داخل کر کے اس کو معتبر کیا گیا ہے، اور شرع اجازت دیتی ہے کہ وہ گوشت خرید کردہ کافر مزے سے کھالو، حلال اور طیب ہے۔

اس مسئلے کی بناء پر ہم کہتے ہیں کہ "تار" معاملات سے تعلق رکھتی ہے۔ اور اس لیے معتبر ہے۔ اور چونکہ اس کے ضمن میں ہم کو یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ فلاں شہر یا قصبہ میں رویت ہوئی ہے تو اس کو ضرور بالضرور معتبر سمجھنا چاہیے، کیوں کہ وہ معاملات کے ضمن میں واقع ہوئی ہے۔ فافہم۔

تتمّہ

حضرات ناظرین!! ہمارے مخالفین علماءِ کلکتہ جو آج کل مخالفت کے ڈنکے بجا رہے ہیں۔ ہماری مخالفت سے قبل خود ہمارے موافق تھے اور درالمختار، عالمگیری وغیرہ کی بناء پر صاف اس بارے میں فتویٰ دے چکے ہیں، چوں کہ صرف ان کو حضرت مولانا کی مخالفت منظور تھی، مخالفت کا اعلان کر بیٹھے۔ چنانچہ سرگروہ مخالفین جناب قاضی حافظ عبدالشکور صاحب مرحوم (کانگڈور) اپنے رسالہ "تائید ذوالمنن وطفیل رسول زمن" کے آخر میں جو غالباً جناب مولوی قادر علی صاحب کے رد میں لکھا گیا ہے، ایک فتویٰ تحریر فرماتے ہیں جو آج کل ہمارے موافق ہے۔ اسے دیکھ کر تعجب آتا ہے۔ ہم اس فتویٰ فارسی کو بہار، پر مع ترجمہ درج کرتے ہیں، نقل کالاصل۔

استفتاء رویت ہلال رمضان:

چہ میفرمایند علماءِ دینِ متین ومفتیانِ شرعِ مبین اندریں صورت مثلاً در کلکتہ بتاریخ بست ونہم شعبان المعظم رویتِ ہلالِ رمضان المکرم نگشت ودر شہر دہلی شد پس بعد از اداءِ شروطِ شہادت، رویتِ ہلال از اصحابِ دہلی برارباب کلکتہ روزہ واجب آید یا نہ؟ چنانچہ مولوی قادر علی صاحب در وعظ خود فرمودہ اند کہ اگر مابین فاصلہ شانزدہ فرسخ باشد کہ ہر فرسخ سہ کروہ انگریزی ست برارباب کلکتہ روزہ واجب نمی شود و اگر ازاں اقل باشد واجب شود و عندالاستفسار بتحقیق وبتکرار بلیغ ہم چنیں گفتند بینوا توجروا۔

السائل۔ شیخ کریم بخش۔

الجواب واعظِ مرقوم بالا دریں مسئلہ سراپا راہِ خطا پیمودہ وتکرار بے جا نمودہ است وقید شانزدہ فرسخ محض بے اصل وکمالِ خلافِ کتبِ فقہ بیان کردہ۔ اصح اینست کہ از رویتِ ہلالِ اہلِ مغرب بعد از اداءِ شروطِ شہادتِ رویتِ ہلال برارباب مشرق روزہ واجب شود۔ لما جاء فی فتاوی در المختار شرح تنویر الابصار یلزم اھل المشرق برؤیۃ اھل المغرب، الخ۔ وھکذا فی فتاوی عالمگیریہ۔ ولا عبرۃ لاختلاف المطالع فی ظاھر الروایۃ کما فی

فتاویٰ قاضی خان الخ انتہی۔ ہٰکذا حکم الکتاب۔ واللہ اعلم بالصواب

المجیب ———————— ھو المصوب

محمد عبد الشکور مرجبا حنفی عفی عنہ

ما اجاب الفاضل الاریب والعالم اللبیب مدللا من الکتاب فھو صحیح بلا ارتیاب۔ من شک فیہ فقد خسر وخاب، واللہ اعلم بالصواب کتبہ العبد المذنب الرجی الی اللہ محمد المدعو بعبد اللہ غفرہ اللہ ووفقہ بما یحب ویرضاہ الخ۔

بگویم من ترا این نکتۂ بے عیب محمدؐ کان عبد اللہ لاریب

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد واٰلہ واصحابہ والتابعین لھم باحسان یوم الدین۔ وبعد فانی وقفت علی ما اجاب الفاضل الادیب والعالم اللبیب ودلائلہ ھذہ من الکتاب صحیحۃ لا شک فیھا ولاریب فجزاہ اللہ عنا وعن سائر المسلمین خیر الجزاء ووفقنا وایاہ لاتباع سنۃ خیر الوریٰ محمد صلعم۔ الراقم المذنب الفقیر المعترفا بالذنوب والتقصیر محمد ابن جعفر علی المدنی عفی اللہ عنہ۔

الجواب صحیح — الجواب صحیح۔

والمجیب نجیح کتبنا محمد ہدایت اللہ مدرس — لاریب فیہ، محمد عبد الرحمٰن عفی عنہ

الجواب صحیح — الجواب صحیح — یہ جواب صحیح ہے

کتبہ محمد حسین علی عفی عنہ — لاشک فیہ محمد فتح علی عفی عنہ — محمد رمضان عفی عنہ

اس فارسی فتویٰ کا خلاصہ اردو میں درج ذیل ہے :

ہلالِ رمضان کے بارے میں استفتاء

علمائے دین اور مفتیانِ شرع متین اس صورت میں کیا فرماتے ہیں کہ مثلاً ۲۹ شعبان المعظم کو رویت یہاں نہیں ہوئی مگر شہر دہلی میں ہوئی، پس جس وقت کہ شہادت معتبر شرعی پہنچ جائے اس وقت اہل کلکتہ پر روزہ واجب ہوا یا نہیں کیونکہ ایک مولوی صاحب اپنے وعظ میں سولہ فرسخ کی قید لگا کر فرماتے ہیں کہ اگر سولہ

فرسخ سے فاصلہ کم ہے تو بے شک اہل کلکتہ پر روزہ واجب ہو سکتا ہے ورنہ واجب نہیں ہوتا۔ اور اس پر اُن کو بڑا زور ہے، آپ جواب بیان فرمائیے، اللہ تعالیٰ آپ کو اجر عطا فرمائے گا۔

جواب یہ ہے کہ واعظ صاحب نے اس مسئلے میں بالکل راہ خطا اختیار کی ہے، سولہ فرسخ کی قید غلط اور خلاف فقہ ہے۔ بڑی سچی اور صحیح بات یہ ہے کہ مشرق والوں کی رویت ہلال سے مغرب والوں پر اگر شہادت کے شروط ادا ہوں، روزہ واجب ہو جاتا ہے جیسا کہ فتاویٰ درالمختار میں جو تنویر الابصار کی شرح ہے لکھا ہے، اہلِ مشرق پر اہلِ مغرب کی رویت سے روزہ لازم ہو جاتا ہے، اگر اُن پر ثابت ہو جائے، اور اسی طرح فتاویٰ عالمگیری میں لکھا ہے کہ اختلاف مطالع کا کچھ اعتبار نہیں ہے مغرب والے اگر چاند دیکھیں تو بشرطِ شروطِ خبرِ معتبر مشرق والوں پر روزہ واجب ہوجاتا ہے، اور اسی قول پر فتویٰ ہے۔

المجیب ———— (جواب دینے والا)

محمد عبدالشکور مرحبا حنفی عفی عنہ

جو جواب کہ جناب عالم فاضل مولوی عبدالشکور صاحب نے دیا ہے، بالکل صحیح ہے، اس میں کچھ شک نہیں جو اس میں شک کرے فقط خسروخاب راقم بندہ گنہ گار محمد مدعو بہ عبداللہ۔ بعد حمد ونعت واضح ہو کہ جو جواب کہ عالم فاضل مجیب نے دیا ہے وہ بالکل صحیح اور حق ہے، اس میں کچھ شک نہیں۔ اللہ تعالیٰ جواب دینے والے کو جزاءِ خیر عطا فرمائے۔ راقم بندہ گنہ گار خطاوار محمد ابن جعفر علی عفی عنہ۔

جواب صحیح اور حق ہے، جواب صحیح ہے، جواب صحیح ہے، جواب صحیح اور حق ہے،
محمد عبدالرحمن عفی عنہ محمد ہدایت اللہ مدرس، محمد حسین علی عفی عنہ، محمد فتح علی عفی عنہ

یہ جواب صحیح ہے۔

محمد رمضان عفی عنہ،

اب دیکھیے کہ اس فتویٰ میں جناب مرحبا صاحب نے صاف لکھ دیا ہے کہ قید شانزدہ فرسخ محض بے اصل وکمالِ خلافِ کتبِ فقہ ہے، اور یہی ہمارا قول ہے کہ مشرق کا مغرب پر اور مغرب کا مشرق پر اعتبار ہے، مگر خدا جانے کیا سبب ہے کہ

یہی مولوی مرحبا صاحب فی الحال ہمارے مخالف ہو گئے۔ لیکن ہمیں امید قوی ہے کہ وہ جب غور فرمائیں گے تو ضرور اس انوکھے مسئلے سے رجوع فرمائیں گے، جیسا کہ اہل حق کا طریقہ رہا ہے۔ اس مسئلے کے منکرین اور مخالفین کے لیے اگرچہ ہم نے کچھ بھی نہیں لکھا اور سوائے بے غوری اور نافہمی کے کچھ لکھ ہی نہیں سکتے۔ لیکن مکرم مولوی محمد عبداللہ صاحب اس فتویٰ میں چونکہ تحریر کر چکے ہیں، اس لیے ہم نقلاً اُنھیں کی عبارت لکھے دیتے ہیں:

"من شک فیہ فقد خسر وخاب" اب ہم نے اختصار کے ساتھ تار کے مسئلے کو اور اس کے قبل اختلاف المطالع کے غیر معتبر ہونے کے مسئلے کو نہایت عمدگی سے ثابت کر دیا ہے جو ایک منصف شخص کے لیے کافی اور شافی ہے۔ اگر ہمارے معزز مخالفین "چشم انصاف سے ملاحظہ فرمائیں گے تو بلاشک اپنے مسئلے سے رجوع فرمائیں گے۔ اور رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا کا وظیفہ وردِ زبان کریں گے ورنہ تعصب نفسانیت اور ہٹ دھرمی کے لیے یہ چند سطر تو کیا حقیقت رکھتی ہیں، دفتر کے دفتر ناکافی اور غیر شافی ہیں۔ اللّٰھم اھدنا الصراط المستقیم ○ صراط الذین انعمت علیھم ۵ غیر المغضوب علیھم ولا الضالّین۔ آمین۔ یا رب العٰلمینَ۔

راقم خادم الطلبہ

ابوالکلام آزاد ثبت اللہ علی طریق الامداد

ودفعہ اللہ نجس الاعتقاد۔ دہلوی

"ریویو"

بر کتاب مستطاب تذکرہ صادقہ

از مجمع فضائل و محاسن، شاعر باکمال، سخنور بے مثال، مولوی ابوالکلام محی الدین احمد صاحب آزاد دہلوی، مقیم کلکتہ صانہ اللہ عن شر الحساد - حمداً لمن جعل کلامہ تذکرۃ لاولی الابصار! واودع البواطن القدسیۃ خزائن الاسرار، ونصلی علی صاحب الکتاب المبین و علے آلہ واصحابہ اجمعین -

وضع زمانہ قابل دیدن دوبار نیست　　روپس نہ کرد ہر کہ ازیں کارواں گزشت

"تذکرۃ الاسلاف لتبصرۃ الاخلاف" عربی کا ایک اعلیٰ درجے کا مقولہ ہے۔ جس کا سچا مصداق یہ تذکرۂ اہلِ صادق پور[1] ہے - اس کے مؤلف اس خاندان کے یادگار، جناب مولانا عبدالرحیم صاحب صادق پوری ہیں - جنھوں نے اپنی لائف اس کتاب کے صفحہ ۱۳۰ سے صفحہ ۱۵۸ تک درج کی ہے -

فاضل مؤلف نے اس تذکرے میں اس خاندان کی تمام کیفیت اور تمام اہل خاندان کے حالات نہایت عمدگی سے تحریر کیے ہیں، بالخصوص ایسی حالت میں کہ تمام خاندان کا شیرازہ پریشان ہو چکا ہو - اور واقفیت اور تحقیق کے بہت کم ذرائع باقی رہ گئے ہوں - ان کی یہ کتاب نہایت مفید اور خاندان کے بقاے دوام کا عمدہ ذریعہ ہے -

غور سے دیکھو تو جس قدر یہ تذکرہ عبرت کا یقین دیتا ہے، اور جس قدر اس خاندان کے تمام واقعات انسان کی طبیعت کو مؤثر کرتے ہیں، غالباً بہت کم ایسے تذاکرہ اور ایسے واقعات ہوں گے -

اول تو "عروج و زوال" کی تصویر جس قدر بہتر اس تذکرے سے کھینچ سکتی ہے کسی واقعے سے نہیں کھینچ سکتی -

ایک خاندان کا یہاں تک ترقی کرنا کہ دولتِ علم اور دولتِ مال میں ان کی نظیر نہ ہو، ہزاروں ان کے جاننے والے ہوں، ہزاروں جان نثاری کے لیے موجود ہوں،

---

[1] الدر المنثور فی تراجم اہل صادقفور معروف بہ تذکرۂ صادقہ مطبوعہ ۱۹۰۲ء -

خاندان کا خاندان ایک موقع پر مسکن گزین ہو جائے۔ اور اتفاقی صورت کا نام "صادق پور" انتیا ر کرے۔ باوجودیکہ یہ نام ایک شہر کے کسی حصے سے تعلق رکھتا ہو۔ مگر مسمّٰی کی ترقیات جزئی شہرت سے بڑھ کر کلی شہرت سے بھی بڑھ جائے۔ علمی حیثیت سے دیکھو تو بڑے بڑے مصنف اعلیٰ درجے کے واعظ خاندان میں موجود ہوں۔ دولت کے لحاظ سے دیکھو تو تمام موجودہ دولت مندوں میں ان کے ڈنکے بجتے ہوں۔ پھر یکایک اس خاندان کا ایسے ورطۂ تنزل میں آپڑنا، جس سے اس کی تمام ترقیات پر پانی پھر جائے، یعنی سرے سے بیڑا ہی ڈوب جائے، کوئی نام لیوا نہ نظر آئے، کوئی جان نثار جان نثاری نہ کرے، خود حاکم وقت بخت برگشتہ کی طرح پھر جائے، خود اپنے پرائے ہو جائیں۔ دم کے دم میں کارخانہ ہی پلٹ جائے، اور ایک آنکھ بند کرنے والا جب ایک پل کے بعد آنکھ کھولے، تو اسے بجائے ایک خوبصورت محل کے ایک وحشت ناک لق و دق میدان چٹیل نظر آئے۔ نہ اس کے سر بفلک محلوں کا کچھ نشاں معلوم ہو، اور نہ اس صادق پوری دیواروں کی کچھ یادگار باقی ہو۔ پس ایک انقلابی صورت دیکھنے والے کو حیرتی اور مبہوت بنا دے!! ہای آں صادق پور بہ کجاست! واہل صادق پور بہ کجا اند! نہ مکان را متمکنے و نہ مکیں را تمکنے الٰہی ایں چیست!

یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ کس لیے ہوا؟ بس بس! یہ کچھ نہیں معلوم! ہاں اس حاکم علی الاطلاق خالق دوجہاں کی بے انتہا قدرتوں سے ایک انقلاب کنندہ قدرت ہے کہ "اقبال کو تنزل سے بدل دینا"!! مگر اس کا سبب ظاہری بجز نااتفاقی کے اور کچھ نہیں قرار پا سکتا!

اب دیکھو! کہ یہ بیان انسان کو اس کی بے انتہا قدرت کاملہ اور نااتفاقی کی برائیوں کا یقین دلاتا ہے، اور سننے والے کو کس قدر موثر کرتا ہے، ہاں! اور نہیں تو تم ذرا اپنے ہی دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھو کہ کیسا کانپ رہا ہے! کیسی ہولناک کیفیت پیدا کر رہا ہے! اس سے بہتر اور اس سے بڑھ کر اور کیا حالت موثر ہوگی!؟

پھر اس خاندان کے جو پس ماندہ تھے، ان کے ساتھ کس طرح یہ فلک کج رفتار کیا سے پیش آیا؟ کون سی مصیبت تھی کہ ان پر نہ آئی ہو؟ اور وہ کون سی سختی تھی کہ انھوں نے جھیلی نہ ہو۔ مگر ساتھ ہی ان کا بے نظیر صبر و تحمل اور اس جاں گداز حالت میں بھی

اللہ کا شکر ادا کرنا صبر و شکر کی ایسی عمدہ تعلیم دیتا ہے کہ اس سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ !۔

اس کے بعد پھر اتفاق اور استقلال کا ساتھ دینا، ایک کوشش کرنے والے کی کوشش سے خاندان کا پھر ترقی کرنا۔ اسکول کا جاری ہونا، علم کا ساتھ دینا، اس سب کچھ کا ایک اتفاق کی بدولت ہونا، کیا اتفاق کی تعلیم نہیں دیتا ؟

واقعی یہ کتاب اوّل سے آخر تک خاص خاص کیفیتوں اور حالتوں کا فوٹو پیش نظر کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مؤلف موصوف کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ انھوں نے یہ کتاب تالیف فرمائی، اِدھر اُدھر سے کوشش کر کے واقعات اکٹھا کیے، چیونٹیوں کے ذریعے سے شکر جمع کر کے لڈو تیار کیا، اور ہم لوگوں کو مستفیض ہونے کا موقع دیا۔

اپنے مکرم دوست جناب مولانا محمد یوسف صاحب جعفری چیف مولوی بورڈ آف ایگزامنرس کلکتہ کی فرمایش سے میں نے ایک مثنوی فارسی تقریظ میں نظم کی تھی[1] جو وقت گنجایش کے سبب سے یہاں درج نہ ہو سکی۔ تین قطعات تاریخ درج کرتا ہوں۔

قطعۂ تاریخ تصنیف تذکرہ صادقہ

مژدہ اے والہان صادق پور — مژدہ اے عاشقان روے وطن
حضرت مولوی عبدِ رحیم — صاحب علم و ماہرِ ہر فن
تذکرہ یہ انھوں نے لکھا ہے — جس کی تعریف میں زباں الکن
نقطہ نقطہ ہے خالِ روے بتاں — صفحہ صفحہ بیاضِ صحنِ چمن
واقعات صحیح لکھے ہیں — جس میں کچھ بھی نہیں ہے جائے سخن
تذکرہ یہ وطن کا لکھا ہے — اس پہ شیدا ہیں عاشقانِ وطن
اس میں لکھا ہے حال "صادق پور" — جو کبھی تھا علوم کا گلشن
جو بزرگوں کا تھا کبھی ملجا — جو بزرگوں کا تھا کبھی مسکن

---

[1] مولانا کی یہ فارسی منظوم تقریظ بھی دستیاب ہو گئی ہے۔ اور اسی کتاب کے حصّہ اول میں درج ہو چکی ہے۔

عالم و فاضل و ادیب و حکیم　　الغرض کاملوں کا تھا مخزن
شمع بزم کمال کہیے انھیں　　جن سے بیت العلوم تھا روشن
اُن کو کہیے زر کمال اگر　　اِس کو، کہیے کمال کا معدن
ہائے دیکھو! یہ گردشِ دوراں　　ہائے دیکھو! زمانے کے یہ چلن
اک خزاں لُوٹ لے گئی سب کچھ　　اب نہ وہ پھول ہیں نہ وہ گلشن
ہاں فقط یادگار ہیں باقی!　　جن سے اب نام اُن کا ہے روشن
میرے مخدوم حضرت رنجورؔ　　جن کی توصیف! یعنی ناممکن
ان کا ارشاد تھا لکھو تاریخ　　ان کا اصرار تھا کہ تعجیلاً
تھی اسی فکر میں پریشانی　　غور میں تھا کہ ناگہاں فوراً
دل سے آزادؔ کو ملی تاریخ　　ہے طرا زندہ ذکر اہل وطن

۱۳۱۹ھ

ولہ

اس رسالے کی کس سے ہو تعریف　　واقعی فیض کا مقالہ ہے
ہر روایت ہے مستند اس کی　　معتبر اس کا ہر حوالہ ہے
سر سے آزادؔ لکھ دو ہجری سال　　خیر آفاق یہ رسالہ ہے

۱۳۱۹ھ

ولہ

قطعۂ تاریخ طبعِ کتاب مذکور

چھاپ کردند ایں کتاب نفیس　　فکر شاں را صد آفریں بادا
از لبِ ہاتف ایں ندا آمد　　سرمۂ چشم ناظریں بادا

۱۳۲۰ھ (مطابق ۱۹۰۲ء)

"فنِ اخبار نویسی"

یورپ اور امریکہ نے جو آج کل حیرت انگیز ترقی کی ہے، اور علوم و فنون، تہذیب و شائستگی میں جو ان کا آج طوطی بول رہا ہے، ان میں من جملہ اور اسباب ترقی کے ایک بڑا سبب اخبار دیکھنا ہے جسے اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک اور بچے سے لے کر بوڑھے تک روزانہ ہر ایک دیکھا کرتا ہے، اور علمی و عملی فیوضات حاصل کرتا ہے۔ چوں کہ کچھ عرصہ سے ہندوستان اور پنجاب میں بھی اخباروں کا چرچا ہو رہا ہے۔ اکثر اُردو اخبارات ترقی کر رہے ہیں، لوگوں کو ایک حد تک ان سے دلچسپی بھی ہو گئی ہے، اس لیے ہم اس فن کی مختصر تاریخ اور اس کے اقسام وغیرہ بیان کرتے ہیں۔

اخبار کا موجد:

اس بارے میں سخت اختلاف ہے کہ اخبار کا موجد کون ہے، چین والے اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ اس کی ایجاد کرنے والے ہم ہیں، روما والے مدعی ہیں کہ جناب مسیح علیہ السلام سے کئی سال پیشتر ہم نے جاری کیا تھا۔ لیکن یہ تمام باتیں پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتیں، کیوں کہ اگر تسلیم کر لیا جائے کہ فی الواقع اہل چین یا اہل روما اس کے موجد ہیں، اور سیکڑوں برس پہلے یہ شائع کر چکے ہیں تو بھی ان کا مدعا ثابت نہیں ہوتا۔ ہم جس اخبار کا بیان کر رہے ہیں، اور اخبار سے جو مفہوم بالفعل سمجھا جاتا ہے اِس میں اور اُس میں زمین اور آسمان کا فرق ہے "والشتان بینھما"۔

اخبار جب ہی اخبار ہو سکتا ہے جب کہ اس کے متعدد نسخے اشاعت کی غرض سے موجود ہوں، اور ساتھ ہی مختلف مقامات میں بھیجنے کے آسان وسائل بھی میسر ہوں۔ اور یقیناً اُس زمانے میں یہ تمام باتیں مفقود تھیں۔ نہ تو مطبع تھا کہ دس چھوڑ ہزار نسخے بہم ہو جائیں۔ اور نہ یہ انتظام ریل تھا کہ جہاں چاہیں مشرق سے مغرب تک اور جنوب سے شمال تک بھیج دیں۔ اس لیے اس زمانے کے اخبار پر اخبار کا اطلاق ہو

مخزن لاہور بابت ماہ مئی ۱۹۰۲ء جلد ۳ نمبر ۲۔

ہی نہیں سکتا۔ بس اخبار جب ہی سے اخبار ہو سکتا ہے جب سے یہ چھاپہ خانہ ایجاد ہوا ہے، اس اعتبار سے اس چیز کی ایجاد کا سہرا اہل جرمن کے سر باندھنا چاہیے، جنھوں نے پندرھویں صدی عیسوی میں پہلا اخبار دنیا میں پیش کیا، اور ہمارے نزدیک پہلے پہل یہی اخبار شائع ہوا۔ والعلم عند اللہ۔

انگلستان :

انگلستان میں پہلے پہل اخبار ۱۶۲۲ء میں جاری ہوا۔ یہ وہی اخبار ہے جو آج کل ٹائمز کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ پہلے اس کا نام ویکلی نیوز تھا۔ پھر ۱۷۸۵ء میں ڈیلی یونیورسل کے نام سے شائع ہوتا رہا۔ اب ۱۸۸۵ء سے ٹائمز کا نام اختیار کر چکا ہے، اس کے بعد ٹیٹلر وغیرہ اسٹیل اور اڈیسن نے شائع کیے، اور پھر گویا یہ راستہ سبھوں کو معلوم ہو گیا۔ لیکن اس کی اصل داغ بیل انگلستان میں ویکلی نیوز ہی نے ڈالی۔

فرانس :

فرانس میں پہلا اخبار ۱۶۳۱ء میں شائع ہوا۔ جس کا نام گزٹ دی فرانس تھا۔ اس میں زیادہ تر ملکی معاملات پر بحث ہوا کرتی تھی۔ اس کے بعد بہت سے اخبار شائع ہوئے، لیکن ابتدا میں فرانس سے ۱۶۳۱ء ہی کو اخبار نکلا۔

روس :

روس میں پہلا اخبار ۱۷۰۳ء میں شائع ہوا۔

امریکہ :

یہ کون نہیں جانتا کہ جو ترقی امریکہ نے اخبارات میں کی ہے وہ یورپ کو نصیب نہیں ہوئی۔ بڑی تحقیق سے معلوم ہوا کہ اخبار یہاں سے پہلے پہل ۱۷۰۳ء میں شائع ہوا۔ اس کا نام بوسٹن نیوز لیٹر تھا۔ اور اس کا دفتر شمالی امریکہ میں تھا۔ اس سے قبل اہلِ امریکہ جانتے بھی نہ تھے کہ اخبار کیا چیز ہے۔ آج جو ترقی امریکہ کو نصیب ہوئی ہے وہ بہت کچھ اخبار ہی کی بدولت ہے۔

اخبار کی قسمیں :

یورپ میں جہاں اس مفید اخبار نویسی نے اعلیٰ درجے کی ترقی کی ہے۔ اخبار

کی بہت سی قسمیں ہوگئی ہیں، اور ہر ایک قسم کے اخبار ایک نہیں سیکڑوں شائع ہوتے ہیں۔ مگر اس کی مفید اقسام اور اعلیٰ مضامین یہ ہیں :

مضامین	اقسام
مذہبی، تعلیمی، تجارتی، قومی، ٹیکنیکل وغیرہ۔	گزٹ، میگزین، ریویو، جرنل وغیرہ

اخبار کی تعریف :

چوں کہ اخبار کے بانی اور موجد اہل یورپ ہیں، اس لیے انھیں کی تعریف ہمارے نزدیک معتبر ہے۔ اخبار جمع ہے خبر کی۔ خبر کو انگریزی میں نیوز کہتے ہیں۔ نیوز میں چار حرف ہیں۔

NEWS :

یہ چار حرف ان چار لفظوں کا اشارہ کرتے ہیں :

(۱) N (اشارہ ہے) North کا جس کے معنی ہیں شمال۔

(۲) E (اشارہ ہے) East کا جس کے معنی ہیں مشرق۔

(۳) W (اشارہ ہے) West کا جس کے معنی ہیں مغرب۔

(۴) S (اشارہ ہے) South کا جس کے معنی ہیں جنوب۔

اب دیکھو کہ اس چھوٹے سے جملے میں کتنی بڑی وسعت ہے کہ جہات اربعہ کو لیے ہوئے ہے۔ بس اخبار کی تعریف یہ ہوئی کہ " وہ مجموعہ اک وقت معیّن پر شائع ہونے والا جس میں مغرب، مشرق، جنوب، شمال کی تمام خبریں اور ان جہات اربعہ کے متعلق مفید باتیں درج ہوں۔

اخبار کے فوائد :

ناظرین ! کیا اخبار کے سوا دنیا میں کوئی بڑی سے بڑی ایسی دوربین ہے جس سے آپ دنیا کو اپنا منظر بنا سکیں ؟ اور کیا اخبار کے سوا کوئی اونچے سے اونچا بلند مقام یا کوئی پہاڑ ہے جس پر بیٹھ کر آپ تمام دنیا کا نظارہ کر سکیں؟ نہیں! ہرگز نہیں! نہ دنیا میں کوئی ایسی دُوربین ہے نہ کوئی ایسا بلند مقام ہے۔ یہ صرف اخبار ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے ملاحظے سے آپ تمام دنیا کو ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ اور جس کے حاصل کرنے سے آپ تمام دنیا کے نظارے حاصل کر سکتے ہیں۔

پچھلے زمانے میں واقفیت اور معلومات حاصل کرنے کا، عجائبات عالم دیکھنے کا، سوائے سفر کے دوسرا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ مگر اس میں علاوہ صرف کثیر کے کہ جس کی وجہ سے غریب اور مفلس شخص اس سے مستفیض نہیں ہوسکتا، محنت، تکلیف اور پریشانی بہت تھی، اور بعض اوقات خود جان کا خطرہ تھا۔ علاوہ بریں اگر ایک شخص متعلقین کی جدائی اور پریشانیوں کا متحمل بھی ہوتا، اور تمام عمر سیاحی بھی اختیار کرتا۔ جب بھی تمام دنیا کی سیر نہیں کرسکتا تھا لیکن اخبار ایک ایسی چیز ہے کہ گھر بیٹھے بلا محنت ومشقت تمام دنیا کی سیر کرے اور معلومات اور عجائبات عالم کی سیر سے طبیعت کو محظوظ کرے۔

یورپ میں اخبار سلطنت کا ایک جزوِ اعظم سمجھا جاتا ہے، کیوں کہ رعیت کے خیالات کی باگ فی الواقع اخبار کے ہاتھ میں ہے۔ پرنس بسمارک کی کیفیت یہ تھی کہ جب کبھی معاملات ملکی میں اسے کوئی خاص طرز اختیار کرنی ہوتی تھی تو اس سے قبل ہی وہ اخبار میں تائیدی مضامین شائع کرادیتا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ تمام ملک اس کا ہم زبان ہوکر اسی کا کلمہ پڑھنے لگتا تھا۔

یورپ کے اخباروں کو آج وہ طاقت حاصل ہے کہ جو چاہیں سو کریں، ایک سے دوسرے کی جنگ کرادیں یا کسی جنگ میں صلح کرادیں یا ایک کا ملک چھنوا کر دوسرے کو دلوادیں۔ کسی عہدہ دار کو معزول کرانا اور کسی ادنیٰ شخص کو اعلیٰ عہدے دار بنانا ان اخبارات کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

اخبار کی خاص صفتیں:

اخبار گورنمنٹ کے حقوق اور منشا کی حفاظت کرتا اور رعایا کے حقوق گورنمنٹ سے حاصل کرتا ہے۔

اخبار علمی مذاق ہر طور سے پھیلاتا ہے، اور قابلِ توجہ باتوں پر توجہ دلاتا ہے۔

اخبار غیر ملکوں کی اچھی باتوں کو ہم تک پہنچاتا ہے۔ اور ہماری باتوں کی ان تک اشاعت کرتا ہے۔

اخبار ہر ملک کے حالات، رسم ورواج، آب وہوا، طرزِ معاشرت، طرزِ حکومت، مذاہب، عادات واخلاق، قوانینِ سلطنت، جھگڑے فساد، جنگ وجدل کو اخباری حیثیت سے لکھتا ہے، اور ان پہ بحث کرتا ہے۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی اور

اچھے کو بُرے سے جُدا کرتا ہے۔

اخبار ناظرین کی معلومات کو بڑھاتا ہے، اور اس کے علم کو جلا دیتا ہے۔

اخبار غلط خیالوں کی تردید کرتا ہے، اور سچے خیالوں کی تائید کرتا ہے۔

اخبار انسان کی تعریف اور فضیلتِ انسانیت بیان کر کے رؤسا اور امرا کو انسانیت کی جانب بلاتا ہے۔ اور ان کو علوم وصنائع وحرفت کی تعلیم عام کرنے اور مریضوں کی دوا اور علاج کے نئے مدرسے اور نئے شفاخانے قائم کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

اخبار فوائدِ عدالت بیان کر کے حاکم کو اس کی جانب توجہ دلاتا ہے اور گویا تمام رعایا کی وکالت کرتا ہے۔ ان کی فریاد اور شکایتوں کو گوشِ حکومت تک پہنچاتا ہے۔

اخبار حکام اور عمال اور معمورین رشوت خور اور ظالموں کے ظلم وجبر کے دفع کرنے میں کوشش کرتا ہے، اور منتظمینِ اعلیٰ کو اس کی اطلاع دے کر اس کا کافی انسداد کرتا ہے۔

اخبار ہر ایک عالم عاقل کی امانت افکار اور ودیعت خیالات کو دوسرے عالم، عاقل کی نگاہوں اور کانوں تک پہنچاتا ہے، اور علما، عقلا کو ایک دوسرے سے آگاہ کرتا، اور مبادلۂ خیال کا موقع دیتا ہے۔

اخبار اپنی قوم کے اجزائے پراگندہ اور اعضائے متفرقہ کو یک جا کر کے حیاتِ تازہ بخشتا ہے، اور از سرِ نو زندہ کرتا ہے۔

اخبار اپنے ناظرین کو بیٹھے بٹھائے تمام عالم کی سیر و سیاحت سے تجربہ کار بناتا اور خوش اور محظوظ و مسرور کرتا ہے۔

اخبار دوست دارانِ اُمت اور محبانِ قوم کو دشمنوں اور عدوؤں سے جُدا کرتا ہے، اور لباسِ کذب اور پردۂ فریب کو چاک چاک کر دیتا ہے۔

اخبار شر اور بدبختی کی گھاٹیوں اور کمین گاہوں سے بچانے کی غرض سے خبر دے کر خیر اور سعادت، نیک بختی اور بصیرت کی شاہراہوں کا راستہ بتاتا ہے تاکہ قوم بُری راہ نہ چلے، اور صراطِ مستقیم سے منزلِ مقصود تک پہنچ جائے۔

اخبار جس چیز میں ملک کا فائدہ دیکھتا ہے۔ فوراً اسے مجتہانہ الفاظ میں قوم پر ظاہر کر دیتا ہے، اور نکتہ چینی اور اعتراض کی راہ سے ہمیشہ بچتا رہتا ہے، اخبار ایسے ضروری امورات اور معارف کا جن کا جاننا ہر فرد بشر پر ضروری ہے، عام فہم عبارت میں۔ جس سے عوام الناس کو انتباہ ہو ذکر کرتا ہے۔

اخبار پست ہمتوں کے برانگیختہ کرنے اور مردہ دلوں کو زندگی بخشنے کے لیے ملک کی دلچسپ ترقیات اور حالات کو اور صالحین کے کارناموں کو نہایت موثر الفاظ میں بیان کرتا ہے، اور ان کے عمدہ خصائل کو بیان کرکے قوم کو ان کی تقلید پر آمادہ کرتا ہے کہ تذکرۃ الاسلاف تبصرۃ الاخلاف ہے۔

اخبار ہمیشہ اخلاق جمیلہ اور خصائل پسندیدہ کے اوصاف اور عادات رذیلہ کے نقصانات بیان کرکے قوم کو اچھی باتوں پر مائل اور بُری باتوں سے متنفر کرتا ہے۔ اخبار سے ذہن اور عقل میں ترقی ہوتی ہے، اور علمی مذاق بڑھتا ہے۔

الغرض اخبار کے فوائد بے شمار ہیں جن کے بیان سے اتنا کہہ دینا بہتر ہے کہ جو شخص دنیا میں اپنے بُرے بھلے کی تمیز کرنا چاہے، اور دنیا میں رہ کر دنیا کی عمدہ باتوں کو حاصل کرنا اور بُری باتوں کو چھوڑنا چاہے۔ حقائق و معارف اور مختلف علمی و عملی معلومات کا شوق رکھتا ہو، اور دنیا میں مہذب اور شائستہ، عاقل و فرزانہ ہو کر رہنا چاہے، اور گھر بیٹھے بلا صرف و خرچ ایک استاد شفیق تلاش کرنا ہو تو وہ اخبار بینی اختیار کرے۔

اخبار آپ کو بتاتا ہے کہ دیکھو! فلاں ملک میں فلاں شخص نے یوں ادنیٰ حالت سے اعلیٰ درجے تک ترقی کی، اور عزت و وقعت یوں حاصل کی، وہ ایک معمولی مفلس شخص تھا مگر تھوڑے دنوں میں دولت مند ہو گیا۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ تعصب اور نفسانیات کو بالائے طاق رکھ کر بے تعصبی اور سلامت روی کا سبق یاد کر لیا تھا، اگر تم بھی ویسے ہی ترقی کے زینے طے کرکے اعلیٰ مینار پر پہنچنا چاہتے ہو تو اسی شخص کے قدم بہ قدم چلو، اپنے مقصد میں کامیاب ہو گے۔

اخبار ایک قومی ہادی ہے:

اخبار دراصل ایک زندہ ہادی ہے جو ہر قسم کی باتوں میں ہدایت کرتا ہے، بُری

باتوں سے تنفر دلاتا ہے۔ اور عمدہ باتوں کی جانب مائل کرتا ہے۔ کیوں کہ انسان کی طبیعت میں اک ایسی زبردست قوت گمراہ کنندہ موجود ہے کہ راستے کو چھوڑ کر شقاوت کی تنگ و تاریک اور خوفناک و پیچ دار گھاٹیوں تک آنکھ بند کیے بڑھ جاتا ہے۔ اور اس بدبختی کے مقام پر خوش قسمتی کے راستے تلاش کرتا ہے۔ اور جب تک کوئی خضر صفت رہبر اس کا ہاتھ پکڑ کر منزل مقصود تک نہ پہنچائے وہ یوں ہی پریشان و سرگرداں رہتا ہے۔

اس لیے قوم اور فرد کو ایک ہادی اور رہبر کی سخت ضرورت ہے اور بے اُس کے کوئی بھی صراط مستقیم پر نہیں چل سکتا۔

پس حالت موجودہ کے اعتبار سے اخبار سے بڑھ کر قوم کا کوئی ہادی اور رہبر نہیں ہے۔ جو اسے سیدھی راہ پر چلانے میں مددگار اور ترقی کا بدل و جان خواستگار ہو۔

اخبار کے متعلق نامور لوگوں کی رائے:

ایک بڑے مدبر کی رائے اخبار بینی کے متعلق یہ ہے کہ کتب بینی سے اخبار بینی زیادہ سود مند ہے، اور اس کا نفع اس سے بدرجہا زیادہ ہے۔ کیوں کہ ایک کتاب کسی خاص بحث اور مضمون پر ہوا کرتی ہے۔ اور برخلاف اس کے اخبار میں چھوٹے چھوٹے مضامین مختلف بحثوں پر ہوا کرتے ہیں۔ اور بجائے ایک بات کے ان میں متعدد سود مند باتیں ہوتی ہیں۔ جس چیز سے ہماری طبیعت کو مناسبت ہو، ہم اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

علامہ سید جمال الدین افغانی المصری اخبار کے فوائد میں یہ لطیف شعر پڑھتے ہیں۔

لا سعادت لامۃ لیس لہا سائق　　　　الی الفضائل ولا زاجر عن الرذائل

(یعنی جس قوم میں اچھی باتوں کی جانب ہدایت کرنے والا اور بُری باتوں سے منع کرنے والا (اخبار) نہ ہو اسے نیک بختی اور سعادت نہیں مل سکتی)

یہ شعر اس حکیم وقت کا ہے جس کی علمی لیاقت آج تمام اخباری دنیا میں مسلّم ہے۔ اس شعر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حالتِ موجودہ کے اعتبار سے اخبار سعادت کا باعث

ہے۔ سعادت سے محروم ہے جو اخبار بینی سے ناواقف ہے۔ نیک بختی سے دُور ہے وہ قوم جو اخبار سے مستفیض نہیں ہے۔ یورپ کو دیکھو آج دنیاوی سعادت میں کوئی قوم اس کے لگ بھگ نہیں ہے۔ تمام دنیا میں مسلّم ہو چلا ہے کہ جو شخص یا قوم دنیاوی سعادت کی خواہاں ہو، یورپ کی تقلید کرے۔ یہ کیوں؟ بس اسی لیے کہ اخبار بینی وہاں طبیعتِ ثانی ہوگئی ہے۔ جوانوں، بوڑھوں، بچوں، عورتوں، مردوں، معماروں، کتب فروشوں، مزدوروں، عطاروں، ڈاکٹروں، پادریوں، شاعروں، نجومیوں، تاجروں، مصوّروں، زمینداروں، کسانوں، انجینیروں، نوکروں وغیرہ وغیرہ ہر ایک فرقہ، ہر ایک عہدہ، ہر ایک فن، ہر ایک علم، ہر ایک قسم کے لوگوں کے لیے۔ علٰحدہ علٰحدہ اخبار شائع ہوتے ہیں، اور وہ اسے روزانہ دیکھ کر اپنی ضروری حاجتوں کو رفع کرتے ہیں۔

ڈاکٹر ہیلمن ٹی ٹی اپنی ایک تصنیف میں تحریر کرتے ہیں کہ میں جس وقت ڈیونٹی کالج میں تحصیل علم میں سرگرم تھا، مجھے مضامین نویسی کا بہت شوق چرھا تو مجھے اخباروں کے مطالعے سے بہت کچھ فائدہ ہوا، اور بہت باتوں کو میں نے اس سے سیکھا جو علمی اور عقلی مضمون اخباروں میں ہوا کرتا تھا۔ اسے میں اوّل غور و فکر کے ساتھ پڑھتا اور رائے زنی کیا کرتا تھا، اور پھر اس کو اور طالب علموں کے سامنے پیش کیا کرتا اور بحث کیا کرتا تھا۔ اس طرح سے ایک علمی مذاق میری طبیعت میں پیدا ہوگیا، اور اس نے ایسا اضطراب پیدا کر دیا کہ میں اس فن اخبار نویسی کو اختیار کرنے پر مجبور ہوگیا۔ اور پھر تو ایسے ایسے لاجواب مدلل علمی آرٹیکل اور مضامین لکھنے لگا جس کی قوم نے داد دی۔ یہ اخبار بینی ایسی عمدہ چیز ہے کہ اس سے زیادہ کوئی دلچسپ مشغلہ نہیں ہے۔ مسٹر گلیڈاسٹون سابق وزیر اعظم انگلستان اخبار کے متعلق لکھتا ہے کہ پبلک اخبار کی کیوں شاکی ہوتی ہے۔ یہ تمہارے ہی فائدے کی بات ہے، اس کا وجود تمہارے لیے غنیمت ہے۔ یہ ایک زبردست ہاتھ ہے، جس سے تمام دینی دنیوی باتوں کی تکمیل ہوتی ہے، اور اس کا فیض جاری ہر طرف پھیلتا ہے۔ اس سے بڑے بڑے کام نکلتے ہیں۔ اس سے بڑے بڑے فائدے انسان کو ہوتے ہیں۔ پرنس بسمارک فن اخبار نویسی میں بڑا مشاق تھا، اور اس کے رموز و نکات کا ایسا ماہر تھا جیسے کوئی بڑا مشاق، لائق و فائق اور تجربہ کار ایڈیٹر ہو، مجھے چوں کہ اس کام پر اس نے مامور کیا تھا

اس لیے وہ دن میں کئی بار بلا کر اخبار کے متعلق باتیں کیا کرتا تھا، اخبار کا وہ ایسا عاشق تھا کہ رات دن اسی دُھن میں رہتا تھا۔ رات کو آدھی آدھی رات (کے وقت) دفعتاً چونک کر مجھے طلب کرتا تھا، اور جو مضمون اس کے ذہن میں اس وقت سماتا تھا لکھ کر حکم کرتا تھا کہ اسے فوراً صبح کو فلاں فلاں اخبار میں شائع کر دیا جائے غرضیکہ اخبار سے اسے بڑی دلچسپی تھی، اور سب سے عمدہ مشغلہ سمجھتا تھا۔ پیٹر اعظم شاہ روس کی لائف میں لکھا ہے کہ وہ نہایت دلچسپی سے اخباروں میں ایڈیٹوریل مضامین لکھا کرتا تھا اور اخبار کو رعایا کے خیالات کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ اور اخباروں سے اس کو اتنا شغف تھا کہ بذات خود اس کے پروف کی صحت کیا کرتا تھا، اور وہ تمام پروف اس کی مشہور لائبریری میں موجود ہیں۔ فرانس کے مشہور مدبر نپولین کے حالات میں مؤرخ لکھتا ہے کہ نپولین کا قاعدہ تھا کہ جب وہ کوئی بڑا کام کرنا چاہتا تھا تو پہلے اخباروں میں اس کے متعلق موافق اور تائیدی مضامین شائع کراتا تھا، اور اس طور سے عام رایوں کو اپنے موافق کر لیتا تھا۔

ہندوستان میں جتنے نامور جنرل اور گورنر آئے ہیں جب وہ پنشن لے کر ولایت کو واپس جاتے ہیں تو وہاں بھی اخبار نویسی کے پر لطف مشغلے میں باقی زندگی بسر کرتے ہیں۔ سر ولیم میور سے ہندوستان کا کوئی تعلیم یافتہ ایسا ہے جو واقف نہیں؟ یہ علاوہ اس کے کہ ہندوستان میں عرصے تک گورنر رہ چکے ہیں بہت بڑے مصنف بھی ہیں ان کی تصانیف میں "لائف آف محمدؐ" ایک ممتاز کتاب ہے۔ جس میں آں حضرت پیغمبرؐ برحق روحی فداہ کی لائف لکھ کر اس پر نئی طرز سے نکتہ چینی کی گئی ہے۔ اور جو اس طریق اعتراض سے مختلف ہے جو عام مشنری اور پادری کیا کرتے ہیں۔ جس سے میور صاحب کی ایک ممتاز صفت معلوم ہوتی ہے۔ یہ فاضل شخص بھی اخبار کے نامہ نگار ہیں۔ اور ان کے اکثر مضامین اخباروں میں شائع ہوتے ہیں۔ مسٹر سر الفرڈ لائل، سر لیبل گریفن، سر رچرڈ ٹیمپل، سر رچرڈ گارتھ وغیرہ تمام مضامین نگار ہیں۔ سر ولیم ہنٹر سابق ممبر کونسل گورنمنٹ ہند اخبار ٹائمز کے ایڈیٹر ہوئے، اور ان کے پر زور آرٹیکل نہایت وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ فن اخبار نویسی کیسا لاجواب اور دلچسپ فن ہے کہ ایسے فاضل اسے اختیار کرتے ہیں۔

ایک قدیم مضمون

کتاب اس تعلیم میں نہیں رکھی گئی جس سے احکام دین کے اسرار اور اُن کی خوبیاں معلوم ہوں۔ حالانکہ زمانۂ حال کے موافق اس کی بڑی ضرورت ہے۔

پس اگر اس کا کوئی علاج ہے اور ہم کو سوجھتا ہے تو یہی کہ جدید علم کلام کی بنیاد ڈالی جائے، اور اسلام کو عقل کے موافق کر دکھایا جائے، اور اس طرح کہ اسلامی معتقدات بھی قائم رہیں، اور تطبیق کی تطبیق بھی ہو جائے۔ جب یہ بات طے ہو گئی تو پھر اب یہ دیکھنا چاہیے کہ ہماری تعلیم کے وہ سربرآوردہ اصحاب جو اس کام کے اہل ہیں کیوں ایک ناگوار سکوت اختیار کیے ہوئے ہیں؟ کیا ان کے نزدیک ہندوستان کی مذہبی حالت قابل اطمینان ہے؟ نہیں۔ بلکہ وہ حضرات خود اپنی تحریر و تقریر میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔ اور بعض ذی علم وعدہ بھی فرما چکے ہیں کہ ہم چناں و چنیں کریں گے۔ مگر ان کا یہ وعدہ کسی معشوق کے وعدۂ وصل کا اثر رکھتا ہے، جس کا ایفا ہونا عشاق کی پرشوق نگاہ میں بالکل غیر ممکن ہے! الغرض جو حضرات اس کام کی قابلیت رکھتے ہیں، انھوں نے سکوت اپنا مسلک قرار دیا ہے۔ اس لیے مجبورًا ہم نے آج اس راہ کا سفر اختیار کیا ہے کہ جس کی تکالیف کا تحمل ہم میں نہیں ہے، اور اس دریائے ناپیدا کنار کے طے کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ جس کی طاقت ہم میں نہیں ہے۔ مگر شوق ہے اور ضرورت نے مجبور کیا ہے۔ کیا عجب کہ ہماری یہ پیش قدمی کسی حسین کے جذبۂ حسن کا اثر رکھتی ہو جس کے نظارے کے لیے ہر شخص بےتاب ہو جاتا ہے، اور بے اختیار مہر سکوت کو توڑ کر چلّا اٹھتا ہے۔ کہ

قربان نگاہے تو شوم باز نگاہے

آیندہ تمہید میں اسلام کی ابتدائی کیفیت اور یونانی فلسفہ کی اشاعت، علم کلام

لہ احسن الاخبار کلکتہ یکم جون ۱۹۰۲ء بحوالہ سب رس حیدرآباد دکن، بابت ماہ اکتوبر ۱۹۶۲ء۔
بشکریہ رزاق فاروقی۔

کی ایجاد اور اس کی پوری مفصل تاریخ پھر عربوں سے اہل یورپ کا فلسفے کو حاصل کرنا اور اس میں حیرت انگیز ترقی آج کل نیا فلسفہ اور اس کی تعلیم ایک دلچسپ طریقے سے بیان کی جائے گی اور پھر اصل مضمون شروع ہوگا جس میں اس علم کلام جدید کے اصول اور فروع سے بحث کے بعد تمام اسلامی اعتقادات، عبادات عملیات کے عقلی اسرار و فوائد بیان ہوں گے۔ ناظرین مشتاق رہیں۔

آزاد دہلوی از کلکتہ۔

جشنِ تاجپوشی کا کلکتہ میں دلچسپ مشاعرہ

شاعر کو دل سے بھاتی ہے تعریف شعر امیرؔ سو بوتلوں کا نشہ ہے اس واہ واہ میں

حضور شاہ عالم پناہ کی تاجپوشی کی خوشی میں (خدا انھیں جلد صحت عطا فرمائے۔ غالباً یہ شرف شعرائے کلکتہ ہی کو حاصل ہوا ہے کہ انھوں نے اس پر اظہار مسرت کے۔ لیے خاص طور سے مشاعرہ ترتیب دیا اور ثابت کر دیا کہ اس گروہ کو بھی حضور سے ویسی ہی مودت ہے جیسی کہ عموماً وفادار رعایا کو اپنے بادشاہ سے ہونی چاہیے۔ دراصل اس مشاعرے کے بانی ہمارے محترم دوست مولانا محمد یوسف صاحب رنجور جعفری چیف مولوی بورڈ آف ایگزامنرس کلکتہ تھے۔ جنہیں ناظرین الپنچ۔ سے متعارف کرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

۱۹ جون ۱۹۰۲ء کو مولوی صاحب ممدوح نے ایک اطلاعی رقعہ شائع کیا۔ جس کی مطلّا اور مذہّب چھپائی در پردہ مسّرت اور سرور کا پتہ دے رہی تھی۔ اس رقعے میں ظاہر کیا گیا تھا کہ ایسے موقع میں کہ تقریباً تمام دنیا میں ہر ایک اہل فن اور اہل علم نے اپنے اپنے طریقے پر اظہار مسّرت کا اہتمام کر لیا ہے۔ شعرائے کلکتہ کچھ حصّہ نہ لیں یہ ایک افسوس ناک امر ہے۔ اس لیے ۲۵ جون ۱۹۰۲ء شب پنج شنبہ کو راقم نے ایک مجلس مشاعرہ جناب مولوی عبدالباری صاحب رئیس کلکتہ کے مکان پر ترتیب دی ہے شعرا تشریف لائیں، اور اپنی مسّرت کا علمی ثبوت دیں معمولی غزل خوانی کے لیے "رات دن ہائے جگر ہائے جگر کرتے ہیں"۔ مصرع طرح دیا گیا تھا۔

تاریخ مذکور کو مشاعرے کا اہتمام کیا گیا، اور ایشیائی طریقہ نشست کے موافق تکیوں اور فرش کا خاصہ انتظام تھا۔ رقعہ میں آٹھ بجے مشاعرے کے آغاز کا وقت دیا گیا تھا۔ مگر دس بجے تک کوئی صاحب تشریف نہ لائے کیوں کہ ہندوستانی تہذیب نے وقت کی پابندی کا سبق ہی نہیں دیا ہے۔ وعدے سے ایک دو گھنٹے کا فرق کوئی فرق خیال نہیں کیا جاتا۔ خیر دس بجے سے کچھ لوگ آنے لگے، اور ساڑھے دس بجے

الپنچ - بانکی پور (پٹنہ) ۵ جولائی ۱۹۰۲ء - بحوالہ اردو ادب علی گڑھ - (آزاد نمبر)

تک مجمع ہو گیا۔ مشاعرے سے قبل جیسا کہ رقعے میں لکھا گیا تھا تہنیت تاج پوشی کی تاریخیں اور قصیدے پڑھنے تھے مگر چوں کہ شاہنشاہ عالم پناہ کی علالت کی دن کو خبر پہنچ چکی تھی، اور ولایت میں جشن موقوف کر دیا گیا تھا۔ اس لیے سب سے پہلے جناب مولوی محمد یوسف صاحب جعفری نے کھڑے ہو کر بیان فرمایا کہ چوں کہ یہ خبر وحشت اثر کہ حضور شاہنشاہ عالم پناہ علیل ہیں اور جشن موقوف کیا گیا اس وقت ہم لوگوں کی طبیعت کو پژمردہ کر رہی ہے، اس لیے مناسب یہ ہے کہ آج قطعات کا پڑھنا موقوف کیا جائے، اور اس کا انتظار کیا جائے جب کہ عنقریب ہی حضور کی صحت کی فرحت اثر خبر ہمارے دلوں کو شاد کر دے گی۔ اس کے بعد جناب مستطاب آقا کاظم صاحب شیرازی کھڑے ہوئے فارسی میں اول اس خبر پر افسوس کیا پھر مولوی صاحب کی رائے سے اتفاق کیا۔ ان کے بعد جناب مولوی غلام یٰسین صاحب آہ دہلوی کھڑے ہوئے اور دیر تک گہر ریزی فرماتے رہے۔ آپ کے بیان کا خلاصہ یہ تھا کہ اللہ کی صفتوں میں رحیمی کی صفت بڑی اعلیٰ صفت ہے جن لوگوں میں یہ صفت ہوتی ہے اس تعلق کی وجہ سے ان کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ ہماری گورنمنٹ جب کہ ہم پر آزادی کے ساتھ سلطنت کرتی ہے، اور ایک حد تک رحیمی کی صفت رکھتی ہے تو ضرور ہے کہ ہم بھی اس کے رنج اور خوشی میں شریک رہیں۔ ان کے بعد ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی کھڑا ہوا، اور آدھ گھنٹے تک لکچر دیتا رہا۔ اس نے اول ابتدائے عالم سے آج تک کی ایک مختصر تاریخ بیان کر کے کہا کہ غالباً تمام بادشاہان وقت میں اس کی نظیر نہ ملے گی کہ باوجود اختلاف مذہب اور اختلاف قومیت اور اختلاف وطنیت کے اس آزادی کے ساتھ سلطنت کی ہو جیسے اس گورنمنٹ کی خاص آزادی اور اہل ہند کی جانب توجہ ہے، اور میری رائے بھی یہی ہے کہ قطعات تہنیت وغیرہ آج رات موقوف رکھے جائیں، اور انشاءاللہ وہ وقت بہت قریب ہے۔ جب کہ ہم آپ اسی طرح ایک جگہ جمع ہو کر صحت کی خوشی میں قطعات اور تاریخیں سنائیں گے، اور جشن کریں گے۔ یہ رائے تمام اہل جلسہ نے قبول کی اور مشاعرہ شروع ہوا۔ ابتدا میں اکثر صاحبوں نے غزلیں سنائیں اور جیسا کہ قاعدہ ہے اپنے کلام کے موافق داد لی۔ اتنے میں جناب شمس اور جناب

حمید صاحبان اور جناب شہرت عظیم آبادی تشریف لائے۔ اور ایک دو صاحبوں کے بعد ہمارے یک رنگ دوست جناب مولوی رضا علی وحشت نے غزلیں سنانی شروع کیں۔ ابتدا میں انھوں نے چند فارسی کی اور اردو کی رباعیاں سنائیں جن کا مزا کوئی آزاد ہی کے دل سے پوچھے۔ رباعیوں کے بعد انھوں نے اپنی فارسی کی غزل پڑھی جس کا ہر شعر لاجواب اور لطف زبان میں ڈوبا ہوا ہے۔

ارادتے کہ مرا با تو ہست میدانی ۔۔۔ محبتیکہ ترا با من ست می دانم
مرا تو دوست شماری برچہ مے گوئی ۔۔۔ کہ دوستی تو با دشمن ست می دانم
بہ بزم او تپش دل بلا سبب نہ بود ۔۔۔ نگاہِ برق سوے خرمنست می دانم
ادائے او پے فہمیدست می فہمم ۔۔۔ جفائے او پے دانست ست می دانم
بہ وحشت ایں ہمہ لطفش بلا سبب بود ۔۔۔ ادائے تازہ دل بردنست می دانم

اس کے بعد انھوں نے اردو کی دو غزلیں سنائیں جن کے چار شعر یاد رہ گئے ہیں۔

جان ان کی اداؤں پہ نکلتی ہی رہے گی ۔۔۔ یہ چھیڑ جو چلتی ہے تو چلتی ہی رہے گی
گرمی سوزش، دل مرگ سے ناچار نہیں ۔۔۔ نالہ مرغ گرفتار، گرفتار نہیں!
حسن یہ تیرے کرشمے ہیں کہ با ایں ہمہ شوق ۔۔۔ طاقت دید نہیں قوت گفتار نہیں
چاہتے ہو کہ میں پھر کھاؤں فریب غمزہ ۔۔۔ لب اقرار کہاں ہے اگر انکار نہیں

پھر اس طرح کی دو غزلیں سنائیں جو بہت ہی خوب اور زبان و مضمون دونوں کا لطف لیے ہوئے تھیں۔ اہلِ مجلس نے بھی خوب دل کھول کر داد دی، اور اس طرح ان کی غزل خوانی ختم ہوئی۔ ان کے بعد اور بہت سے صاحب غزلیں سناتے رہے، مگر چوں کہ ان میں سے اکثر حضرات سے میری شناسائی نہیں ہے اس لیے نہ تو نمونہ کلام دے سکتا ہوں، اور نہ ان کا نام لکھ سکتا ہوں۔ امید ہے کہ وہ اصحاب معاف فرمائیں گے، ان کے بعد ہمارے مکرم جناب منشی ابد صاحب نے نہایت عمدہ نعتیہ غزلیں پڑھیں جن کے ہر ہر شعر سے محبت نبوی روحی فداہ کی بو آتی تھی۔ سبحان اللہ کیا عمدہ کلام ہے۔ ان کے بعد محبی جناب سید حسین سلیم لکھنوی نے ایک دو رباعیاں، اور زبان کے رنگ کی غیر طرح نہایت ہی پُر لطف غزل سنائی جس کے چند اشعار اپنی عمدگی کے سبب سے اس وقت تک ہماری زبان پر جاری ہیں۔

دل مانگتے ہو مجھ سے بہلا کے بھولے پن میں
کیا میں نہیں سمجھتا شاطر ہو اپنے فن میں

بس، بس ہوائے غربت اب روکنا نہ بن میں
مضطر ہیں دوست میرے، میرے لیے وطن میں

دِل اُن سے کھیلتا ہے وہ دِل سے کھیلتے ہیں
وہ مست بالے پن میں یہ مست بھولے پن میں

ان کے بعد (خاکسار) ابوالکلام آزاد کی باری تھی۔ جیسا کہ مشاعرے کا دستور ہے میں نے بھی چند رباعیاں فارسی اور اُردو کی لکھی تھیں، مگر غلطی سے وہ کاغذ ضائع ہو گیا اور رباعیاں نہ سُنا سکا۔ ایک رُباعی اِس وقت یاد آگئی ہے۔ ناظرین کے مطالعے کے لیے پیش کرتا ہوں:

در دہر ز لطف او نہ شد طبعم سیر — بر بالا ردم کہ خود نہ بالاست نہ زیر
اے عمر برو برو کہ یاد تو زیاد — اے مرگ بیا بیا کہ یاد تو بخیر

اور فارسی کے چند شعر جو مشاعرے سے کچھ پہلے لکھے تھے اس کے بعد سنائے۔ جن میں سے پانچ شعر یہ ہیں:

کنی ز گریہ اگر منع چشم گریاں را — رواں بود کہ ندیدی شبانِ ہجراں را
توانم آں کہ کنم ضبط آہ و افغاں را — مگر علاج بگو چیست چشم گریاں را
الٰہی چشم فسوں ساز را چہ مستی ہاست — کہ مست و بے خبر انداخت ہوشیاراں را
دریں مشاعرہ حرفم نمی تواں فہمید — چہ طور گویم الٰہی بیانِ پنہاں را
برو برو تو طبیبا! چرا بہ من آئی — بغیر مرگ دوا نیست دردِ ہجراں را

اس کے بعد میں نے اپنی دوسری فارسی کی غزل (کمالات ایں خیالات ایں) کے چند اشعار پڑھے، اور ان دونوں فارسی غزلوں پر تمام اہلِ مجلس نے بالعموم اور جناب شمس صاحب نے بالخصوص ذرہ نوازی کا ثبوت دیا، پھر ایک اردو غزل تازہ افکار کے چند شعر پڑھے۔ جس کے چند شعر یہ ہیں:

ان شوخ حسینوں کی ادا اور ہی کچھ ہے
ایسوں کی اداؤں میں مزا اور ہی کچھ ہے۔

یہ دل ہے مگر دل میں بسا اور ہی کچھ ہے
دل آئینہ ہے جلوہ نما اور ہی کچھ ہے
ہم آپ کی محفل میں نہ آنے کو نہ آتے
کچھ اور ہی سمجھے تھے ہوا اور ہی کچھ ہے
بے خود بھی ہیں ہشیار بھی ہیں دیکھنے والے
اِن مست نگاہوں کی ادا اور ہی کچھ ہے
آزاد ہوں اور گیسوے پیچاں میں گرفتار
کہ دو مجھے کیا تم نے سنا اور ہی کچھ ہے

اب میں طرحی غزل پڑھنے ہی کو تھا کہ میرے دوست جناب سید اخلاق حسین صاحب اخلاق دہلوی جو مشاعرے کے دن دہلی سے آئے ہوئے تھے، فرمانے لگے کہ ذرا مشاعرۂ گذشتہ کی غزل بیمار کے آگے، طلب گار کے آگے ردیف و قافیہ والی پڑھ دیجیے، میں نے انکار مناسب نہ جانا، اور اس غزل کے بھی چند اشعار پڑھ کر سنائے۔ اہلِ محفل نے خوب ہی داد دی، طرحی غزل پڑھنے سے پہلے میں نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا کہ یہ غزل میں نے جس بے سروسامانی میں لکھی ہے اس کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مطلع تک ابھی نہیں لکھا، جو لکھا ہے سنائے دیتا ہوں کیوں کہ میں بعض علمی تالیفات کا شغل چھوڑ کر اس فضول شغل کو اختیار نہیں کیا کرتا۔ میرے تمام اشعار پر اہلِ محفل نے خوب دل کھول کر داد دی، اور بالخصوص ہمارے مکرم جناب شمس اور جناب حمید وغیرہ اول سے آخر تک داد دیتے رہے، یہ ان صاحبوں کی عنایت ہے، ورنہ میں کیا میری حقیقت کیا، میرے بعد جناب مولوی غلام یٰسین صاحب آہ دہلوی نے باوجود علالت طبع کے بعض دوستوں کے اصرار سے غزل پڑھنی شروع کی، اول ایک دو واقعی رباعیاں جن میں کچھ اپنی علالت کا اظہار کیا گیا تھ سنائیں اور اس کے بعد ایک عجیب و غریب پُر لطف غزل جو بندش مضمون، زبان ہر حیثیت سے قابل داد اور صاد ہے۔ پڑھ کر اہلِ محفل سے خوب داد لی اور واقعی بات ہے بھی یوں ہی کہ عمدہ شعر داد لے کر ہی چھوڑتا ہے گو انسان کیسا ہی ضبط کیوں نہ کرے۔ وہ دو رباعیاں یہ ہیں :

یہ آپ سے کیا کہوں کہ اب کیسا ہوں | اللہ کا شکر ہے کہ میں زندہ ہوں
ہوں مسلسل بول و دردِ سر سے رنجور | رنجور کے اصرار سے یاں آیا ہوں

ولہ

بیداری شب سے تپ بڑھا کرتی ہے | اور فکر یہ تکلیف سوا کرتی ہے
سب کچھ مانا مگر کہاں تک انکار | ہر چیز کی ایک حد ہوا کرتی ہے

پھر جناب معلی القاب نواب محمد ابراہیم علی خاں صاحب والی ٹونک کی غزل کا مخمس سنایا جس کی تعریف جس قدر کی جائے کم ہے۔ بالخصوص اس شعر کا بند کہ :

ہاروں کے بھیجتے ہی بنے وہ گلے کے ہار
گوندھے ہوئے تھے کیا کسی اچھی لگن کے پھول

طرحی غزل بھی ہر صورت سے قابل داد ہے۔ ہر شعر لاجواب، اور ہر مطلب دلچسپ واہ واہ، سبحان اللہ۔ ان کے بعد ہمارے محترم دوست جناب مولوی محمد یوسف صاحب جعفری بانی مشاعرہ نے (چوں کہ صبح قریب ہو چکی تھی اور بہت سے لوگ باقی تھے) صرف اپنی طرحی غزل سنائی جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ بالخصوص مطلع اول "بدر و دگر" کا قافیہ کس عمدگی اور چستی کے ساتھ نظم کیا گیا ہے۔ واقعی یہ انھیں کا حصہ ہے۔ جو کچھ کہا جائے کم ہے کیوں نہ ہو، آخر ایک عرصے کی مشق اور اس پر علمیت ! واہ واہ !

مولوی صاحب کے بعد مکرم جناب مولوی محمد صاحب شمس رئیس کلکتہ کی باری تھی آپ نے اوّل اپنی بحر طویل کی غزل پڑھ کر سنائی۔ جس کی جس قدر تعریف کی جائے تھوڑی ہے اور خاص کر یہ مطلع

روئے وہ زار زار سوئے مزار دیکھ کر | دل کے غبار دھل گئے مجھ کو غبار دیکھ کر

پھر ہونا ہوگا، جانا ہوگا، کی پر لطف غزل سنا کر حاضرین کو محظوظ فرمایا۔ اس کے بعد طرحی غزل سنائی، جو اپنی نوعیت میں بالکل نرالی تھی واہ کیا کہنا۔ سبحان اللہ !!

ان کے بعد جناب شہرت عظیم آبادی نے چند رباعیوں کے بعد دم لے لو قدم لے لو۔ کی استادانہ غزل سنا کر خوب ہی داد لی۔ اور طرحی غزل کا کیا کہنا۔ سبحان اللہ۔

ان کے بعد مکرم جناب حافظ عبدالحمید صاحب حمید نے نہایت ہی عمدہ اور دلچسپ دو تین فارسی کی رباعیاں سنائیں، اور ایک تصوفانہ بے مثل غزل پڑھ کر۔ طرحی غزل پڑھنی شروع کی۔ حافظ صاحب ایک قابل شخص ہیں۔ ان کے ہر شعر۔ ہر مصرعے سے قابلیت کا رنگ ٹپکتا ہے۔

صبح ہوگئی تھی تقریباً پانچ بج گئے تھے۔ مشاعرہ ختم ہوا۔ واہ کیا اچھی مجلس تھی کیسے کیسے باکمال رونق افروز تھے۔ کیا کیا شعر پڑھے گئے۔ کس کس رنگ کے اشعار سنائے گئے۔ ہر گلے را رنگ و بوے دیگر ست، کا یہ مشاعرہ کتنا اچھا مصداق تھا، واقعی جلسے کے ایسے ہی فوائد ہیں، ورنہ کہاں ہم، کہاں شمسؔ اور کہاں حمیدؔ۔ ہاں۔

اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

اے مشاعرے! اے ہمارے دلوں کو زندہ کرنے والے اے ایشیائی شاعری کے جنازے کو دھوم سے نکالنے والے! خدا تجھے زندہ رکھے۔ باسلامت رکھے۔ باکرامت رکھے۔ تجھ پر اتفاق کا سایہ اور تیرا شاعروں پر سایہ رہے۔ زمانہ ہم سے پھر جائے مگر تو ہم سے نہ پھریو، تو ہم کو نہ بھولیو" تیرا ہی ایک آسرا ہمیں ابھی ایشیائی شاعری کا نام لیوا بنا رہا ہے۔ تیرا ہم پر کرم ہے تو ہمارا بول بالا ہے۔

راقم خادم احباب

ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی

مقیم کلکتہ

حکیم خاقانی شروانی

شعراے فارس کے تذکرے اگرچہ فارسی زبان میں بہت سے لکھے گئے، اور اکثر مشہور شعرا کے حالات ہر ایک تذکرہ نویس نے قلمبند کیے مگر سچ پوچھو تو جامعیت کا اطلاق ایک تذکرے پر بھی نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان میں آزاد بلگرامی نے "خزانۂ عامرہ" بڑی محنت سے لکھا تھا، اور دعویٰ کیا تھا کہ کم وبیش تمام خوش گو شعراے فارس کے حالات اس میں جمع کیے گئے ہیں مگر دیکھنے والوں نے دیکھا تو سواے مشہور شاعروں کے حالات کے اور کچھ نہ پایا۔ اور یہ کچھ الزام آزاد ہی پر نہیں ہے بلکہ تمام تذکروں کی یہی کیفیت ہے۔ حال میں علامہ ہدایت نے ایک ضخیم تذکرہ "مجمع الفصحاء" کے نام سے ایران میں لکھا ہے اور وہیں چھپا بھی ہے۔ ہم نے اسے بھی اول سے آخر تک چھان ڈالا۔ بہت سے شاعروں کے حالات نظر نہ آئے۔ خیر یہ تو حال فارسی تذکروں کا ہے، اردوے معلیٰ تو اپنے شاعروں کے تذکروں سے محروم تھی یہ تو پروفیسر محمد حسین آزادؔ کی عنایت ہے کہ انھوں نے آبِ حیات لکھ کر کلنک کا ٹیکہ مٹا دیا۔ ہم نے یہ حال دیکھ کر ایک تذکرۃ الشعراء کی بنا ڈالی ہے اور کوشش کی ہے کہ اس میں جامعیت کا لطف پیدا کیا جائے۔ ساتھ ہی پرانی طرز کو ترک کر کے سوانح عمری کے طور پر حالات لکھنے کا اہتمام کیا ہے، اور مختلف مقامات سے تذکرے جمع کر کے پہلی جلد تالیف کی گئی ہے۔ جس میں سے نمونے کے طور پر حکیم افضل الدین خاقانی کی لائف ناظرین مخزن کی دلچسپی کے لیے پیش کی جاتی ہے۔

ابوالکلام آزاد دہلوی از کلکتہ

زدیوان ازل منشور کاوّل درمیاں آمد — امیری جملہ رادادند سلطانی بہ خاقانی
برائے حجتِ معنی براہینے پدید آمد — ز لشت آرزو صفت علی نجار شروانی

مخزن لاہور بابت ماہ اگست ۱۹۰۲ء جلد ۳ نمبر ۵۔

آج ہم اس افصح الفصحا اشعر الشعرا کے حالات درج کرتے ہیں جو چرخ فصاحت کا بلند پرواز شہباز تھا۔ اور نیستان بلاغت کا ایک دلیر شیر تھا جس نے نہ صرف نظم پارس میں فصاحت و بلاغت کی روح پھونکی بلکہ اس کو نازک خیالی کے بوتہ میں ڈال کر کدورتوں سے صاف کیا اور ایسا صاف کیا کہ اس کی چمک دمک پر سیکڑوں کی نظریں پڑنے لگیں۔ اور جس جوان مرد سخن نے نظم پارس کو رباعی اور غزل کی قید سے آزاد کر کے ترقی کے اعلیٰ مینار پر پہنچا دیا۔

اس شیر بیشۂ بلاغت کا نام نامی حکیم افضل الدین ابراہیم بن علی النجار شروانی ہے۔ اصل آبائی وطن اس کا بیلقان ہے لیکن زیادتی سکونت کے سبب سے شروانی مشہور ہو گیا۔ رشید الدین وطواط و اثیر وظہیر اور فخر الدین و شاہ پور و کمال الدین کا ہمعصر ہے لیکن اپنے کمال کے سبب سے بدرجہا فوقیت لے گیا۔ اس کی صحیح تاریخ ولادت باوجود تحقیق و تجسس بسیار نہ معلوم ہوئی۔ تذکرہ مرأۃ الخیال، خزانۂ خیال، خزانۂ عامرہ، تذکرۂ دولت شاہ، ریاض الشعرا، علامہ قہستانی، آتش کدہ، تذکرہ مجمع الفضلا۔ ماثر الامراء، صبح صادق، گلزار عجم۔ ارمغان شعرا، یادگار شعرا، تحفۃ العجم، کلام مقبول، یادگار ناظم وغیرہ وغیرہ تمام تذکرے چھان ڈالے مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ مجمع الفصحا مطبوعہ ایران تالیف علامہ فخر المتاخرین رضا قلی خاں ہدایت سے اتنا پتہ بے شک چلتا ہے کہ پانچویں صدی کے اوائل میں یہ صبح صادق کا چمکتا ہوا تارہ عالم اجسام کے آسمان پر نمودار ہوا۔ اور اہل عجم کے لیے نیّر اعظم ہو کر چمکا۔ جس کی روشنی نے نہ صرف مشرق ہی کو روشن کیا بلکہ اپنی تیز شعاعوں سے اہل مغرب کی آنکھیں بھی روشن کر دیں۔

ہمارے نامور ہیرو کے والد کا پیشہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا۔ غالباً نجاری تھا۔ کیا عجب ہے کہ آبا و اجداد کا یہی پیشہ ہو۔ مگر اس کے بارے میں تمام تذکرہ نویس خاموش ہیں۔

جب ہمارا ہیرو سن تمیز کو پہنچا تو تحصیل علوم ضروری کے بعد اپنے خسر اور واجب التعظیم بزرگ ابو العلائی گنجوی کی خدمت میں حاضر ہو کر علوم ادبیہ اور حکیمہ حاصل کرنے لگا۔ طبیعت کی موافقت اور ذہن کی رسائی تو فطری تھی۔ پھر استاد کامل اور شفیق ملا۔ دن دونی رات چوگنی ترقی ہونے لگی، اور تھوڑے ہی عرصے میں

فضل وکمال کا دریا بہا دیا۔

انسان کا قاعدہ ہے کہ جس قسم کی سوسائٹی میں وہ ہوش سنبھالتا ہے، اور جس قسم کی باتوں میں آنکھیں کھول کر اپنے کو بتلا دیکھتا ہے، اسی طرف اس کا قلبی رجحان ہوتا ہے۔ اس زمانے میں شاعری کی مارا مار تھی، اور تمام علوم میں شاعری کو افضل سمجھا جاتا تھا۔ فردوسی اور اس کا شاہنامہ، محمود غزنوی کی حکایتیں اور اس کا دربار اس زمانے میں ایسا تھا جیسے آج کل غالب و ذوق اور مرحوم بہادر شاہ۔ جیسے آج کل ان کی حکایتیں مشہور و معروف ہیں، اور ان کے دیکھنے والے ابھی تک موجود ہیں، اسی طرح اس زمانے میں فردوسی اور محمود غزنوی کی حکایتیں زبان زد خاص و عام تھیں۔ ہر ایک شخص کو شاعری کا شوق و ذوق تھا، اور اسی خیال میں سرمست تھا۔ جس علمی مجلس میں جاؤ وہاں منطق اور فلسفہ کی پریشاں کن دماغ بحثوں کی بجائے شاعری کی خوش کن بحثیں ہوتی ہوئی نظر آئیں گی۔ جس دربار میں پہنچو سب اسی شاعری کے دلکش راگ گاتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ خون لگا کے شہیدوں میں داخل ہونا آج ہم کہتے ہیں لیکن اس مثل کا سچا مصداق وہی زمانہ تھا اور یہی نہ تھا کہ لوگ شہیدوں میں داخل ہو جاتے تھے بلکہ شہید ہو بھی جاتے تھے۔ ہر ایک شخص یہی چاہتا تھا اور اعلیٰ سے اعلیٰ، خدا تعالیٰ سے اس کی یہی دعا ہوتی تھی کہ میں فردوسی ہو جاؤں۔

الغرض ایسے زمانے میں جب کہ اسلام کا نیر اقبال نصف النہار پر تھا، اور خاندان سلجوقی کا دوَر دوَرہ تھا، اور اس خاندان عالی شان پر فن شاعری کا راج تھا۔ ہمارے نامور ہیرو نے علم و فضل حاصل کیا، اور علامہ ابوالعلائی گنجوی سے اکتساب فیضان کیا، جیسا کہ ضرور تھا، بعد فراغ کتب درسیہ اس کو شاعری کی طرف میلان ہوا جس پر زمانہ مٹا ہوا تھا اور جس سودا میں ہر خویش و بیگانہ مست نظر آتا تھا۔

اُستاد کی رائے:

باکمال اُستاد نے بھی دیکھا کہ نوجوان طالب علم ہے، اور ذہین طبیعت کی شوخی بتا رہی ہے کہ شاعری کے پردے میں اپنا رنگ دکھلانا چاہتی ہے، اور کسی کے روکے کب رُکے گی، بن دکھائے نہ رہے گی، اور یقیناً دکھائے گی۔ کبھی کسی باکمال

کی ہجو ہوگی۔ کبھی خشک زاہدوں کی مٹی خراب ہوگی، اور ایسے برے طور سے کہ توبہ ہی بھلی، کبھی واعظوں، ناصحوں اور عشاق پر پھبتی اڑے گی، اور اس میں بال کی کھال کھینچی جائے گی، پس خداداد موج کی روکنا ایک تو غیر ممکن ہے، اور چلتی ندی میں کچھ اٹکا بھی دیا تو نتیجہ اس کا خراب ہے۔ بہتر ہے کہ اسی فن کی جانب میلان اس کا اور بڑھا دیا جائے۔

ہمارے ہیرو نے جب اپنے شفیق استاد کا اشارہ پایا تو اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ بھر کیا تھا ادھر تو پہلے ہی سے اشتیاق سے بھری آنکھیں حکم کی منتظر تھیں فوراً حقائقی تخلص تجویز کر کے کچھ اشعار لکھے اور اس زمانے کے مشہور شاعر فلکی سے شاگردی کر کے اصلاح لینی شروع کر دی۔

شاعری سے طبع کی مناسبت:

شاعری کی آگ تو پہلے ہی سے طبیعت میں موجود تھی، لیکن علوم درسیہ کے مشاغل کے سبب سے کچھ دنوں خاک تلے دبی رہی، جب تحصیل سے فارغ ہوا، اور استاد کو بھی موافق دیکھا وہ آگ ایک شعلہ زرفشاں کی صورت میں بھڑکی اور بھڑکتے ہی گلزار ابراہیمی کی بہار دکھلانے لگی۔ پھر تو اس کے تر و تازہ گلابی۔ خوشبودار، خوش رنگ، خوش نما پھولوں کی مہک نے تمام ملک سخن کو معطر کر دیا، اور زبان حال سے وہ تر و تازہ گلشن سخن کو مخاطب کر کے کہنے لگا کہ۔

اے گلشن سخن کے ہوا خواہ شایقو ۔۔۔۔ آؤ آؤ، بہار بے خزاں کے مزے لوٹو[۱]

قسمت کی رسائی تو دیکھو:

جب یہ شہرت سخن عالمگیر ہوئی، اور لوگ اس کے کمالات سے واقف ہونے لگے تو غلغلۂ کمال سلجوقی خاندان کے نامور قدردان سخن پادشاہ خاقان کبیر منوچہر الپ ارسلاں سلجوقی شاہ شاہ شیروان تک پہنچا۔ اور وہ اس باکمال حقائقی کی جانب متوجہ ہوا۔ اس نے بھی اس توجہ کو غنیمت خیال کیا، اور قصائد مدحیہ لکھ کر خاقان کبیر کے دربار میں حاضر ہوا۔ اور قصائد نذر گزرانے، اقبال نے ہاتھ پکڑا، اور قسمت نے

۱؎ اصل میں یہ مصرع اسی طرح ہے جو صریحاً سہو کتابت ہے، ممکن ہے یوں ہو:

آؤ مزے بہار گلستاں کے لوٹ لو

یاوری کی ۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ اس سلجوقی دربار میں اس کا وہ رسوخ ہوگیا جو فردوسی کو محمود کے دربار میں یا ابوالفضل کو اکبری دربار میں تھا ۔ بلکہ اس سے بھی بدرجہا زیادہ ۔

زمانہ چاہتا تھا اور فردوسی و محمود کی کیفیت سُن سُن کر خواہش کرتا تھا کہ ہم فردوسی ہوں اور کوئی محمود سا قدر دان ملے ، ظاہر ہے کہ حسب خیال زمانہ حقائقی کو بھی کبھی اس کا خیال ہوا ہوگا لیکن اپنی حیثیت یا کسی اور ناکامیابی کے خیال سے یہ نتیجہ نکالا ہوگا کہ ایسا ناممکن خیال سوائے اس کے کہ دل کو خوش کرے اور کامیابی کا خوش نما پہلو نہیں رکھتا لیکن قسمت کی یاوری نے دکھا دیا کہ کچھ محمود اور فردوسی ہی پر موقوف نہیں ہماری مدد چاہیے پھر تو کیسا ہی ناقدردانی کا زمانہ کیوں نہ ہو ، ایک چھوڑ پچاس فردوسی اور محمود ہو سکتے ہیں ۔

قسمت کی نصیحت اور پیشین گوئی :

دیکھو ! ہمارے مشکور ہو ، ہم نے تمہیں فردوسی وقت بنا دیا ، اور پھر اس سے تمہارا وقار اور تمہاری عزت دربار میں زیادہ ہے ۔ خاقان کبیر کو محمود وقت بنا دیا مگر اس کی محبت اور شفقت تم پر بہ نسبت محمود فردوسی کے زیادہ ہے ۔ دیکھو ! خبردار ۔ خبردار ! فردوسی سا غرور نہ کرنا ورنہ وہی حال ہوگا جو فردوسی کا ، اسی قدردان اور مشفق محمود غزنوی کے ہاتھوں ہوا تھا ، اور آخر کار وہ بڈھا فاضل طوسی یہی کہتا ہوا دل کی بھڑاس نکالتا تھا ۔

چہ سی سال بردم بہ شاہنامہ رنج	کہ تا شاہ بخشد مرا تاج و گنج
اگر شاہ را شاہ بودے پدر	بسر بر نہادے مرا تاج زر
چو اندر تبارش بزرگی نہ بود	نیارست نام بزرگاں شنود

دیکھو ، تمہیں کہیں یہ لکھنے کی ضرورت نہ ہو ! قدرت کے ہاتھ سے کسے چارہ ، آخر وہی ہوا جو قسمت مقدس نے پیشین گوئی کی تھی ۔

خاقانی تخلص دربار شاہی سے عطا ہوتا ہے :

اب تو کچھ اور ہی عالم نظر آتا تھا ، روز و شب مدحیہ قصائد لکھے جاتے ہیں اور صلے میں ہزاروں روپے عطا ہو رہے ہیں ۔ چنانچہ خاقان کبیر کے ہاں مقرر تھا کہ فی قصیدہ ایک ہزار درم صلے میں دیا جائے ، اور زر و جواہر اس کے علاوہ ہیں !!!

لسان الغیب نے کیسا ہی سچ کہا ہے مع

قبول خاطر لطف سخن خدا داد ست۔

ہمارے اس نامور ہیرو کا تخلص پہلے تو "حقائقی" تھا۔ لیکن شاہ خاقان کبیر نے خاص اپنی عنایت بے غایت کے ثبوت میں "خاقانی" تخلص عطا فرمایا۔ تقدیر پکاری" ہاں، یا! ایہا الشاعر!" خاقان کبیر اپنی مملکت کا بادشاہ اور خاقان ہے تو تم ملک سخن کے بادشاہ اور خاقانی ہو۔ اللہ مبارک کرے۔ ہمارے اس حقائقی کے زمانۂ عروج میں خیال کیا جاتا تھا کہ وہ "حکیم افضل الدین ابراہیم بن علی شاہ مملکت سخن محبوب خاقان کبیر خاقانی اعظم ہے۔

غرور اور بے ادبی:

قاعدہ ہے کہ کمال کے ساتھ غرور بھی آجاتا ہے۔ خصوصاً فن شعر کا تو خاصہ ہے کہ جہاں اس میں کمال ہوا وہیں کم بخت غرور نے آلیا۔ میر و سودا کا بھی یہی حال تھا۔ ایسے کریم النفس بہت کم نکلیں گے جنھیں نام کو بھی غرور نہ ہو۔ بدقسمتی سے خاقانی کے دل میں بھی غرور آگیا کہ ہم وہ ہیں کہ قبولیت سخن میں سب ہم سے کم تر ہیں۔ دربار میں وہ وقعت ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ عامل یا حاکم کو نہیں ہے:" اس خیال لغو کا آنا تھا کہ خاقانی کا رنگ ہی بدل گیا، اور کسی کو اپنی نظر میں لانا ہی چھوڑ دیا۔ پہلے پہل اپنے استاد معظم علامہ ابوالعلائی گنجوی سے دو۔ دو ہاتھ کی ٹھہرا دی۔ بھلا ہمارے یہاں کے نصیر و ذوق کی لڑائی کیا حقیقت رکھتی ہے، ایسی تُو تُو مَیں مَیں ہوئی کہ توبہ ہی بھلی، اس تُو تُو مَیں مَیں کے سبب حکیم افضل الدین خاقانی نے علامہ ابوالعلائی گنجوی کی اور ہائے ہائے اپنے استاد کی "ہجو" لکھی اور بُری لکھی۔ اگرچہ اُدھر سے بھی جواب کی ٹھہرائی گئی، لیکن اِدھر کی زیادتی خلق میں مشہور ہوگئی۔ خاقانی کے ہوا خواہ کہتے ہیں کہ پہلے ابوالعلائی کی جانب سے چھیڑ ہوئی۔ اول تو یہ بالکل خلاف ہے، مگر ہم مان لیتے ہیں کہ اچھا اسی جانب سے پہلے پہل چھیڑ سہی؟ لیکن ابوالعلائی کا خاقانی کون تھا؟ شاگرد تھا۔ بس اگرچہ ابوالعلائی نے پہلے زیادتی کی ہو مگر خاقانی کو ہرگز ہجو نہ لکھنی چاہیے تھی۔ جو کچھ ہوا آخر استاد تھا۔ حضرت امیرالمومنین علیؑ فرماتے ہیں کہ جس نے مجھ کو ایک حرف بھی سکھایا ہے تو وہ میرا آقا ہے، میرا مولا ہے، میں اس کا غلام

ہوں !! مقام غور ہے کہ ابوالعلائی تو وہ شخص تھا جس نے اسے خاقانی بنادیا۔ اس کو بچپن سے پڑھاتے پڑھاتے فراغت کرائی۔ تمام علوم درسیہ کی جس کی خدمت میں اور جس زبان سے خاقانی نے تحصیل کی، وہ ابوالعلائی کی خدمت اور اسی ابوالعلائی گنجوی کی زبان تھی، کہاں تو ایک حرف کی تعلیم سے معلّم آقا کی بجائے ہوجاتا ہے۔ اور ابوالعلائی نے تو دفتر کے دفتر خاقانی کو سکھائے تھے۔ بھلا کیا وہ اس لائق بھی نہ تھا کہ اپنے بڑوں کا جیسے زبانی ادب ہوتا ہے ویسا ہی اس کا بھی کرتا، اور اس کے حق میں بدزبانی نہ کرتا، ادب ایک ایسی چیز ہے کہ انسان کو فضائل کا منبع بنا دیتی ہے۔ ہمارے روحانی بزرگوں سے کیسے کیسے ادب کے کام سرزد ہوئے ہیں۔ کہ آدمی انھیں بلامبالغہ مبالغہ کہہ دے، حالانکہ وہ واقعی سچی باتیں ہیں۔ صرف دل سمجھنے والا اور دماغ غور کرنے والا ہونا چاہیے۔ حدیث میں ماں باپ کے ادب کا ضروری ہونا اور ان کی رضامندی کا باعث نجات ہونا اس پیرایۂ لطیف میں بیان کیا ہے کہ ماں باپ کے پاؤں تلے جنت و دوزخ ہیں۔ سمجھ لو کہ ان کی رضامندی باعث عطائے جنت اور ناراضگی باعث جہنم ہوگی۔ مولانا روم کہتے ہیں، اور کیا خوب کہتے ہیں۔

از خدا خواہیم توفیق ادب — بے ادب محروم ماند از لطفِ رب
بے ادب تنہا نہ خود را داشت بد — بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد

قسمت کی پیشین گوئی ٹھیک آئی :

الغرض مقدس قسمت کا کہا ٹھیک اترا، اور اسے اپنے استاد کی ہجو نویسی کا اثر ظاہر ہونے لگا۔ اقبال کا چمکتا ہوا ستارہ ڈوبنے لگا، اور تقدیر کی بلندی کا آفتاب غروب ہونے کو آیا۔

اُستاد کی بے ادبی کا نتیجہ بھی بُرا پایا :

خاقانی کی عمر اب زیادہ ہو چلی تھی، اور اب باعتبار سن و بہ تقاضائے وقت حسب قاعدہ کچھ اور ہی رنگ چڑھ گیا تھا۔ طبیعت میں حقائق و معارف کا دریا جوش زن تھا۔ بات یہ ہے کہ شاعری کے کمال کی آخری سیڑھی حقیقی عشق ہے، اور مزے دار صوفیانہ خیال ہیں۔ مجازی عشق کی باتیں شاعری میں زیادہ تر ہوا کرتی ہیں، اسی کی ترقی کا نام عشق حقیقی

ہے۔ جیسا کہ کہا گیا: المجاز قنطرۃ الحقیقۃ اس کا لطیف ترجمہ دیکھنا ہو اور وہ بھی نظم میں تو راقم الحروف آزاد کا یہ اردو شعر دیکھ لو:

ہے نفع بھی اس عشق کے ہمراہ ضرر بھی ہوتا ہے مجازی سے حقیقت کا توصل

مجازی اور جھوٹی محبت میں عمر کا گراں مایہ حصہ تمام ہوا تھا، دل نے کہا کہ "تمام عمر تو اس جھوٹے اور مجازی عشق کے بیان اور پرستش میں گزاری۔ لاؤ اب اسی آخری عمر کو عشق حقیقی کے مشغلے میں صرف کریں، بس یہی خیال شعرا کو حقایق و معارف تک پہنچاتا ہے۔ پھر اس وقت کے کلام میں ایک خاص لطف ہوتا ہے جو کبھی لسان الغیب اور کبھی اسرار الغیب کبھی بلبل شیراز کے ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چناں چہ سعدی، حافظ، جامی، خسرو۔ نظامی گنجوی وغیرہ کے عشق حقیقی کے بیانات اور محبت الٰہی کے ارشادات اسی قبیل سے ہیں۔

خاقانی پر بھی آخر الامر یہی حالت طاری ہوئی، اور یہی خیال غالب ہوا پھر تو تصوف کے رنگین اور حقایق سے بھرے ہوئے خیالات ہیں اور خاقانی کا دل ہے اور عشق حقیقی کا لگاؤ۔ لیکن مشکل یہ آپڑی کہ جب تک اہل دول کی صحبت اور جھوٹی مدح کا راگ گایا جاتا ہے تب تک یہ خوش نما رنگ نہیں چڑھتا۔ اس رنگ کے لیے اس سے علیحدگی چاہیے۔

گرفتاری:

الغرض اسی خیال سے خاقانی نے خاقان کبیر اپنے ممدوح سے رخصت چاہی۔ ادھر صحبت خاقانی کا لطف کہاں فراموش ہو سکتا تھا، کہا "یہ تو غیر ممکن ہے، خاقانی جب اس میں ناکامیاب رہا تو دوسری کوشش شروع کی اور پوشیدہ فرار کرنے کی ٹھہرائی۔ ایک دن وقت دیکھ کر وہاں سے اس نے فرار کیا، اور شہر بیلقان جو اس کا اصل وطن تھا پہنچا، اور شکرانہ بجالایا کہ صحبت اہل دول سے نجات پائی تھی۔ شاہی کارندوں نے مطلع ہوتے ہی خاقانی کو گرفتار کر لیا، اور اسے خاقان کبیر تک پہنچا دیا۔

افسوس:

غضب سلطانی نے قید کی ٹھہرائی، ہر چند مشفقت مرحمت ہاتھ جوڑ کر سفارشیں

ہوئیں مگر کسی کی ایک نہ چلی، اور یہ فاضل حکیم افضل الدین خاقانی شاہ ایران کے قلعے میں قید کر دیا گیا۔ دیکھو! قسمت کا کہا ٹھیک نکلا۔ وہی فردوسی اور محمود کا معاملہ پیش آیا۔

کئی ماہ قید میں گزر چکے تھے کہ طبیعت سخت گھبرائی۔ اس تنہائی میں اپنی پرانی رفیق شاعری کے سوا کون غمخوار تھا؟ اسی شغل سے طبیعت بہلانی شروع کی، چناں چہ "تحفۃ العراقین" ایک عجیب پر لطف نظم وہیں تصنیف کی، اور ایک قصیدہ بھی وہیں لکھا۔ جس سے اس کی لیاقت علمی اور وسعت معلومات اور قدرت کلام ظاہر ہوتی ہے یعنی اس میں آتش پرستوں کی اصطلاحات لغات۔ ان کے حالات وغیرہ نظم کیے ہیں۔ سات مہینے قید میں گزرے تھے، اور مثل فردوسی کے اس کا زمانہ کلفت قریب الاختتام تھا۔

رہائی:

یہ قصیدہ جوں ہی خاقان کبیر کی نظر سے گزرا، خیال آیا کہ ایسا باکمال اور قید کیا جائے۔ حکم دیا کہ فوراً باکمال شاعر رہا کر دیا جائے۔ خاقانی اس خبر مسرت اثر کو سنتے ہی پھولا نہ سمایا، اور رہا ہوتے ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت اور ریاضت میں مشغول ہو گیا۔ سوچا کہ خدمت ملوک کا تو نتیجہ دیکھ لیا۔ آؤ اب خدا تعالیٰ کی جو حقیقی شہنشاہ ہے خدمت کریں جس کا نتیجہ عقبیٰ میں کام آئے۔

زہد و ریاضت:

زہد و ریاضت میں ایسے کمالات بہم پہنچائے کہ اب شاعری صفت بالکل معدوم ہو گئی، اور ولایت و تقدس کا ضمیمہ مثل نظامی اور رومی کے خیال کی جانے لگی، جیسا شاعری میں اپنے کمال کا سکہ قلوب الخلائق پر جمایا تھا ویسا ہی اب اپنی بزرگی کا سکہ جما دیا اور اولیاءِ کاملین اسے اولیاءِ کاملین میں شمار کرنے لگے۔ چناں چہ عارف کامل حضرت عبدالرحمٰن جامی قدس سرہٗ اپنے تذکرۃ الاولیاء میں اولیاء کے زمرے میں خاقانی کو شمار کرتے ہیں، اور بڑی تعریف اور ثنا کے بعد ایک دو شعر ایسے نقل کرتے ہیں کہ جن سے عشق حقیقی کی بُو آتی ہے۔

حج: حج کے شوق نے مکہ اور مدینہ کی زیارت کرائی۔ موفق التوفیق جمال الدین کے ہمراہ

پیش کردہ
تحقیق آئمہ

تھے، راہ حجاز میں اس نے جو پُر لطف قصیدہ لکھا ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے:

سرحد بادیہ است رواں باش بر سرش
تریاق روح کن ز نسیم معطرش

ان متبرک مقامات سے فیوض باطنی حاصل کر کے وطن واپس آیا، اور اپنے کمالات ظاہری و باطنی اور سرمایہ قصائد و کمال چھوڑ کر اور بقاے دوام کی نعمت لے کر اس فاضل حکیم نے ۵۹۴ھ میں شہر تبریز میں انتقال کیا، اور مقام سرخاب میں مدفون ہوا۔ اس کے اردگرد اور بھی شعرا کی قبریں ہیں۔ من جملہ ان کے ظہیر فاریابی اور شامعوز وغیرہ کے مزارات باعث رونق ہیں۔ اس لیے اس جوار کو مقبرۃ الشعراء کہتے ہیں۔

آزاد دہلوی از کلکتہ

اک مس سیمیں بدن سے کر لیا لندن میں عقد

ہیں! یہ تم نے کیا کیا؟ "اک مِس سیمیں بدن سے کر لیا لندن میں عقد" جی ہاں! حضرت! کر لیا لندن میں عقد! آخر کوئی وجہ؟ کیوں کر لیا لندن میں عقد؟ بس یہ نہ پوچھیے، کیوں؟ کس لیے؟ کیا آپ کو ہندوستان میں کوئی پری جمال ایسی نہیں ملتی تھی کہ آپ کو معشوقانِ یورپ کی تلاش ہوئی۔ کیا آپ کو ہندوستان میں کوئی سیمیں بدن نہیں نظر آتی تھی کہ خدا مان ..... والا کو مسان یورپ کی طرف نظر کرنی پڑی؟ بھلا ایک مسلمان کے لیے یہ بات نازیبا نہیں ہے کہ وہ اپنی تعلیم قوم اور خاندان چھوڑ کر غیر قوم، غیر مذہب، غیر خیال، غیر طبیعتوں سے تعلق پیدا کرے؟ کیوں جناب! شرمائیے نہیں، بغلیں نہ جھانکیے۔ ادھر دیکھیے کیا آپ کے کانشنس نے آپ کو اس امر کی اجازت دی۔ ہے کہ آپ بلاضرورت اس قوم سے قوی نیچرل تعلق پیدا کریں کہ جن میں اور آپ میں قدرت نے متضاد طبیعتیں رکھی ہیں؟۔

واہ حضرت، وا! آپ بھی بس پرانی لکیر کے فقیر نکلے، ابھی تک پُرانے خیالات سے آپ کا دماغ خالی نہیں ہوا ہے۔ ہنوز نئی روشنی کی تیز شعاعوں سے محروم ہے۔ ورنہ اس قدر تاریکی اس میں نہ ہوتی۔ آج کل کی حالت سے آپ بالکل بے خبر ہیں اور وہی پرانا خواب دیکھ رہے ہیں۔ فی زمانہ اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ فاتح قوم سے اہالی ہند قوی رابطہ پیدا کریں، اپنا میل جول بڑھائیں، تاکہ ان میں ہم میں انس پیدا ہو، اور وہ وحشت نہ رہے جو ہماری ترقی میں (جو فاتح قوم کی توجہ پر موقوف ہے) حائل ہوتی ہے۔ علاوہ اس کے انھیں اس امر کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنے شکوک کو جو مسلمانوں کی جانب مذہبی اور پولیٹیکل امور میں ان کے دلوں میں جمے ہوئے ہیں رفع کریں، اِس لیے اگر یہ قوی تعلق پیدا ہو جائے تو ہمیں ان امور کا بہت اچھا موقع ہاتھ آئے گا۔ پس اسی خیال سے اس خادم قوم نے بھی ع

"اک مِس سیمیں بدن سے کر لیا لندن میں عقد"

الپنچ بانکی پور (پٹنہ) بابت ۴ر اکتوبر ۱۹۰۷ء بحوالہ نقوش لاہور بابت ماہ اگست ۱۹۶۴ء۔

کیا خوب! اے جناب! کیا فاتح قوم سے میل جول بڑھانے کے یہی معنی ہیں کہ ان سے یہ تعلق پیدا کیا جائے؟ کیا مواکلت، مشاربت، معاہدت وغیرہ باعث میل جول کے نہیں ہیں؟ ان الاسباب المحبۃ اربعۃ اشیاء المجالستہ والمکالمۃ والمواکلۃ والمشاربۃ۔ پس میل جول کے لیے یہ باتیں کچھ کم ہیں اور آپ کا یہ کہنا کہ ان کی توجہ ہماری ترقی کا ذریعہ ہے محض غلط ہے۔ آپ کسی ترقی یافتہ قوم کی مثال نہیں پیش کر سکتے۔ کہ گورنمنٹ یا فاتح قوم کی توجہ سے ترقی پائی ہو، بلکہ جن قوموں میں سیلف ہیلپ کا خیال قدرت نے پیدا کر دیا ہے، انھوں نے خود ترقی کے اسباب پیدا کیے۔ خود مدارس جاری کیے خود علوم وفنون کی تکمیل کے لیے دارالعلوم قائم کیے، خود آرٹ کے اسکول کھولے بلا امداد غیر۔ اپنے خیال اور اپنی مدد سے بیشک وہ ترقی کر گئے۔ چنانچہ اس کی مثال کے لیے اہل یورپ کافی ہیں۔ ایسے موقعوں میں گورنمنٹ سہارا ضرور دیتی ہے، اور یہ اس کا فرض ہے مگر اس کے یہ معنی ہر گز نہیں ہیں کہ ...

جواب ندارد .... (کچھ دیر بعد) .... اچھا جانے دیجیے، یہ وجہ نہ سہی۔ لیکن فرمایئے جناب اسلام نے تو ہم کو اہل کتاب سے اس تعلق کی اجازت دی تھی۔ پھر جائے گفتگو کیا ہے؟۔

"ہاں آیئے! اب آپ مذہب کے دامنگیر ہوتے ہیں۔ سنیے مذہب اسلام نے جس زمانے میں اس امر کی اجازت دی تھی بلا اس کے اس زمانے میں چارہ بھی نہ تھا۔ علاوہ اس کے مذہب اسلام کی اجازت دینی یہ معنی رکھتی ہے کہ مذہب اسلام انسانی ضرورتوں کے لیے ایک حد تک آزادی دینے والا ہے، اور اس میں نہایت تسہیل ملحوظ رکھی گئی ہے جس سے اس کی جامعیت اور مانعیت متحقق ہو، اور اکثر مواقع میں جب کہ اتفاقیہ اس تعلق کی ضرورت ہو تو اہلِ کتاب سے مذہب کی ممانعت بیچ میں حائل نہ ہو، نہ یہ کہ بلا کسی خیال مضرت کے ہر زمانے میں اس پر زور دیا جائے۔ علاوہ اس کے اس زمانے میں آج کل کی قوم فاتح مفتوح تھی۔ ہر طرف اسلامی سلطنت پھیلی ہوئی تھی اس لیے اس تعلق سے مسلمانوں کو ہرگز ان مضرتوں اور اثروں کا خوف نہ تھا۔ جس قدر کہ آج برعکس حالت پیش ہو جانے سے درپیش ہے جس طرح کہ ہم مفتوح اور

یورپین قوم فاتح ہے، اس طرح اس تعلق میں بھی عورت فاتح اور مرد مفتوح رہے گا۔ ایسی حالت میں اندازہ ہو سکتا ہے کہ اولاد پر کس قدر عورت کے اخلاق و عادات اور مذہب کا بُرا اثر پڑے گا۔ بیسیوں باتیں مذہب میں ایسی جائز رکھی گئی ہیں، جو اکثر مواقع کے لحاظ سے شخصی فوائد پر مبنی ہیں۔ پس اس سے اس کی بنا پر قومی مضرتوں سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن یہ تو فرمائیے کہ اس تعلق سے کیا برا اثر اولاد پر پڑ سکتا ہے؟ اولاد پر باپ کا اثر زیادہ موثر ہو سکتا ہے اور میرے نزدیک یہ بات مسلم سی معلوم ہوتی ہے۔ ہاں آپ، اگر کوئی ایسا واقعہ پیش کر دیں کہ جس سے اس امر کی تصدیق ہو تو یہ آپ کا فرمانا صحیح قرار دیا جائے، ورنہ آپ نے کہا اور میں نے مانا۔

کیا آپ کو معلوم نہیں! آپ تو پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے ہیں یعنی مور کی ہسٹری ..... آپ نے دیکھی ہوگی۔ لیجیے میں وہاں کا ایک تاریخی واقعہ جو اسلامی سلطنت میں واقع ہوا ہے پیش کرتا ہوں۔ اس سے آپ اندازہ فرما لیجیے گا کہ آج کل یورپین سلطنت ہے اور اس زمانے میں اسلامی بادشاہت تھی۔ لیکن پھر ایسا واقعہ پیش آیا۔ اس واقعہ کو مسٹر شرر کے فلورا ناول میں بھی آپ دیکھ سکتے ہیں۔ اندلس میں جب کہ عبدالرحمٰن ثانی کی سلطنت تھی، اور اس نے عیسائیوں کو مذہبی آزادی دے رکھی تھی۔ ایک بھائی بہن واقعے کے اعتبار سے اعجوبہ گزرے ہیں۔ ایک لڑکی تھی جس کا نام فلورا تھا اور اس کا بھائی زیاد ناجی تھا۔ فلورا کا باپ ایک مسلمان اندلسی متقی مسلمان تھا جس نے ایک عیسائی حسین عورت سے جائز تعلق پیدا کر لیا تھا، اس سے فلورا پیدا ہوئی، اور باوجودیکہ مسلمان باپ نے اسلامی نام رکھ کر احباب میں مشتہر بھی کر دیا، مگر اس عیسائی عورت نے اپنے طریقے کے موافق اپنی زبان میں اس کا نام فلورا رکھا۔ باپ ہر وقت گھر میں رہ نہیں سکتا تھا۔ ماں کا سایہ اس پر ہر روز رہا کرتا تھا۔ اس لیے ماں نے فلورا کے دل میں عیسائی مذہب کی خوبیاں اچھی طرح جما دیں۔ ماں مر گئی، باپ مر گیا، بھائی زیاد صرف باقی رہا۔ پادریوں نے فلورا کو حاصل کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ ایک مسلمان کے پنجے سے نکل جائے۔ فلورا کو زیاد نے ہر چند سمجھایا کہ مذہب اسلام برحق ہے مگر پتھر پر جونک نہ لگی۔ معاملے نے طول پکڑا۔ زیاد کے ہاں عیسائنیں آنے لگیں، اور اس کے نکالنے کی کوشش کرنے لگیں۔ زیاد نے بھی خوب

انتظام کیا مگر بے سود ۔ فلورا نکلی اور کہاں کہاں پہنچی ۔ زیاد اس کی تلاش میں پریشان ہوا ۔ کہاں کہاں کی خاک چھانی، اور کدھر کی مٹی اڑائی ۔ بالآخر بہت سخت واقعے اس کی بدولت پیش آئے، سلطنت کو حیرانی ہوئی، رعایا کو پریشانی ۔ زیاد اور فلورا دونوں برباد ہوئے، اور دیکھنے والے افسوس ناک نگاہ سے دیکھتے رہے۔ الغرض باوجودیکہ فاتح قوم مسلمان تھی مگر پھر بھی اس تعلق نے کیا کیا گل کھلائے، کتنے خانماں برباد ہوئے ۔ کتنے جان سے گئے ۔ تمام اسلامی اور عیسائی دنیا میں تہلکہ مچ گیا ۔ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ کس لیے ہوا؟ یہ سب اس تعلق کی وجہ سے ہوا ۔ اس کم بخت تعلق نے یہ سب کچھ کیا، جس کی آپ یہ کچھ تعریف کر رہے ہیں ۔ اب غور فرمائیے کہ آج کل جب کہ فاتح قوم کا اثر بالکل رعایا پر چھایا ہوا ہے ۔ فاتح قوم سے یہ تعلق کیا ۔ ایسی صورت نہیں پیدا کرتا؛ کر چکا ہے اور ضرور کرے گا ۔

جواب ندارد ..... (ادھر ادھر دیکھ کر)" اچھا (کھانس کر) اسے جانے دیجیے تم ..... (کھانس کر) مگر اس کا کیا جواب ہے کہ ہم ایسے تعلیم یافتہ لوگوں کو تعلیم یافتہ عورتوں کی ضرورت ہے ۔ (ایں از ہندوستانیاں مفقود، پھر کیا کیا جائے؟) مجبوراً ہمیں دوسری تعلیم یافتہ معزز قوم (ذرا تبسم کے ساتھ) کی طرف توجہ کرنی پڑتی ہے ۔ کیا ہم ایسے تعلیم یافتہ جاہلہ عورتوں کی زبانی شگن شگون بھوت پریت کی جاہلانہ اوہام پرستی کی آوازیں سن سکتے ہیں ۔

واقعی یہ آپ کا ارشاد ایک پہلو سے بجا ہے جیسا کہ جناب چودھری خوشی محمد ناظر نے رام پور کانفرنس کے لکچر میں ظاہر کیا ہے کہ اس جہالت نسواں سے یہ اچھا عذر آپ کے ہاتھ آگیا ہے، اور جب تک تعلیم نسواں کا خیال ہندوستان میں نہ ہوگا ۔ اس عذر کا آپ کو موقع ملتا رہے گا ۔ لیکن حضرات نہیں اگر آپ محبِ قوم ہیں تو آپ کو چاہیے کہ آپ تعلیم نسواں کو جاری کریں اور عورتوں کو اس قابل بنا کے ان سے عقد کریں تاکہ یہ ضرورت قوم کو تعلیم پر آمادہ کرے نہ یہ کہ آپ یہ عذر پیش کر کے غیر قوم کی تعلیم یافتہ لیڈیوں کو اپنے پہلو میں بٹھا کے مزے میں (خاک مزے میں) زندگی بسر کریں اور اس سے مستغنی ہو جائیں ۔ سوا اس کے جن ہندوستانیوں نے یہ تعلق کیا ہے ان میں اکثر ایسے نکلیں گے جو اپنے اس کیے پر پریشان ہو رہے ہیں

اور اس خرچ اور آزادی کے متحمل نہیں ہو سکتے جو اس سبب سے کرنے پڑتے ہیں کیا آپ کسی ایک معزز شخص کے حالات سے بھی واقف نہیں جس نے یہ تعلق پیدا کر کے تقریباً اپنی زندگی تلخ کر رکھی ہو؟ مگر افسوس ہے کہ اس پر بھی آپ ایسے ناواقفوں کی آنکھیں نہیں کھُلتیں اور یورپ کی سفید رُو لیڈیوں کو دیکھ کر چکا چوند ہو جاتی ہیں۔ مگر ہاں! یہ ضرور ہے کہ آپ لوگ ایک حد تک معذور اور مجبور بھی ہیں۔ یہ سب کچھ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لندن میں تعلیمی خیال سے ایک جوشیلے نوجوان کا جانا اور وہاں چاروں طرف حُسن حُسن کا نظر آنا ایک ایسا نظارہ ہے جسے دیکھ کر بے اختیار نہ ہونا مشکل امر ہے۔

ہمارے مکرم دوست سید اکبر حسین صاحب سیشن جج سہارنپور نے تعلیم یافتہ گروہ پر سے اس اعتراض کو رفع کرنے کی بڑی کوشش کی ہے، اور ایک عجیب و غریب دلچسپ نظم لکھی ہے۔ اس نظم نے ہم کو بہت ہی لطف حاصل کرنے کا موقع دیا ہے۔ ہم نہیں پسند کرتے کہ اس نظم سے ناظرین اپنچ محروم رہیں۔ ایسی حالت میں کہ اس کا پہلا مصرع عنوان پر ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اس نظم میں انھوں نے کیسے یہ اعتراض رفع کیا ہے۔ اس کی داد ناظرین پر چھوڑتا ہوں۔

قطعہ

اِک مس سیمیں بدن سے کر لیا لندن میں عقد
اس خطا پر سُن رہا ہوں طعنہ ہائے دلخراش

کوئی کہتا ہے کہ بس اس نے بگاڑی نسل قوم
کوئی کہتا ہے کہ یہ ہے بدخصال و بدمعاش

دل میں کچھ انصاف کرتا ہی نہیں کوئی بزرگ
ہو کے اب مجبور خود اس راز کو کرتا ہوں فاش

ہوئی تھی تاکید لندن جاؤ انگریزی پڑھو
قوم [illegible] سے سیکھو نئی وضع و تراش

جگمگاتے ہوٹلوں کا جا کے نظارہ کرو
سوپ کاری کے مزے لو چھوڑ کر یخنی و آش

جب عمل اس پر کیا، پریوں کا سایہ پڑ گیا
جس سے تھا دل کی حرارت کو سراسر انتعاش

سامنے تھیں لیڈیانِ زہرہ وش جادو نظر
یاں جوانی کی امنگ اور ان کو عاشق کی تلاش

دونوں جانب تھا دِلوں میں جوشِ خونِ فتنہ زا
دل ہی تھا آخر نہیں تھی برف کی یہ کوئی قاش

اس کی چتون سحر آگیں اس کی باتیں دل رُبا
چال اس کی فتنہ خیز اس کی نگاہیں برق پاش

جب یہ صورت تھی تو ممکن تھا کہ ایک ٔ ق بلا؟ دستِ سیمیں کو بڑھاتی اور یہیں کہتا دور باش
بار ہا آتا ہے اکبر میرے دل میں یہ خیال حضرت سید سے جا کر عرض کرتا کوئی کاش
درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہٗ بازمی گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش[1]

اس نظم میں حضرت اکبر نے جو جو کیفیتیں بیان کی ہیں ان کی وہ اشخاص تصدیق کر سکتے ہیں جو اس کوچے میں قدم رکھ چکے ہیں۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹیپ کا شعر لندن جانے والوں کے لیے بہت ہی حسب حال ہے۔

راقم حضرت آزاد رقم
بقلم ابوالکلام محی الدین احمد دہلوی از کلکتہ

---

[1] حضرت اکبر الہ آبادی کی یہ نظم مکمل نہیں۔ اس میں تین شعر کم ہیں، اور بعض ترتیب میں اصلی کے برخلاف بھی ہیں۔ البتہ اشعار کی اصلاح اصل کے مطابق کر دی ہے۔

پنکچوئیشن

مندرجۂ بالا عنوان سے (جو ایک انگریزی لفظ ہے اور جس کے لیے اُردو میں کوئی خاص لفظ نہیں پایا جاتا) ہمارے قدیم دوست مولوی محی الدین احمد صاحب آزاد دہلوی اُن علامات کے متعلق جو انگریزی میں کاما۔ کولن۔ سیمیکولن وغیرہ کے نام سے موسوم ہیں، ایک مضمون ارسال فرماتے ہیں۔ یہ مضمون اُن ناول نویسوں اور مضمون نگاروں کے لیے زیادہ مفید ہے، جنھیں انگریزی قصوں اور عبارتوں کے تراجم کا شوق ہے۔ ہمارے دوست چاہتے ہیں کہ عام تحریروں میں اِن نشانات سے کام لیا جائے، لیکن ہماری دانست میں عام عبارتیں اِن اجنبی نشانات کو قبول کرنے کے لیے مجبور نہیں ہیں جن سے اپنی ملکی تہذیب پر حرف آنے کے علاوہ ایک نئی دِقّت بھی پیدا ہوتی ہے۔ (ایڈیٹر)

انگریزی میں، "پنکچوئیشن" سے وہ علاماتِ قرأت مُراد ہیں، جو انگریزی میں عبارت کے سمجھنے اور پڑھنے کی تسہیل، اور کلام کی کیفیت ظاہر ہونے کے لیے بنائے جاتے ہیں؛ جن سے "قاری" کو معلوم ہو جاتا ہے، کہ کس جگہ عبارت ختم ہوئی ہے؛ کہاں سکتہ کی ضرورت ہے؛ کس جملہ کو ملا کر پڑھنا چاہیے؛ اور کس کو علٰحدہ کر کے؛ کون جملہ دعائیہ ہے؛ اور کون جملہ ندائیہ؛ کون استفہامیہ؛ کون جملہ تعجب ظاہر کرتا ہے؛ اور کون توجہ چاہتا ہے۔ اِن علامات سے پڑھنے میں اس قدر سہولت ہوتی ہے، کہ قاری بہتے ہوئے پانی کی طرح فرفر عبارت صحت کے ساتھ پڑھ لیتا ہے: گویا یہ "اشارے" پڑھنے والے کو جلد جلد تعلیم کرتے آتے ہیں، کہ اس جملہ کو استفہامی، اور اس کو تعجبانہ، لہجے سے پڑھو؛ جس سے پڑھنے والے کو تفہم، اور سُننے والے کو لُطف حاصل ہوتا ہے۔

اِس میں کوئی شک نہیں، کہ "لٹریچر" کی ترقی کے لیے اِن علامات کا ہونا نہایت ضروری ہے؛ اور اُن کے ہونے نہ ہونے کی مثال بالکل اُن دو ماہ وش پری تمثال لیڈیوں کی سی ہے، جن میں سے ایک عمدہ لباس اور خوشنما زیور سے سجی ہوئی ہے، اور

ماہ نامہ خدنگ نظر۔ لکھنو، بابت اکتوبر ۱۹۰۲ء، ص ۳ تا ۱۰

ایک دونوں باتوں سے عاری ہے؛ یعنی اِن علامات کے نہ ہونے سے کلام کی اصلی حالت اور مصنّف کی اصلی غرض ظاہر نہیں ہوتی۔ کیوں کہ ہم نے اِن کی مثال خوش نما زیور سے دی ہے، جسے انسانی حُسن میں بہت بڑا دخل ہے۔

اگر کوئی شخص کسی کی گفتگو کا تحریر میں نقشہ کھینچنا چاہے، تو اِن علامات سے وہ پوری تصویر کھینچ سکتا ہے۔

الغرض یہ ایک نہایت مفید چیز ہے، اور اِس کی ہر ایک لٹریچر کی ترقی کے لیے سخت ضرورت ہے۔

اِن علامات کا موجد:

علمی دنیا میں اس قسم کی علامات جس قوم نے پہلے پہل ایجاد کی، وہ "مسلمانوں" کی مفتخر قوم ہے، جنھوں نے سب کے پہلے اپنی "آسمانی کتاب" قرآن مجید میں تسہیلِ تلاوت کی غرض سے، مختلف "اوقاف" مقرر کیے، اور اس اِمر کی داغ بیل ڈالی۔ ایسی حالت میں یہ کہنا کچھ بے جا نہیں ہے کہ یورپ کو اِن علامات کی ایجاد کا خیال "قرآن مجید" کو دیکھ کر ہوا اور یہ کوئی حیرت ناک امر نہیں ہے؛ ہمیشہ نظام علمی کا اِسی طرح سلسلہ ہوتا چلا آیا ہے، کہ ایک ترقی یافتہ قوم سے، دوسری ترقی یافتہ قوم مفید باتیں حاصل کرتی ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ "یورپ" کی اکثر ایجادات کی بنا "ہندوؤں" اور "مسلمانوں کی" قدیم ایجادات اور اُن کے قدیم قوانین پر رکھی گئی ہے۔

مگر افسوس ہے کہ "مشرقی زبانیں" (قطعِ نظر از قرآن) اِن علامات کی ایجاد و اشاعت سے محروم رہیں اور اُس کی عام اشاعت کے اعتبار سے، اُس کی اضافی کا سہرا یورپ ہی کے سر رہا۔

ہاں دو علامتیں عربی، فارسی کتابوں میں قدیم سے پائی جاتی ہیں؛ ایک علامتِ متن اور ایک علامتِ حاشیہ۔ مشرح کتابوں میں متن کی عبارت پر امتیاز کے لیے ایک مد (—) کھینچ دی جاتی تھی۔ اور حاشیہ کے لیے سیاق کا ساٹھ بنا کر اُس پر اعداد لکھ دیے جاتے تھے: اس طرح، (۱ــہ ۲ــہ) مگر صرف اِن دو علامتوں کی ایجاد سے مفید نتائج نہیں پیدا ہو سکتے لیکن جب سے یورپ کا سایہ تمام زبانوں پر چھانا شروع ہوا ہے، اور تمام زبانیں اُس کے اثر سے موثّر ہوئی ہیں، کم و بیش اکثر مشرقی زبانوں میں اِس کا استعمال

ہونے لگا ہے، اور جدید تحریرات میں کچھ نہ کچھ اُس کے اثرات پائے جاتے ہیں۔

مشرقی زبانوں میں پنگچوئیشن کا استعمال:

"مشرقی زبانوں میں" سب سے زیادہ مقدس اور پرانی، زبانیں دو ہیں؛ عربی اور سنسکرت۔ جس طرح یہ موجودہ زبانوں میں پرانی زبانیں ہیں، اسی طرح علوم وفنون قدیمہ کی معاون سمجھی جاتی ہیں۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ ان علاماتِ قرأت سے یہ دونوں مقدس زبانیں کس قدر مؤثرہ ہوئیں ہیں۔

عربک لٹریچر:

اس میں کوئی شک نہیں، کہ عربی میں سب سے پہلے علاماتِ قرأت مقرر ہوئے، جن کا استعمال "قرآن مجید" میں ہوتا رہا، اور آج تک ہو رہا ہے: مگر بہ ظاہر یہ تعجب انگیز امر معلوم ہوتا ہے، کہ عام عربی لٹریچر میں اس کا استعمال کیوں نہیں ہوا؟

اصل بات یہ ہے کہ ابتدا میں جب "علمائے اسلام" نے دیکھا کہ اسلام کی حیرت انگیز اشاعت "قرآن مجید" کو عجمیوں" کے ہاتھوں پہنچا رہی ہے اور وہ وقت بالکل قریب ہے، جب ذرا ذرا سی باتوں میں قرآن شریف کی نسبت اختلاف ہوگا، تو انھوں نے اِدھر توجہ کی اور اِن علامات کو ایجاد کر کے اوقاف مقرر کیے۔

اُنھوں نے اپنی توجہ قرآن مجید کی طرف اس قدر مبذول کی، کہ انھیں اِس امر کا خیال ہی نہیں ہوا کہ یہ علامات عام لٹریچر میں شائع کیے جائیں اور یہ کام اُنھوں نے اپنے بعد کے آنے والوں پر چھوڑ دیا۔

متاخرین اہلِ اسلام کا زمانہ زیادہ تر فرقِ اسلامیہ کی بحث وجدل میں صرف ہوا اور اُنھیں اِس قسم کی ایجادات کا موقع ہی نہیں مِلا۔ اِس کے بعد جو زمانہ مسلمانوں پر آیا، وہ اِنحطاط اور تنزّل کا زمانہ تھا: اِس لیے اِس قسم کا خیال ہی اُن کو کیسے پیدا ہوتا؟ اور بالفرض اگر کسی کو خیال گورا بھی ہو تو قومی تنزّل کے اوہامات نے اُسے اس گورکھ دھندے میں ڈال دیا ہوگا، کہ یہ علامات قرآن مجید کے لیے مخصوص ہیں، اِن کا استعمال یا اسی روش کے علامتوں کا استعمال بے ادبی ہے!!

اور کیا عجب کہ اندھا دُھند تقلید نے یہ خیال بھی پیدا کر دیا ہو کہ "جب ہمارے پہلوں نے اس قسم کے علامات ایجاد نہیں کیے اور اِنھیں" قرآن مجید" کے لیے مخصوص

رکھا تو پھر ہم کیسے ایجاد کریں"!!!

مگر "یورپ" کی نکتہ بیں نگاہیں تو اس قسم کی مفید باتوں کی تلاش میں تھیں؛ فوراً نگاہوں نے یہ راز تاڑ لیا۔ اور ان اوقاف پر غور و فکر کرنے سے جو مواد جمع ہوا، اُس نے "پنکچوئیشن" کے نام سے ظہور کیا۔

الغرض، اِن علامات کی وجوہات بالا سے "عربک لٹریچر" میں اشاعت نہ ہو سکی، اور وہ قرآن مجید تک محدود رہے: مگر جب سے عربی ممالک میں، یورپ کے علوم و فنون کی اشاعت ہونے لگی اور اخبارات نکلنے لگے، تو کسی قدر ردّ و بدل کے ساتھ ان کا استعمال عربی میں شروع ہوگیا۔ اور چوں کہ اِس قسم کے علامات کا ٹائپ پہلے سے موجود تھا (اور وہاں ٹائپ ہی کا رواج ہے۔) اس لیے اِن علامات کے استعمال میں نہایت سہولت ہوئی۔

"ممالک اسلامیہ" میں جدید علمی اثرات سب سے زیادہ تین شہروں میں پائے جاتے ہیں؛ "دارالخلافت اسلامبول" "مصر القاہرہ" "بیروت" (اور ان میں زیادہ خصوصیت مصر کو حاصل ہے، جس نے سب سے بڑھ کر علمی اثرات حاصل کیے ہیں۔) آج کل یہاں سے جتنے اخبار، رسائل اور جدید کتابیں چھپ کر نکلتی ہیں، اُن میں یہ اشارات اچھی طرح استعمال کیے جاتے ہیں؛ معلومات، المؤید، مصباح الشرق، الموسطہ، المنار، اِن تمام مصری، اسلامبولی، اخباروں، رسالوں میں یہ علامات مستعمل ہیں؛ اور اِن کے علیحدہ خوبصورت ٹائپ، "اہل بیروت نے بنائے ہیں۔ پہلے اخباروں، رسالوں میں سوائے چند علامتوں کے اور تمام علامتوں کا اِس عمدگی سے استعمال نہیں ہوتا تھا؛ اور اس پر چنداں توجہ نہیں کی گئی تھی، مگر جب سے "عربک انسائیکلو پیڈیا" "دائرۃ المعارف" چھپ کر شائع ہوئی، اور اِس میں یہ بات بالوضاحت دکھلائی گئی، جب سے اس کا کامل طور سے ممالک اسلامیہ میں استعمال شروع ہوا۔

سنسکرت لٹریچر:

"مقدس سنسکرت" میں بھی (جہاں تک میری محدود تحقیق ہے۔) کوئی ایسا اشارہ یا علامت قدیم میں مقرر نہیں کی گئی تھی، جس طرح یہ "پنکچوئیشن" کے علامات "یورپ" میں مقرر ہوتے ہیں: مگر ہاں، آج کل کے پر جوش تعلیم یافتہ ہندوؤں نے اِن یورپی

علامات کا استعمال "سنسکرت" میں جاری کر دیا ہے۔

پرشین لٹریچر :

"فارسی" زبان میں بھی مثل اور زبانوں کے کوئی قدیمی علامت نہ تھی؛ مگر آج کل اِس کا خیال "مصلحین قوم" میں پیدا ہو گیا ہے اور اخباروں میں اس کی اشاعت شروع ہو گئی ہے؛ حکمت، ناصری، شرافت، ایرانی مصری فارسی اخباروں میں اِس کے آثار پائے جاتے ہیں، مگر سب سے زیادہ اخبار "اختر" اسلامبولی نے اپنی تحریروں کو اِن علامتوں سے مزیّن کیا ہے؛ "اخبار حبل المتین" میں بھی یہ علامات مستعمل ہوتے ہیں: اور فرہاد میرزا مرحوم کی تصانیف اور آقا عبدالرحیم "طالبی" سکرٹری انجمن تفتیش "معارف" کی تصانیف میں اِن کا استعمال نہایت خوبی سے ہوا ہے اور اس لیے اُمید قوی ہے، کہ عن قریب "پرشین لٹریچر" میں یہ علامات جُزوِ زبان ہو جائیں گے۔

بنگلہ :

واقعی بنگلہ زبان کے اخباروں میں اس کا جس خوبی سے استعمال ہوتا ہے۔ اِس کی مثال انگریزی ہی میں مل سکتی ہے۔ بالخصوص جناب "بابو سریندر ناتھ بنرجی" اڈیٹر اخبار "بنگالی" اپنی تحریروں میں، اچھی طرح اِن کا جا بجا استعمال کرتے ہیں، اور عام تصانیف میں بھی اِن کا پوری طرح استعمال ہوتا ہے۔

ترکی :

تمام مشرقی زبانوں سے پہلے جس زبان نے اِس کا استعمال شروع کیا، وہ اسلامی زبانوں میں "ترکی" زبان ہے۔ آج کل دو سطریں بھی ترکی زبان کی ایسی نہیں نظر آتیں۔ جن میں یہ علامات نہ پائے جاتے ہوں، !!

گجراتی :

گجراتی میں اِس کا استعمال شروع ہو گیا ہے، "رسالہ اسلام" گجراتی ہمارے اس بیان کا شاہد موجود ہے۔

اُردو :

اُردو میں بھی اس کا کچھ نہ کچھ استعمال ہوا، اور کچھ ہو رہا ہے؛ مگر افسوس! کہ جو کچھ ہوا، وہ بہت ہی محدود ہوا اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ بہت ہی کم ہے۔ پہلے پہل اُردو

میں ہم کو یہ علامات اُن کتابوں میں نظر آئے ہیں، جو" ایشیاٹک سوسیٹی بنگال" کے اہتمام سے خود سوسیٹی کے" بپٹسٹ مشن" پریس میں چھپ کر شائع ہوئیں ہیں، جیسے" تاریخ ممالک چین"" باغ و بہار"" نثر بے نظیر" وغیرہ۔ اس کے بعد جو کتابیں" سین ٹیفک سوسیٹی علی گڈھ" میں ترجمہ کر کے شائع ہوئیں ہیں، اُن میں بھی اِس کا استعمال ہوا ہے جیسے" انتظام مدن"" تاریخ مصر"" ایران" ترجمۂ الفنسٹن صاحب وغیرہ۔

" سرسید احمد خان مرحوم" کی تصانیف میں بھی اِس کا استعمال اچھی طرح ہوا ہے؛ تبئین الکلام" تصانیفِ احمدیہ" میں یہ علامات موجود ہیں مرحوم"" تہذیب الاخلاق" میں بھی بالخصوص اشاعتِ سوم میں یہ بنائے گئے ہیں۔

آج کل اخباروں میں" علی گڈھ انسٹیٹوٹ گزٹ" قابل ذکر ہے۔ جس میں اِس کا برابر استعمال ہوتا ہے۔

بعض جدید کتابیں مثل" تمدنِ عرب"" الفاروق"" البرامکہ"" لائف سرسید"" الغزالی" وغیرہ میں بھی کم وبیش یہ اشارات پائے جاتے ہیں۔ مگر یہ ضرور ہے کہ بے موقع بہت ہیں۔

آج کل کی اکثر تحریروں، اخباروں، میں زیادہ تر دو علامتیں بہت نظر آتی ہیں، استفہامیہ، ندائیہ، تعجبیہ؛ مگر اِن چند کنایوں اور چند اشاروں کا استعمال تو کوئی چیز نہیں ہے، جب تک اچھی طرح باضابطہ ان کا استعمال نہ ہو۔

اُردو زبان کا وہ بچپن کا زمانہ تو اب خواب وخیال ہوگیا ہے، جب یہ زبان صرف قصوں اور شاعری کی زبان سمجھی جاتی تھی۔ اَب تو برٹش دَور میں اس نے نشوونما پاکر شباب کے زمانے میں قدم رکھا ہے، اور اپنا رنگ روپ نکالا ہے؛ علمی زبانوں کے قدم بہ قدم ہو رہی ہے۔ اِس کی مثال میں" مؤلف البرامکہ" کا یہ قول بہت صحیح ہے کہ

"جن ڈالیوں پر کبھی طوطے و مینا کے بڑے بڑے غول شام وسحر آکر بیٹھتے تھے۔ اب اُن پر یورپ کی خوش رنگ اور خوب صورت چڑیاں چہچہا رہی ہیں۔ اور جن کی عمر کا ایک گراں مایہ حصہ" بوستانِ خیال، داستانِ امیر حمزہ، مثنوی بدرِ منیر، کے دیکھنے میں صرف ہوا تھا، اُنھیں، اب" المامون" کی سی تاریخی کتابوں اور مفید لائفوں سے دلچسپی ہو رہی ہے۔"

اِس لیے اب ضرور ہے، کہ اس میں بھی اِس قسم کے علامات کا باضابطہ اور باقاعدہ استعمال کیا جائے، اور اُسے اُس حالت تک پہنچا دیا جائے، "جب اُردو لٹریچر" بالاعلان پکار اُٹھے کہ "میں ایک علمی زبان معدن علوم و فنون ہوں"۔

ہم چاہتے ہیں کہ ان علامات پر زبان "اُردو" کے اخباروں، رسالوں کو توجہ دلائیں اور آمادہ کریں کہ وہ اپنی تحریروں میں اِس کا خیال رکھیں اور اور لوگوں کو بھی تقلید پر آمادہ کریں۔ کیوں کہ "ممالک متمدنہ" میں جب کبھی کسی رائے کی اشاعت مقصود ہوتی ہے، تو وہ پہلے "اخباری" دُنیا میں مشتہر کی جاتی ہے۔

ہم یہاں پہلے اُن علامات کو جن پر "پنکچوئیشن" کا اطلاق ہوتا ہے، انگریزی سے ترجمہ کر کے درج کرتے ہیں، اِس کے بعد اِس پر بحث کریں گے کہ اِن کا استعمال اُردو میں کیوں کر ہو؟ بہ ترمیم یا بعینہٖ؟ اور مُفصّل مثالیں لکھ کر پورے طور سے یہ بات ناظرین کے ذہن نشین کی جائے گی۔

ہماری اِس تحریر کو "خدنگ نظر" میں شائع کرنے سے یہ غرض ہے کہ "خدنگ نظر" کے تمام نامہ نگار ہمارے اِس مضمون کو پیش نظر رکھیں، اور اپنی اپنی تحریروں میں انھیں موقع بہ موقع درج کریں۔ کیا عجب! کہ اور اخباروں، میگزینوں کو تقلید کا شوق دامنگیر ہو! اور اِس طرح اِس مفید چیز کی اشاعت ہو جائے! وسئل اللہ یحدث بعد ذلک امرا!!

پنکچوئیشن یعنی علاماتِ قرأت

شمار	علامت کا انگریزی نام	علامت کی شکل	ترجمہ	مثال مختصر
۱	کاما	،	علامت سکتہ	خدنگ نظر کا دیکھنا، اعلیٰ طبائع سے ممکن ہے۔
۴	فُل سٹاپ	. (ایک نقطہ)	علامت وقفہ کامل	خدنگ نظر۔ ایک لاجواب رسالہ ہے.
۳	کولن	:	علامت وقفہ	غور سے دیکھو: خدنگ نظر لاجواب پرچہ ہے.
۲	سمیکولن	؛	علامت سکون	خدنگ نظر کو دیکھو؛ جو اک علمی رسالہ ہے.
۵	نوٹ آف اکسکلامیشن	!	علامت تعجب اور مسرت	خدنگ نظر اپنی خوبیوں کے لحاظ سے اسٹیل و ایڈنس کا ٹیٹلر ہو گیا!

شمار	علامت کا انگریزی نام	علامت کی شکل	ترجمہ	مثال مختصر
۶				زیادہ اظہار تعجب اور مسرت کے لیے بجائے ایک کے دو تین بنائے جائیں جیسے !! - !!! -
۶	نوٹ آف انٹروگیشن	؟ ؟	علامت استفہام	کیا خدنگ نظر ایک علمی میگزین نہیں ہے؟
۷	پرنتھسز (یا براکٹ)	( ) { }	علامت جملہ معترضہ یا جملہ مُفترہ	خدنگ نظر (اور صرف خدنگ نظر) عمدہ رسالہ ہے۔ خدنگ نظر {یعنی لکھنؤ کا گلدستہ} بے شک لاجواب ہے۔
۸	ہائی فن	—	علامت ترکیب	کتب - خانہ - شراب - خانہ
۹	ڈیش	——	علامت محذوف یا علامت انفصال	خدنگ نظر تو ـــــ سے بدرجہا اچھا ہے۔
۱۰	کوٹیشن	" "	علامت اقتباس	شیخ سعدی کا قول ہے "دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز"
۱۱	انڈرلین	——	علامت توجہ	الغرض خدنگ نظر عجیب و غریب ہے۔
۱۲	اسٹار	* * *	علامت عبارت غیر منقول	خدنگ نظر میں لکھا ہے کہ "کبوتروں کی ڈاک نورالدین کے وقت سے شروع ہوئی * * * اور صلاح الدین نے بھی اس سے کام لیا الخ"
۱۳		* + ‡ ॥ § ※ ۱۲	علامت حاشیہ	خدنگ* نظر میں ہم نے جاپان+ کے حالات‡ اور مضامین॥ پڑھے۔ * یعنی لکھنؤ کا ماہواری علمی رسالہ ۱۲ + جاپان ایک مشہور مشرقی ملک ہے ۱۲ ‡ حالات جمع ہے حال کی ۱۲ ॥ مضامین جمع مضمون کی ۱۲ علیٰ ہذا القیاس ۱۲

نوٹ: اس مضمون کی دوسری قسط دستیاب نہیں ہو سکی جس میں مولانا نے پنکچوایشن کی مثالیں دے کر اردو میں ان کے بہ ترمیم یا بعینہٖ محل استعمال پر بحث کرنے کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا۔ شاید مولانا کو یہ مضمون لکھنے کا موقع نہیں ملا۔ (ابو سلمان)

خدنگ نظر[1]

مبادلۂ سنین

شادیم کہ سال نو در آمد غافل کہ زعمر رفتہ سالے

صبح ہوئی، شام ہوئی: دن گیا، رات آئی؛ کل چہار شنبہ تھا، آج پنجشنبہ؛ کل اکتیسویں تھی آج پہلی: کل کانوں میں اُس مہینے کی آواز آرہی تھی؛ آج اس مہینے کا ذکر ہے، تھوڑا زمانہ ہوا کہ دو چار، پانچ چھ مہینوں کا شمار ہو رہا تھا؛ سہ ماہی شش ماہی قیمت اخباروں میں بھیجی جارہی تھی؛ پیچھے سال تمام ہوا! ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر، سب ختم! آج جنوری کی پہلی تاریخ ہے، اور ہمارا قلم اپنے نئے مہربان کے متعلق ایک مضمون لکھ رہا ہے! ہم ہیں کہ اس نئی صورت کو حیرت انگیز نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں: بارالٰہا! یہ نئی صورت کہاں سے وارد ہوئی؟ ابھی تو ہم اپنے گزشتہ مہمان "۱۹۰۲ سنہ" سے دل کھول کر نہیں ملنے پائے تھے، خیال تھا کہ اس کی رخصت اور دوسرے کی آمد میں تین سو پینسٹھ ۳۶۵ دن باقی ہیں، مگر ابھی ہم خوابِ غفلت سے چونکنے بھی نہ پائے تھے کہ تین سو پینسٹھ دن ختم ہو گئے، اور یہ حضرت "۱۹۰۳ سنہ" آموجود ہوئے!!

ہاں! زمانہ ایسا ہی آوارہ گرد مسافر ہے جس پر ایک منٹ کے لیے بھی بھروسا نہیں ہو سکتا، یہ مسافر برسوں کی راہ مہینوں اور مہینوں کی راہ گھنٹوں میں طے کرتا ہے۔ اس کی فوق العادت رفتار عجیب عجیب نیرنگیاں دکھاتی ہے: مستقبل کو حال اور حال کو ماضی کر دیتی ہے، اور وہ شخص جوانِ ازمنۂ ثلاثہ کو واقعی ماضی یا حال یا مستقبل سمجھے ہوئے ہے، اس انقلاب کو دیکھ کر محوِ حیرت ہو جاتا ہے!!

زمانے کا یہی حال ہے۔ ایک آتا ہے ایک جاتا ہے۔ ایک پیدا ہوتا ہے، ایک مرتا ہے۔ ہمارا پچھلا مہمان ہم سے بات کی بات میں جدا ہو گیا، اور اُس کا جانشین بھی پیدا ہو گیا جو اسی طرح ہم سے جدا ہوا۔ بے شک! زمانے کی نیرنگیاں تسبیح کے دانوں

---

[1] خدنگ نظر۔ لکھنؤ جنوری ۱۹۰۳ سنہ بہ شکریہ پروفیسر افضل حق قرشی (لاہور)

کی تھیوری ہے جس کا انقلابی دور چشم زدن میں ایک سے سو تک پہنچ جاتا ہے، اور پھر نئے سرے شروع ہوتا ہے!!

قانون قدرت نے دنیا کا عجیب سلسلہ رکھا ہے: اگر کوئی مبصر غور سے دیکھے تو اُسے نیست میں ہست اور ہست میں نیست کے کرشمے نظر آئیں گے۔ رات اِس امر کو ظاہر کر رہی ہے کہ کچھ عرصے میں دن آنے والا ہے، اور وجود کہہ رہا ہے کہ میں عدم کا پیش خیمہ ہوں۔ صبح زندگی کی شام ضروری ہے۔ اور حیات کے لیے ممات یقینی۔

دنیا کا انقلابی سین ہمیں بتا رہا ہے کہ زمانے کی ہستی ایک پُر رونق تھیٹر سے مشابہ ہے، ابھی چہار طرف ۱۹۰۲ء کے تماشے دل لبھا رہے تھے۔ کہیں جنگ چھڑی ہوئی تھی کہیں طرب کے شادیانے بج رہے تھے، کسی طرف سے ماتمی آوازیں آ رہی تھیں۔ تماشائی ان نظر فریب تماشوں میں محو تھے کہ یکایک ڈراپ سین ہو گیا، اور آن کی آن میں وہ تماشے نظروں سے چھپ گئے۔ ۱۹۰۳ء کی آمد آمد ہے، اور نہایت بے چینی سے انتظار ہو رہا ہے کہ دیکھیے اِس اسٹیج پر کیسے کیسے ایکٹر آتے ہیں، اور اپنے واقعات سے ہمیں بے چین کر کے جاتے ہیں یا مسرت و شادمانی میں محو کر جاتے ہیں۔

اگر ۱۹۰۲ء کے یادگاری واقعات پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے تو واقعی ایک متضاد صورت نظر آئے گی۔ اگر ایک واقعہ ہم کو خوش کرے گا تو دوسرا غمگین۔ گویا یہ ایک ایسی تصویر ہے جس کے کئی پہلو ہوں یا ایسا انسان ہے جس کی متضاد الصفات دو آنکھیں ہوں۔ تصویر کا ایک رُخ روشن ہو تو ایک تاریک، انسان کی ایک آنکھ روتی ہو تو ایک مسرت کا پتا دیتی ہو۔ ٹرنسوال کی خونریز جنگ کی خوفناکی، جزائر امریکہ اور کاشغر کی حیرت انگیز تباہیاں۔ ہندوستان کے ریلوے حادثات اور کی ترقی۔ نامور لوگوں کی بے وقت وفات اس سال کے غمگین واقعات کے نمونے ہیں۔ ملک معظم قیصر ہند کا عین تاجپوشی کے زمانے میں سخت علیل ہو جانا اِس سال کا سب سے اہم واقعہ ہے لیکن بفضلہ تھوڑے ہی زمانے میں حضور انور کا صحت یاب ہو کے جشن تاجپوشی منانا ایک مسرت خیز نعم البدل ہے جس نے گزشتہ سال کی تمام کلفتیں دُور کر دیں۔ اور خاتمۂ سال پر ہندوستان کے قدیم پایۂ تخت دہلی میں تو ایسا عالیشان دربار ہوا جو آج تک چشم فلک نے بھی نہ دیکھا ہو گا۔ دہلی کے علاوہ آج ہندوستان کے ہر خطے میں جشن تاجپوشی کا

مسرت خیز سین نظر آرہا ہے !!

مبادلۂ سنین کو ایسا مسرت ناک موقع بہت کم ملا ہوگا! دونوں سال جس خوشی سے گلے ملے ہیں اُس کی نظیر تاریخ کے صفحات بہت کم پیش کر سکیں گے۔ اگر ۲۹ دسمبر ۱۹۰۲ء جلوس شاہی کے گشت کی تاریخ تھی تو یکم جنوری ۱۹۰۳ء دربار قیصری کا مبارک دن جو عید الفطر کو اپنے ساتھ لیتا آیا تھا۔ اگر گزشتہ سال کا چہارم حصہ جشن دہلی کی تیاریوں اور اُس کی چہل پہل میں صرف ہوا تو موجودہ سال کا اس سے زیادہ حصہ اس مبارک جشن کی مسرتوں میں صرف ہوگا۔ اور اس لیے ہم دونوں سال کے قران السعدین پر اپنی دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں!

اِس تحریر کو ختم کرنے سے پہلے ہم نہایت خوشی سے ۱۹۰۳ء کو "ویلکم" کہتے ہیں! دیکھیں ہمارا نیا دوست ہمارے ساتھ کس طرح پیش آتا ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اس کی آمد سے ہم پر مسرتوں کے دروازے کھل گئے، اور ہمارے "شہنشاہِ عالم پناہ" کی تاجپوشی نے ہمارے دلوں کو باغ باغ کر دیا۔ ہم اِس مسرت میں محو ہو رہے ہیں کہ اِس مضمون کے اختتام کے لیے ہمیں ایسا مبارک موقع ہاتھ آیا ہے کہ خدنگ نظر کے اُن نامور مضمون نگاروں کی طرف سے جو اس شہنشاہ عالی جاہ کی اُردو خواں پبلک کی دلچسپیوں میں اپنے بیش بہا مضامین سے اضافہ کر رہے ہیں حضور ملک معظم دام دولتہ اور اُن کے نائب السلطنت ہز ایکسیلنسی لارڈ کرزن بہادر بالقابہ کی خدمت مودبانہ مبارکباد پیش کر کے اِس مسرت آگین موقع پر فخر کریں۔ اور صدق دل سے دُعا کریں کہ "الٰہی ہمارے شہنشاہ کی عمر دراز ہو!"

ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی از کلکتہ

آثارِ قدیمہ

اہلِ یورپ جن کی علمی کوششوں کا غلغلہ اس وقت چار دانگ عالم میں شہرت پذیر ہو رہا ہے : آثارِ قدیمہ کی تلاش و تجسس میں جس قدر محنت کرتے ہیں : بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے : کہ خود اُن کے بنانے میں، بنانے والوں نے اس قدر محنت نہ کی ہوگی : ان آثارِ قدیمہ سے دنیا کی قدیم تاریخ، اور اُس کی قدیم حالت، تمدن، خیالات، پر جس قدر روشنی پڑتی ہے، اُسے وہ ہی شخص خوب سمجھ سکتا ہے ؛ جو " جدید علم تاریخ "، جیالوجی، فیلالوجی، سے واقفیت رکھتا ہو، پُرانے بتوں سے، جو زمین اور پہاڑ کے غاروں سے نکلے ہیں، اِس امر کا سُراغ لگانا، کہ بُت پرستی دنیا میں کب سے شروع ہوئی ؟ اور اُس زمانے کے مذہبی خیال کس قسم کے ہوتے تھے، تاریخ پر کس قدر روشنی ڈالتا ہے ؟ زمین کھود کر اور " ٹرشیری " میں انسانی نشانات پا کر اس امر کا دعویٰ کہ " انسانی قدامت کوئی معمولی قدامت نہیں ہے "، کس قدر ثابت ہوتا ہے ؟ جو لوگ یورپ کے مشہور رسائل آرٹ، نائین ٹینتھ سنچوری، لنڈن ریویو، ریولو آف ریویوز، فورٹ نائٹ ریویو وغیرہ میگزینوں کی سیر کرتے ہیں، اور اُن کے علمی صفحات پر ہر مہینہ کوئی نہ کوئی اثر قدیم کا حال پڑھتے ہیں، وہ ہمارے اس بیان کی تصدیق کریں گے ۔

" کالڈیا " کے پتھروں سے جیسی کچھ " طوفان نوح " کی کیفیت ظاہر ہوئی ہے، وہ انھیں " آثارِ قدیمہ " کی تجسس کا ایک معمولی نتیجہ ہے، اور " اہرام مصری " جزیرہ روڈ رس " منفیس لاٹ " کا جو کچھ حال ہمیں معلوم ہوا ہے وہ " آثارِ قدیمہ " کی تلاش کا ادنےٰ فیض ہے ۔

اہلِ یورپ اور آثارِ قدیمہ کی تلاش :

" آثارِ قدیمہ " کی بہم رسانی جب ہی ہو سکتی ہے، جب دنیا کے تمام ممالک قدیمہ اور مشہور مقامات کی سیر کی جائے ۔ اور " سیر و سیاحت " انگریزوں کی طبیعت ثانی ہو گئی ہے ۔ ایسی حالت میں انگریزوں کے سوا کون " آثارِ قدیمہ " سے مستفیض ہو سکتا ہے ۔ ؟

خدنگ نظر، لکھنؤ، فروری ۱۹۰۳ء بہ شکریہ پروفیسر افضل حق قرشی (لاہور)

گزشتہ نصف صدی میں انگریزوں نے مختلف ممالک سے جس قدر "آثارِ قدیمہ" جمع کیے ہیں۔ اور اُس سے جس قدر تاریخی، تمدنی، نتائج نکالے ہیں۔ اگر اُن کی ایک مختصر فہرست پیش کی جائے تو شاید اُس کے لیے خدنگ نظر کی سالانہ جلد بھی کافی نہ ہو۔

یونان اور مصر کے قدیم سکے بابل کے پرانے نوشتے، ہتھیار، لباس وغیرہ کہاں کہاں سے انگریزوں نے جمع کرکے عجائب خانوں میں سجائے ہیں۔ جن کی کیفیت پڑھ کر ایک مشرقی خیال کا آدمی محوِ حیرت ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص لندن کے برٹش میوزیم کی کیٹلگ اٹھا کر صرف قدیم سکوں اور نوشتوں کی فہرست پڑھے۔ تو اُسے اس قدر حیرت کے منازل طے کرنے پڑیں کہ ورق گردانی کی بھی مہلت نہ ملے۔!! سیکڑوں انگریزوں نے اپنے وطن کی بہار اور عیش چھوڑ کر صرف آثارِ قدیمہ کی تلاش میں ملکوں کا سفر کیا ہے اور سیکڑوں جسمانی، اور مالی نقصان اُٹھا کر نایاب آثار جمع کیے ہیں۔ اور پھر اُن کی کیفیت اپنے سفرناموں، روزناموں اور مشہور میگزینوں میں مشتہر کی ہے۔ اور اس طرح اپنے ملکوں کو بے بہا معلومات سے مالا مال کیا ہے۔ ڈاکٹر "گرنس" صاحب نے سترھویں صدی عیسوی میں صرف بڑے "اہرامِ مصری" کی پیمایش کے لیے مصر تک کا سفر اختیار کیا، اور اس تحقیق کے آگے سیکڑوں روپیہ کی کچھ پروا نہیں کی جو سفر خرچ میں صرف ہوئے۔

"مسٹر منگو پارک" صاحب محض سوڈان اور حبشان کے آثارِ قدیمہ کی جستجو میں برسوں سفر کرتے رہے، اور آخر اس تحقیق و تدقیق کی راہ میں اپنی جان تک دے دی۔!!

"انگریزوں کی سیر و سیاحت" کا اِس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ چودھویں صدی سے آج تک صرف اُن سیاحوں کی تعداد جنھوں نے "ایران" کا سفر کیا، اور اپنے سفرنامے شائع کیے، "تین سو"[1] سے زائد ہے!! اور جس کے مقابلے میں انھیں ایام میں مسلمان سیاحوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ پچاس ہے! وَشَتَّانَ بَیْنَهُمَا: ع

بہ بین تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا!

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی عروج کے وقت تحقیقاتِ علمی کی غرض سے سیر و سیاحت مسلمانوں کا قومی خاصہ سمجھا جاتا تھا۔ ابنِ بطوطہ، ابنِ جبیر، سعودی، الواسحاق

---

[1] یہ تعداد ہم نے "پرشیا اینڈ پرشین کوئسچن" سے لکھی ہے۔

علامہ بشاری، ابن حوقل، بیرونی، ادریسی۔ الاصطخری، ابن سعید، یاقوت، ناصر خسرو وغیرہ بڑے بڑے ایسے مسلمان ہیں جنھوں نے سیر و سیاحت سے فوائد حاصل کیے، اور سیر و سیاحت کے نتائج "سفرنامہ" کی صورت میں شائع ہوئے، اور اس میں شک نہیں کہ یورپ اُن سے بے شمار فوائد حاصل کر رہا ہے۔

ہم نے جو یہاں سیر و سیاحت مسلمانوں کا قومی خاصّہ لکھا ہے۔ شاید تم مسلمانوں کی موجودہ حالت دیکھ کر اِس کے ماننے میں تامّل کرو! مگر نہیں! یہ واقعات تاریخی ہیں۔ جن سے انکار نہیں ہو سکتا، بے شک اگر تاریخی **صفحات** ہمیں دھوکا نہیں دیتے تو **تاریخ** کی بنا پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ انھیں مسلمان سیاحوں کی بمقابلہ اہل یورپ کی اِس وقت جو تعداد ہمارے پیش نظر ہے اُس وقت اِس کے بالعکس حالت تھی اور جو تعداد قلیل الوقت مسلمان سیاحوں کی ہے۔ مسلمانوں کے مقابلہ میں اتنی قلیل تعداد بھی اُس وقت انگریزوں کی نہ تھی۔ !!!

مصنّفِ "تاریخ نفح الطیب"[1] اُن مسلمان سیاحوں کی تعداد تین سَو بہتر سے زیادہ لکھتا ہے، جنھوں نے "**اندلس**" سے "**ممالک مشرقیہ**" کا اور "**ممالک مشرقیہ**" سے "**اندلس**" تک کا سفر کیا۔ اور جن میں چار سیاحہ عورتیں ہیں!!

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم ہو گئے خاک، انتہا یہ ہے!!!

مگر افسوس ہے کہ **اسلام** پر جس قدر انحطاط کا زمانہ آتا گیا اُنھیں اپنی خانہ جنگیوں اور ملک گیریوں سے سیر و سیاحت کا بہت کم موقع ملا، اور یہ خصوصیت یورپ کے حصّے میں آگئی۔

اب تو سیر و سیاحت سے مسلمان اِس قدر غیر مانوس ہو گئے ہیں کہ اُن کے نزدیک کسی شخص کا صرف سیر و تفریح اور تحقیقات علمی کی غرض سے سفر کرنا نہایت تعجب ناک اور حیرت انگیز بات ہو گئی ہے، اور وہ اِس پر اِس قدر تعجب کرتے ہیں کہ اُسے غیر قوموں نے بھی محسوس کر لیا ہے۔

ڈاکٹر جے، بی، فریزر صاحب نے ۲۱ سنہ تا ۱۸۳۴ء میں خراسان کا سفر کیا، اور وہاں سے آکر اپنا سفرنامہ شائع کیا، وہ اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں:

---

[1] نفح الطیب اندلس کی ایک معتبر عربی تاریخ ہے۔ جس کی "انگلش ہسٹری آف مور" بہت کچھ تعریف کر چکی ہے۔ ۱۲

"یہ بات اہل مشرق کی سمجھ میں نہیں آسکتی، کہ کوئی شخص تفریح اور تحقیقات علمی کی غرض سے سفر اختیار کرے، وہ اپنی عقل سے اُس کی یہ دلیل پیش کرتے ہیں، کہ "یہ کِسے پڑی ہے کہ صرف حصول معلومات کی غرض سے خرچ سفر کے سوا ایک دور دراز سفر کی تکلیفیں اور صعوبتیں بخوشی قبول کرے، اس لیے اگر بادی النظر میں سفر کی کوئی غرض نہ معلوم ہو مثل تجارت وغیرہ کے تو کوئی ایسی غرض اُس سے بہت جلد منسوب کردیتے ہیں جو اُن کے نزدیک قرین قیاس ہو"۔

عالی جناب "لارڈ کرزن" نے ۱۸۸۹ء میں "ایران" خراسان وغیرہ مقامات کا سفر کیا تھا: سفر کی غایت تحقیقات علمی کے سوا "ایرانی پالیسی" کے متعلق ایک امر کی تحقیق تھی۔ ساتھ ہی ایک پہلو (مگر بہت خفیف) اخبار "ٹائمس" کی نامہ نگاری بھی تھی۔ جب یہ "کوچان" میں پہنچے، اور وہاں کے امیر "امیر حسین ایلخانی" سے ملاقات ہوئی تو اُس نے اثناء گفتگو میں "لارڈ صاحب" سے سفر کے اغراض و مقاصد کے متعلق مسلسل سوال کرکے سفر کے فوائد سے اپنی ناواقفی یوں ظاہر کی کہ "آپ یہاں کس لیے آئے ہیں؟ اور کیا چاہتے ہیں؛ سرکار انگریزی آپ کو سفر خرچ دیتی ہے؟ اگر دیتی ہے تو کس قدر دیتی ہے؟ اور اگر نہیں دیتی تو آخر آپ کے خرچ کا کون کفیل ہے؟ (یعنی امیر کے نزدیک یہ حیرت انگیز امر ہے کہ اُس کے خرچ کی خود اُس کی جیب خاص کفیل ہو) ان سوالوں کو "لارڈ کرزن" نہایت ہی تعجب سے سنتے ہیں، اور پھر اُس پر یہ ریمارک کرتے ہیں۔

"اصل یہ بات ہے، کہ سیر و سیاحت، اور معلومات حاصل کرنے کا شوق ایسے جذبات ہیں کہ مشرقی عقل اُن کی قدر و قیمت کے اندازہ سے قاصر ہے۔"

ہندوستان میں اِس وقت سیکڑوں نہیں ہزاروں ایسے لوگ ملیں گے جو اپنی عمر کے آخری حصہ کی سیر کر رہے ہیں، اور انھیں سفر آخرت درپیش ہے۔ مگر باوجود اس آسانی سفر کے (جو آج کل ریل اور دُخانی جہازوں کی بدولت دنیا کو نصیب ہے) اُنھوں نے تمام عمر میں ریل میں ایک دن کا سفر بھی نہ کیا ہوگا، اور ایک کسی دل جلے سیاح کا (جو غالباً ریگستان عرب اور دریائے عجم کی تکلیفیں اٹھایا ہوا ہے) یہ مقولہ یاد کرلیا ہوگا کہ "السفر

؎ دیکھو جبرنی انٹو "خراسان"، صفحہ ۵۷۹، ۱۳

صورت اسفر‘‘ !!!

مسلمانوں کے لیے سفر کی ضرورت اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ اُن کے مذہب نے ’’ حج ‘‘ کی تعلیم کی ہے، جو مختلف اقسام کے برّی اور بحری سفروں کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اور ہندوؤں کے لیے متبرک مقامات، کاشی وغیرہ کے یاترا مقرر کرنے میں بھی اُن کے مقدس مذہب نے یہی بات ملحوظ رکھی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ آج کل یہ دونوں قومیں ان فوائد عظیمہ سے محروم ہیں، اور اُن کی طبیعت اس شوق وذوق سے خالی ہے۔ !!

اب ہم پھر اپنا قومی رونا روکر اپنے اصل مطلب پر آتے ہیں کہ واقعی انگریزوں کو ’’ آثار قدیمہ ‘‘ سے ایسا شوق ہے، اور وہ اُس کے ایسے متلاشی ہیں جیسے ایک شوریدہ سر عاشق اپنے ’’ پیارے معشوق ‘‘ کی تلاش میں شہر شہر دربدر خاک چھانے، اور جنگلوں، میدانوں، پہاڑوں میں اُس کو تلاش کرے، جہاں اُس کا پتہ لگے، اُس کے دیدار سے کامیابی حاصل کرے۔ !!

’’ ڈاکٹر موسیٰ لیو گستاؤلی بان ‘‘ نے جو ایک بیش بہا کتاب عربوں کے قدیم ’’ تمدن ‘‘ پر لکھی ہے۔ اور جسے علامہ ’’ بلگرامی ‘‘ کی بے بہا کوششوں نے اُردو لباس میں ’’ تمدن عرب ‘‘ کے نام سے جلوہ گر کیا ہے: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ’’ آثار قدیمہ ‘‘ سے فاضل مصنف نے عربی تمدن کا پتہ لگایا ہے۔ اور کیسی مسلسل تاریخ تمدن لکھی ہے؟ عربی رحلیں، عربی جلدیں، عربی کنجیاں، عربی قفل، عربی پردے، عربی قدیم لباس، عربی مکان، عربی سکّے، عربی دروازے کہاں کہاں سے جمع کیے ہیں، اور اُن کی جابجا تصویریں دی ہیں۔ اُس نے مفید تاریخی نتائج نکالے ہیں۔ اور عربی تمدن کی ایسی تصویر ناظرین کے آگے کھینچ دی ہے، جو کسی سیّاح کے بیانات سے بھی نہ کھنچ سکتی۔ اور یہ صرف ’’ آثار قدیمہ ‘‘ کی تلاش کا نتیجہ ہے۔

یورپ کے اکثر شہروں میں متعدد انجمنیں صرف ’’ آثار قدیمہ ‘‘ کی تلاش کے لیے قائم کی گئیں ہیں، جس کے ممبر مختلف ممالک کا سفر کرتے ہیں، اور وہاں جو آثار دیکھنے کے قابل ہیں، انھیں دیکھ کر اُن کے فوٹو لاتے ہیں، اور جو لینے کے قابل چیزیں ہیں، اُنھیں بہ قیمت رچاہے وہ قیمت اپنے اعدادی شمار سے پانچویں درجہ میں قدم

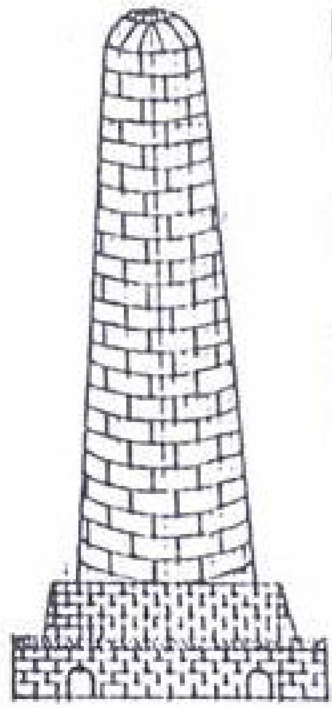
رکھتے ہو) خرید کر لاتے ہیں ۔ اور انجمن انھیں جلسہ میں پیش کرتی ہے ، اور اُن کی کیفیت شائع کرتی ہے۔ ہم یہاں بعض اُن "آثار قدیمہ" کا جن کا انگریزوں نے نہایت عرق ریزی سے پتہ لگایا ہے ذکر کرتے ہیں۔ جس سے ناظرین انگریزوں کی تلاش اور محنت کا اندازہ کر سکیں گے ۔

(باقی آیندہ)

ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی مقیم کلکتہ۔

منارِ خسرو گرد

(بہ سلسلۂ آثارِ قدیمہ)



از نقش و نگارِ در و دیوارِ شکستہ
آثار، پدیداست صنادید عجم را!

اگر ایک مسافرِ عجم، مشہدِ مقدس سے طہران تک کا دلچسپ سفر کرے، تو اُسے تیرہ منزلیں طے کرنا پڑیں گی۔ پہلی منزل اُس کی مشہد سے شریف آباد تک، دوسری شریف آباد سے قدم گاہ تک، اور تیسری قدم گاہ سے نیشاپور تک ہوگی: اور وہ مسافر اس خیال سے اپنی طبیعت کو خوش کر سکے گا کہ مُدت تک صحارائے فارس کی خاک چھاننے کے بعد، آج مقبرۂ عمر خیام کی دل خوش کن زیارت سے ایک عبرت ناک سبق حاصل کر سکوں گا۔ مشہد سے جب وہ ایک عبرت ناک سبق حاصل کر کے آگے بڑھے گا، تو اٹھارہ میل سے زائد سفر کے بعد، جس میں سوائے چٹیل میدان کے کوئی دلچسپ نظارہ آنکھوں کے لیے طراوت بخش نہ ہوگا، وہ چوتھی منزل زعفرانی تک پہنچے گا جہاں اُسے ایک قدیم کارواں سرائے کے ٹوٹے پھوٹے کھنڈر نظر آئیں گے، اور اُسی مسافر کو دوسرا عبرت ناک سبق حاصل ہوگا۔ زعفرانی سے آگے اُس کا گزر سبزوار ایک شاداب زمین پر ہوگا، اور جہاں دُور سے اُسے ایک نہایت قدیم ایرانی اثر اپنی ٹوٹی پھوٹی حالت میں سر بہ فلک کھڑا نظر آئے گا؛ اور اگر علامہ اوڈونون

خدنگ نظر، لکھنو۔ مارچ ۱۹۰۳ء، ص ۵ تا ۸۔

کی تشبیہ جائز رکھی جائے، تو کہا جا سکتا ہے، کہ ایک عظیم الشان کارخانے کی چمنی نظر آئے گی، اور ایک ناواقف مسافر دھوکا کھا کر پہلے ہی سے اُس کے متعلق یہ رائے قائم کرے گا۔

یہ مَنار ایرانی تاریخوں میں مَنار خسروگرد کے نام سے مشہور ہے، اور تمام سیاحان ایران نے اِسے اِسی نام سے یاد کیا ہے۔ یہ مَنار ایک مُدت سے مورخوں اور سیاحوں کی محققانہ تحقیقات کا مبحث بنا ہوا ہے، اور اِس کی قدامت کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آثارِ عجم میں سے یہ نہایت قدیم اثر ہے، اور جہاں تک دیکھا جاتا ہے، یہ ایک تاریخی عمارت معلوم ہوتی ہے۔ بعض انگریزی سیاحوں نے اس کی تحقیق میں سخت دھوکے کھائے ہیں، اور دُور از کار قیاسوں سے کام لیا ہے۔ آثارِ قدیمہ کے دلچسپ سلسلے میں آج اس قدیم مَنار کی تاریخ پیش کرتا ہوں۔

منار کی ظاہری حالت :

علامہ اوڈونووان نے اس منار کی ظاہری صورت کو کسی کارخانے کے دود کش سے تشبیہ دی ہے، اور لارڈ کرزن اُس کی تشبیہ پر صاد کرتے ہیں؛ مگر ساتھ ہی یہ بھی لکھتے ہیں، کہ "جب ہم اس مَنار کے نزدیک پہنچتے ہیں، تو ہمارا یہ خیال غلط ثابت ہوتا ہے۔ اور ایک ناتمام لاٹ معلوم ہوتی ہے۔

یہ لاٹ ایک سو فیٹ سے زیادہ بلند نہیں ہے، اور اس کے نیچے کی کرسی تقریباً چھ فیٹ کی ہے۔ اس کی عمارت صاف بتلا رہی ہے، کہ قدیم عربی اصول و طریق عمارت سے کام لیا گیا ہے۔ اس کی اینٹیں اِس طریق سے چُنی گئی ہیں، کہ اُن میں ایک آرائشی صورت نکل آئی ہے۔ لاٹ کی کرسی کنکر اور چونے سے تیار کی گئی ہے: جس پر ایک گاؤدم صورت میں یہ کھڑی ہے۔ اس کرسی کے نیچے آٹھ فیٹ لمبا ایک چبوترہ ہے۔ اور اس کے گوشوں پر دروازے بنے ہوئے ہیں، جس کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے ستون کھڑے کیے گئے ہیں، اور ایک کچی دیوار بھی کھچی ہوئی ہے۔

جے۔ بی۔ فریزر، جس نے ۱۸۲۲ء میں ایران کا سفر کیا ہے۔ لکھتا ہے، کہ "اس لاٹ پر ایک چکّر دار زینے سے، جو اُس کے اندر ہے، میں اوپر چڑھا تھا، اور اُس کی اندرونی کیفیت دیکھی تھی۔"

لہ دیکھو "پرشیا اینڈ دی پرشین کوئسچن" ۱۲ آزاد۔

اسی طرح علامہ اوڈ ونووَن نے بھی ۱۸۸۰ء میں اُس کے اندرونی زینے طے کیے۔ مگر اب وہ زینہ غالباً منہدم ہوگیا ہے : کیوں کہ ۱۸۸۹ء میں لارڈ کرزن بہادر نے جب سفر ایران کیا، تو اُنھیں یہ زینہ نہیں ملا اور اُنھیں بالآخر یہی خیال ظاہر کرنا پڑا، کہ وہ زینہ اب منہدم ہو گیا ہے۔"

مَنار کی قدیم تاریخ، اور مختلف رایوں کا خلاصہ :

علامہ اوڈونووَن کا یہ خیال ہے، کہ "یہ ایک ایرانی عمارت ہے، اور چوں کہ اذان کے لیے ایران میں ایک مَنار کی، جس پر غلام گردش بنی ہو، ضرورت ہوتی ہے ؛ اس لیے یہ لاٹ بھی اُسی قبیل کی ہے۔"

کرنیل ویلنٹائن[1] کا یہ خیال ہے، کہ "یہ مَنار، جو کچّی اینٹوں سے بنایا گیا ہے خسرو کے زمانے سے نسبت رکھتا ہے۔"

غالباً ویلنٹائن کو یہ دور دراز کار قیاس اس منار کے نام کی وجہ سے کرنا پڑا، جو خسرو گرد مشہور ہے، حالاں کہ یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے، کہ کسی چیز کے نام سے اُس کے بانی یا موجد یا بادشاہ کا ذکر نکالا جائے۔ اکثر مواقع پر بے شک ایسا ہوتا ہے کہ نام بانی کا تعلق پیش کر دیتا ہے۔ اکبرآباد شاہجہان آباد بتلا رہے ہیں، کہ وہ اکبر شاہ اور شاہجہان کے بنائے ہوئے ہیں، لیکن ضرور نہیں ہے کہ پنجاب، کلکتہ اور بمبئی کے بی پنج باکل یا مب نام رکھنے والے ہوں،

اس منار کے متعلق یہ دھوکا زیادہ تر انگریز سیّاحوں کو اس لیے ہوا، کہ اُنھوں نے اُس کوفی خط کی عبارت پر، جو منار پر اُبھری ہوئی اینٹوں سے لکھی ہوئی ہے توجہ نہیں کی ورنہ صاف معلوم ہو جاتا، کہ اس عمارت کو کس بادشاہ سے تعلق ہے۔

اس منار پر جو کوفی خط میں کتبہ لکھا ہوا ہے، وہ اس امر کو صاف بتلا رہا ہے، کہ اس منار کا زیادہ تر تعلق عربوں سے رہا، نہ کہ ایرانیوں سے ؛ جیسا کہ اوڈونووَن کا خیال ہے، ورنہ کوئی ضرورت نہ تھی، کہ اس پر کتبہ عربی میں لکھ کر ایرانی سیّاحوں کو دھوکا دیتے!

اس کتبے سے معلوم ہوتا ہے، کہ سلطان محمد شاہ ابن ملک شاہ سلجوقی کے عہد میں یہ منار

---

[1] ویلنٹائن نہایت قابل اور فاضل نکتہ سنج سیّاح گزرا ہے جس نے اِن ممالک کی مدت تک سیاحت کی ہے۔ اس منار کا بیان اُس کی تصنیف "کلاوڈس اِن دی ایسٹ" کے صفحہ ۱۶۶ میں دیکھنا چاہیے ۱۲ آزاد۔

تعمیر کیا گیا۔ اس حساب سے یہ منار ۵۰۵ھ اور ۱۱۱ سنہ میں تیار کیا گیا ہے، اور اس کی عمر نو سو برس سے زیادہ ہو چکی ہے۔ کتبے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے، کہ اُس زمانے میں سلطان سنجر والی خراسان تھا۔ ۱۱۲۲ سنہ میں افغانوں نے جب حملہ کیا تھا، تو یہ منار بہت ٹوٹ گیا تھا۔ اس لیے نادر شاہ کی سلطنت نے جب عروج پکڑا، تو اُسے اُس کی طرف توجہ ہوئی؛ اور اس نے اُس کی نہایت عمدگی سے مرمت کر کے اُسے مستحکم اور پائدار کر دیا یہاں تک کہ آج ہماری نگاہیں اسے دیکھ کر زمانۂ سلف کو یاد کرتی ہیں۔

وجہ تسمیہ :

اِس کے نام کی وجہ سے، اس کے بانی کو خسرو قرار دینا یوروپین نگاہوں کی تحقیق ہے، جسے ہم کبھی تسلیم نہیں کر سکتے۔ دراصل ضلع سبزوار کا۔ جس سے اب چار میل کے فاصلے پہ جانب غرب یہ موجود ہے، خسرو گرد خاص مقام تھا، اور اور مقامات اُسی کے اضلاع میں شمار ہوتے تھے۔ بلا شبہ یہ قیاس صحیح ہے، کہ جب بادِ فنا کے جھونکوں نے خسرو گرد کو تباہ و برباد کر کے بے نام و نشان کر دیا تو زبان خلائق پر اس منار کا جو اُس شہر کی تنہا یادگار ہے، یہی نام مشہور ہو گیا، اور آج تک لوگوں نے اُسے اِسی نام سے یاد کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ یہی اُس کا علَم ہو گیا۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

افغانستان

بلادِ افغانستان کی آب و ہوا اُن کے خطِ استوا سے بُعد کے مختلف ہونے اور اُن میں بلند پہاڑوں اور پست وادیوں کے واقع ہونے کے اعتبار سے حرارت اور برودت میں مختلف ہوتی ہے ؛ اور فصلوں اور موسموں کے تغیّر سے بدلتی رہتی ہے : لیکن چوں کہ وہ عفونت اور فاسد مادّوں سے پاک ہوتی ہے، اس لیے وہ صحت کے واسطے مفید ہے ؛ اور کم تر اُن میں وہ بیماریاں پائی جاتی ہیں جو ہوا کے بگاڑ سے پیدا ہوتی ہیں، جیسے امراض و بائی اور شہروں اور قصبوں کے مکانات عموماً یک منزلہ اینٹوں کے بنے ہوئے زینت و آرایش سے معرّا ہوتے ہیں، سوائے شہر کابل کے ؛ اُس کے اکثر مکانات کاٹھ اور پتھر کے ہیں۔ اور بعض میں باغ اور چمن اور تالاب بھی پائے جاتے ہیں۔ اُن کی شاہ راہیں اور سڑکیں تنگ اور کج و پیچ ہوتی ہیں : لیکن شہر قندھار کی شاہ راہیں اس سے مُستثنیٰ ہیں، وہ وسیع اور سیدھی ہیں۔ زمانۂ گذشتہ میں اِس ملک میں جو بلند، پختہ اور آراستہ جامع مسجدیں تھیں، وہ دشمنوں کے پے در پے حملوں اور آئے دن کی لڑائیوں کے باعث سب منہدم ہو گئیں۔ ہاں، کچھ تھوڑی سی بچ گئی ہیں۔ اور جو کچھ اب تک پائی جاتی ہیں، اُن میں بھی مضبوطی اور پائداری اور زیب و زینت نہیں۔ شہروں اور قصبوں کے گرد شہر پناہیں ہیں، جن پر پُرانی طرز کی بنی ہوئی بُرجیاں ہیں۔ یہ توپوں کا سامنا نہیں کر سکتیں۔ ہاں، سواروں کے حملوں کو روک سکتی ہیں۔ ہاں، شہر ہرات اور شہر کابل میں سے ہر ایک کے لیے ایک قلعہ ہے : ہرات کا قلعہ ایک چار دیواری سے گھرا ہوا ہے، جو ایسی مٹی کی بنی ہوئی ہے، جس پر توپ کے گولے اثر نہیں کرتے ؛ اور کابل کا قلعہ پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے، اُن پر بُرجیاں اور استحکامات ہیں، جن سے دشمن کو ایک مدّتِ دراز تک روکا جا سکتا ہے۔

افغانستان کی زمین ہر قسم کی پیداوار کی صلاحیت رکھتی ہے ؛ اُس کو دریا اور ندیاں سیراب کرتی ہیں، لیکن فتنہ و فسادات کی کثرت اور باشندوں کی زراعت، پُلوں کے استحکام، نہروں کے کھودنے، اور پُلوں کے بنانے کے فنون میں مہارت نہ رکھنے کے باعث، اکثر زمین

خدنگ نظر، لکھنؤ - اپریل ۱۹۰۳ء - ص ۸ تا ۱۱

بے آباد پڑی ہے؛ اور دریا وادیوں اور ریتلی زمین میں ہو کر غیر معتد بہ فائدہ پہنچانے کے بہتے ہیں۔ اس پر بھی وہاں کے باشندے گیہوں، جَو، چاول، جوار، چنے، باقلہ، بقولات اور سبزیوں وغیرہ کی زراعت کرتے ہیں، جو اُن کی وجہِ گزران ہے، اور کچھ نہ کچھ تجارت کے لیے روئی، تمباکو، افیون اور گانجے کی کاشت بھی کرتے ہیں۔ اور اپنی طاقت بھر اس قسم کے درختوں کے لگانے اور اُن کی پرداخت کرنے میں کوشش کرتے ہیں؛ جیسے انگور، شفتالو، خوبانی، ناشپاتی، سیب، بہی، انار، بادام، اخروٹ، عناب، پستہ، توت وغیرہ۔ اور ہرات والے ریشم کے کیڑے کی پرورش کرتے ہیں۔ اور جلال آباد میں گنّے کی زراعت کی جاتی ہے۔ اور افغانستان کے بعض پہاڑوں پر صنوبر، مصطگی، جنگلی پستہ، اور گولر کے درخت بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔ اور جو کچھ میوے اِن ممالک میں پائے جاتے ہیں، نہایت نفیس ہوتے ہیں۔

صنائع اِن ممالک میں بہت ہی کم ہیں۔ اور جو کچھ ہیں، وہی ہیں جو ارثاً اُن کے باپ دادوں سے چلے آتے ہیں، جن کی درستگی میں وہ کسی قسم کا اہتمام نہیں کرتے۔ من جملہ اُن کے ریشمی کپڑوں کا بُننا اور ایک قسم کے بغیر رنگے ہوتے کشمیرے کا بنانا (جس کو وہ لوگ "پٹو" کہتے ہیں) اور سیمبور کا[1] (شہر کابل میں) تیار کرنا ہے۔ اور اُن دستکاریوں میں سے ہرات میں عمدہ رنگین قالینوں کا بنایا جانا ہے۔ اور من جملہ اُن کے "جوخ"، ایک قسم کا کپڑا ہے جس کو "برک" کہتے ہیں، جس کا ذکر ہم پہلے قبیلۂ ہزارہ میں کر چکے ہیں، اور کابل اور قندھار میں توپوں، بندوقوں اور تلواروں کے بنانے کے چھوٹے چھوٹے کارخانے پائے جاتے ہیں۔

بلادِ افغانستان کے معاملاتِ تجارت کو زیادہ تر ہند و بخارا و ایران سے تعلق ہے، جو چیزیں وہاں سے ہندوستان کو آتی ہیں، وہ اُون، روئی اور میوے ہیں، اور اِس قسم کی چیزیں اونٹوں کی پیٹھ پر لاد کر لائی جاتی ہیں۔ اور ایران کی طرف "برک" اور سمور[1] کے کپڑے، اور ایک قسم کے جوتے، اور کشمیر کے شال، جو کشمیر اور عنبرسر[2] سے یہاں آتے ہیں، بھیجے جاتے ہیں۔ اور بخارا اور ہند سے یہاں "جوخ"، کتان اور سوتی کپڑے، چائے، شکر، شیشہ، چینی کے برتن، کاغذ، فولاد، لوہا، پیتل، پارہ، ریشم کا کپڑا، اور عقاقیر آتے ہیں؛ اور ایران سے کپڑے

---

[1] "سمور" وہی لفظ ہے جو اوپر مولانا نے "سیمبور" لکھا ہے۔ (ا۔ س۔ ش)

[2] "عنبرسر" پنجاب کا وہی شہر جسے اب "امرت سر" بولا اور لکھا جاتا ہے۔ (ا۔ س۔ ش)

اور ہتھیار۔ اس ملک میں کانیں بہ کثرت پائی جاتی ہیں، لیکن اس کے باشندے اُن کو کھود کر نکالنے، اور اُن سے منتفع ہونے پر قادر نہیں ہیں۔من جملہ اُن کے قندھار میں سونے۔ بلادِ "خُستت و کرم" میں لوہے، کابل میں یاقوت اور بدخشاں میں لوہے، گندھک۔ یاقوت اور لاجورد کی کانیں ہیں۔

اِن کے علاوہ اور بہت سی کانیں ہیں جو بیکار چھوڑ دی گئی ہیں۔ سلطنتِ افغانستان کی کیفیت، اُس کے شہروں کی وضع، باشندوں کی زندگی کے طریقے، اور اُن کے قبیلوں کے حالات کے خصوص میں جو کچھ ہمیں بیان کرنا تھا کر چکے۔ اور خدا تعالیٰ ہی نے ہمیں اس کام کی توفیق دی۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

تعلیم نسواں

ہماری قوم میں کیوں کر ہو سکتی ہے؟

تعلیم نسواں کے متعلق جو رزولیوشن رام پور کانفرنس میں پیش ہوا۔ اور جس پر نواب عماد الملک نے نہایت مدلل تقریر کی یہ اسی کا اثر ہے کہ آج کل قوم کو اس ضروری مسئلے کی طرف توجہ ہو گئی ہے، اور اصول مسلّمہ کی طرح مسٹر امیر علی کے ہم زبان ہو کر یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ قوم کا سنورنا، بگڑنا تعلیم نسواں کے ہونے نہ ہونے پر موقوف ہے۔ بے شک یہ توجہ ہمارے مستقبل کی ترقیوں کی بنیاد ہے، اور ثابت کرتی ہے کہ قوم کو اپنی ضرورتوں کا احساس ہو گیا ہے۔ یہی وہ بات ہے جو قومی زندگی کا اصلی عنصر ہے، اور یہی وہ راز ہے، جس سے قومیں گرتے گرتے سنبھل جاتی ہیں۔ لیکن باوجود اس کے اس توجہ کو عملاً دنیا میں لانے کے لیے آج تک جو کوشش کی گئی ہے، اگر بزرگان قوم ہماری گستاخی معاف کریں تو ہم نہایت زور کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ کوشش صرف فضول ہی نہیں بلکہ ایک حد تک قوم کے لیے مضر بھی ہے۔ اور اگرچہ اس کا اس وقت احساس نہ ہو لیکن عمل کے بعد اس کا بے شک افسوس ہو گا۔ اس لیے مناسب ہے کہ ابھی سے سوچ سمجھ لیا جائے۔ تعلیم نسواں کے متعلق اس وقت تک جتنی رائیں شائع ہوئی ہیں ان کا ماحصل یہ ہے کہ پرائیویٹ مکاتب جاری کیے جائیں یا ہر خاندان کے لیے علٰحدہ علٰحدہ مکتب بنا دیے جائیں جہاں اس خاندان کی لڑکیاں تعلیم حاصل کریں۔ مسٹر ماریسن بھی اسی کے قریب قریب رائے دیتے ہیں۔ مسٹر شوکت علی کی رائے یہ ہے کہ ایک مدرسہ قائم کر کے پہلے استانیوں کو تعلیم دی جائے، جو اوسط درجے کی تنخواہوں پر گھروں میں جا کر پڑھائیں۔ ہم ان تمام رایوں کو نہایت افسوس کے ساتھ دیکھتے اور ہندوستان کے بے کس فرقہ نسواں کی بدبختی پر روتے ہیں، کہ ان کی تعلیم کی طرف اگر قوم کو توجہ بھی ہوتی ہے تو اس کا عملی نتیجہ ہونے نہ ہونے کے برابر نظر آتا ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ

علی گڑھ منتھلی۔ بابت ماہ نومبر ۱۹۰۳ء جلد ۱ نمبر ۱۱ صفحہ ۲۲-۱۹

یہ سب کچھ سہی لیکن اس قسم کی تعلیم سے عورتوں کو کون سا فائدہ حاصل ہوگا؟ اس تعلیم سے جس قدر لیاقت عورتوں کو حاصل ہوگی، اس سے بدرجہا اچھی لیاقت قدیم خاندانوں کی خواتین میں موجود ہے۔ خود ہمارے خاندان میں ہر لڑکی کے لیے اردو، فارسی اور دینیات کا پڑھنا لازمی امر ہے۔ لیکن نہ اس سے وہ فائدہ حاصل ہوتا ہے جس کی ہمیں تمنا ہے، نہ ان کے دماغ روشن ہوتے ہیں، نہ اُن کی اولاد پر اچھا اثر پڑتا ہے، نہ وہ تعلیم یافتہ شوہر پر اثر ڈال سکتی ہیں۔ نہ وہ اس کے دست و بازو ہو سکتی ہیں، بلکہ اس ادھوری تعلیم سے ان میں آزادی کا خیال (جو ہر انسان میں فطرۃً موجود ہے۔ اور جسے ہندوستانی خارجی اثرات سے دبا دیا گیا ہے) پیدا ہو جاتا ہے، اور پھر جب سوسائٹی میں جائز آزادی کی کوئی صورت نہیں ملتی تو وہ ناجائز طریقے سے آزادی چاہتی ہیں اور ایسے واقعات ہو جاتے ہیں جنھیں تعلیم نسواں کے مخالف تعلیم کا نتیجہ بتلاتے ہیں حالاں کہ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ ان کو ادھوری تعلیم دی جاتی ہے۔ اور غلامی سے نجات نہیں ملتی۔ بلبل کو باغ کی بہار کی ایک جھلک دکھا کر پھر پنجرے میں بند کر دینا ٹھیک ایک عورت کو تعلیم دے کر اس آزادی سے جو فطرت نے ادا کی ہے مستفیض نہ کرنا ہے۔ ہم صاف صاف کہہ دیتے ہیں، اور اسے فیصلہ قطعی سمجھ لو، اصول مسلّمہ کی طرح مان لو کہ جب تک متعارف پردہ ہندوستان سے نہ اُٹھے گا۔ جب تک عورتوں کو جائز آزادی، اور وہ آزادی جس کا اسلام مجوز ہے، نہ دی جائے گی، غلامی میں رکھ کر اور پردے کی تقلید کے ساتھ تعلیم دینی نہ صرف فضول بلکہ مضر اور اشد مضر ہے۔ اس کی ایک نہیں بیسیوں مثالیں مل جائیں گی کہ اس قسم کی تعلیم برے نتیجے پیدا کرتی ہے یا کم از کم ایسی تعلیم سے کوئی مفید نتیجہ نہیں نکلتا۔

انسان فطرۃً آزاد ہے۔ یہ آزادی اس کے تمام غیر ارادی افعال و حرکات سے ثابت ہوتی ہے۔ اگرچہ زمانۂ قدیم میں اس آزادی کو سمجھنے میں بڑی غلطیاں ہوئیں، اور انسان کی آزادی میں استثنا کی گنجایش رکھی گئی۔ اس خیال نے غلامی کی ناپاک رسم پیدا کی۔ یورپ ایک مدت تک اس میں بتلا رہا، لیکن جب علم کی روشنی جاہلانہ تاریکیوں پر غالب آئی تو انسان کی فطری آزادی ظاہر ہوئی، اور تمام یورپی فلاسفروں نے انسان کو بلا استثنا آزاد تسلیم کر لیا، مگر ہندوستان کی سرزمین نے جس کے تخت

سلطنت پر کبھی غلام بھی بادشاہت کر چکے ہیں۔ ایسی آزادی کو ضائع کر دیا۔ عورتوں کو حبشی غلاموں سے تشبیہ کے لائق بنا دیا اور آزادی مردوں کے لیے مخصوص کر دی (اگرچہ ہندوستان کے مرد بھی خیر سے آزاد نہیں ہیں) کیا اس برٹش عہد میں، کیا اس جدید ہندوستان میں پھر اس غلامی کو قائم رکھنا چاہتے ہو؟ عورتوں کی غلامی ایک جاہلانہ کام ہے۔ کیا جہالت اور علم کو جمع کرنا چاہتے ہو؟ عورتیں غلام بھی بنی رہیں اور عالم بھی ہو جائیں! جب تک عورتوں کو آزادی نہ دی جائے گی، کبھی تعلیم مفید نہیں ہو سکتی، اور نہ عام طور سے تعلیم شائع ہو سکتی ہے۔

بعض حضرات ہمارے اس بیان کے جواب میں فرماتے ہیں کہ جب ہندوستانی عورتوں کو آزادی دینا پسند نہیں کرتے تو بدرجہ اقل کیا انھیں تعلیم سے محروم رکھا جائے؟ لیکن ہم نہیں سمجھتے کہ یہ جواب کس بنا پر دیا جاتا ہے یہ تو ظاہر ہے کہ وہ آزادی دینی پسند نہیں کرتے، لیکن جب قوم میں اصلاح کا کوئی ہمارا کام ہے تو ہم اپنی اصلاحوں پر قوم کو لائیں گے یا خود ان کی جاہلانہ رائے پر چلیں گے؟ مریض کو اپنے مرض کا احساس نہیں ہے لیکن ڈاکٹر کا فرض ہے یا نہیں کہ اس کے مرض کا کس طرح استیصال کیا جائے؟ ہمیں تو ابھی قوم میں کیا کیا اصلاحیں جاری کرنی ہیں، اگر ہم اسی طرح قوم کی رائے کا خیال کریں گے تو پھر ریفارم کے میدان میں آنا اور ریفارمر بننا کیا معنی رکھتا ہے؟

وہ زمانہ ہمیں نہیں بھولنا چاہیے جب قوم انگریزی تعلیم کو پسند نہیں کرتی تھی۔ انگریزی پڑھنے والوں کے لیے فَقَدْ کَفَرَ اور انگریزی لباس پہننے والوں کے لیے مَنْ تَشَبَّہَ بِقَوْمٍ فَھُوَ مِنْھُمْ کے بھرے ہوئے طپنچے تیار تھے کیا ہمیں قوم ہی کی رائے پر چل کر بجائے محمڈن کالج کے مدرسہ عربیہ تیار کرنا تھا؟ اور بورڈرز ڈریس بجائے ٹرکش کے عربی قائم کرنا تھا؟ سرسید کو سمجھنا تھا کہ جب قوم انگریزی پر راضی نہیں ہوتی تو بدرجہ اقل عربی سے کیوں محروم رکھا جائے؟ لیکن ہم تمام معاملہ اس کے برعکس دیکھتے ہیں۔ انگریزی کا پڑھنا مسلمانوں کے لیے طبیعت ثانیہ ہو رہا ہے، اور انگریزی لباس انیسویں صدی کے نوجوانوں کے لیے لازمی ہے۔ اس وقت اگر قوم حریت نسواں پر راضی نہیں ہوتی تو کچھ دنوں میں ہماری کوششوں سے

راضی ہو جائے گی۔ ہمارا قوم کی جہالت پر راضی ہو جانا اور پردے کے ساتھ تعلیم دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ ہم قوم کو پردے کا اور عادی بنا رہے ہیں، اور اس لیے اب ہمیں کبھی عورتوں کی آزادی کا خواب نظر نہیں آسکتا۔

اگر ہمیں تعلیم نسواں کی واقعی ضرورت ہے اگر یہ سچ ہے کہ "تعلیم یافتہ نسل بلا تعلیم یافتہ ماؤں کے نہیں پیدا ہو سکتی" اگر یہ ٹھیک ہے کہ مردوں کا نیک ہونا عورتوں کے نیک ہونے پر موقوف ہے تو پہلے اس کی کوشش کرو کہ یہ پردہ جو ہماری ترقی کا ایک بڑا مانع ہے، یہ عورتوں کی غلامی جس نے ہماری عورتوں کو کسی علمی ترقی کے لائق نہیں رکھا ہے۔ جس سے ان کے دماغ کے قویٰ بالکل خراب ہو گئے ہیں۔ اٹھا دیا جائے۔ اور وہ پردہ جس کا اصلی جوہر حسن اخلاق ہے (اور جو بلا تعلیم کے پیدا نہیں ہو سکتا) جو عورت کی عصمت کی ایسی حفاظت کرتا ہے جسے مضبوط سے مضبوط ہاتھ اور بڑے سے بڑا وسوسہ متزلزل نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد تعلیم کے زیور سے عورتوں کو آراستہ کرو، اور ان میں اس کی استعداد پیدا کرو کہ وہ اپنی اولاد کو خود عمدہ تربیت کر سکیں۔ بچپن ہی سے ان میں عمدہ اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اس کوشش کے بعد ہندوستان میں جو نسل نظر آئے گی وہ بے شک تعلیم یافتہ قوم کے لیے باعث فخر اور ملک کے لیے باعث شرف ہوگی۔ ورنہ اس قسم کی تعلیم سے جس کی ابھی کوشش جاری ہے، کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ سوا اس کے کہ کوشش میں ہمارا وقت ضائع ہو، اور عمل کے بعد افسوس ہو۔ وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلَاغُ۔

آئندہ نمبر میں ہم وہ صورت پیش کریں گے جس سے تعلیم کی ابتدا ہو اور غیر محسوس طریقے سے پردے کا بھی اثر کم ہو۔[۱]

---

[۱] یہ مضمون مکمل نہیں ہے۔ صرف تمہیدی بیان ہے۔ اصل موضوع پر آیندہ نمبر میں مولانا نے اظہار خیال کا وعدہ کیا تھا لیکن بعد کے نمبروں میں یہ بحث موجود نہیں ہے، اس لیے خیال ہوتا ہے کہ شاید مولانا کو یہ مضمون مکمل کرنے کا موقع نہیں ملا یا کسی وجہ سے مضمون چھپ نہیں سکا، یہاں مضمون کے خاتمے پر مولانا کا نام اس طرح چھپا ہے۔ "ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی، مقیم کلکتہ۔ ایڈیٹر خدنگ نظر"۔ شاید جس وقت مولانا نے یہ مضمون اشاعت کے لیے بھیجا ہوگا، خدنگ نظر کے حصۂ مضامین کی ترتیب و ادارت سے مولانا کا تعلق ہوگا، لیکن نومبر ۱۹۰۳ء میں جب یہ مضمون چھپا تھا تو مولانا نے اپنا رسالہ "لسان الصدق" نکال لیا تھا، اور خدنگ نظر سے تعلق باقی نہ رہا تھا۔

قمار باز

طامس ایک سنگ دل قمار باز رات کو گھر سے نکلا، جس طرح قطب نما کی سوئی ہمیشہ قطب کی طرف رہتی ہے، اسی طرح قمار باز کا دل بھی قمار خانے سے ہٹ نہیں سکتا۔ لیکن عین اسی وقت اس گھر میں ایک اور دل بھی تھا، جس کی محبت کی سوئی بالکل اسی طرح طامس کے مہر دل کی طرف پھری رہتی تھی۔

اس کی بیوی نے اپنے شیر خوار بچے کی طرف دیکھا جس کو صبح سے دودھ کا ایک قطرہ بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ کیوں کہ خود اس کی ماں پر فاقے کی دو شامیں گزر چکی تھیں۔ وہ بالک رہا تھا لیکن اس نے جلد ہی اس کی طرف سے آنکھیں ہٹالیں، اور ان پُر آب آنکھوں میں جن میں حسرت و مایوسی کے آنسو بھرے ہوئے تھے، طامس کی طرف دیکھا۔

آہ! "عورت" کی نظر جب کہ اس میں مایوسی ہو۔ آہ وہ فطرت عالم کی حکمران جمیل، جس کی نگاہ قاہر امیدوں اور مایوسیوں کی بخشش گاہ ہے۔ کون دیکھ سکتا ہے، کہ خود کسی نگاہ سے رحم کی طالب ہو۔

لیکن طامس نے اس کی نگاہ امید طلب اور اشک داد خواہ کی حقارت کی۔ اس نے بے پروائی سے اسے ٹھکرا دیا۔ وہ سوچنے لگی کہ یہی بے مہر اشک محبت سے نا آشنا آنکھیں تھیں۔ جنھوں نے اب سے پانچ سال پہلے ایک ایسی ہی رات میں اپنے اشکہائے محبت خواہ سے میرا ہاتھ تر کر دیا تھا۔۔۔ اس نے مجھ سے محبت مانگی تھی، لیکن آج میں اس سے رحم کی طالب ہوں۔

وہ قمار خانے کی طرف روانہ ہو گیا۔ کاش وہ کسی طرح دیکھ سکتا کہ یاس و حسرت کی نگاہیں کس طرح اس کا تعاقب کر رہی ہیں؟ وہ عشق قمار سے بے خود تھا۔

مولانا کی یہ کہانی شاہراہ دہلی آزاد نمبر میں ماخذ کے حوالے کے بغیر نقل کی گئی ہے، میرے خیال میں یہ بالکل ابتدائی دور کی ہے، اس لیے ترتیب میں اسے ۱۹۰۴ء سے پہلے جگہ دی گئی ہے۔

کاش اسے یاد آتا کہ ایک دل ہے، جو اسی کی طرح قمار محبت میں بازی ہار چکا ہے، اور اب فتح یاب دشمن کے قبضے میں ہے۔

صبح کو وہ اٹھی، بچے کو گود میں لیا، اور قمار خانہ میں آکر اپنے گم گشتہ قمار کو تلاش کیا، اس کا سر چکرا رہا تھا۔ مگر اس کو سننا پڑا کہ رات کو پولیس کا ایک گروہ اس کے شوہر کو گرفتار کر کے لے گیا ہے۔ اب اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ سفر حیات کی ایک خاص منزل آنسوؤں کی بھی تھی، مگر وہ اس سے گزر چکی تھی۔

وہ راہ پوچھتی ہوئی قید خانے کے دروازے پر پہنچی۔ بچہ اس کی گود میں تھا۔ دروازے کے روزنوں سے جھانک کر ڈھونڈنے لگی کہ طوق و زنجیر کی فضائے محن میں، وہ کہاں ہے؟

کون کہہ سکتا ہے کہ اس وقت اس کے دل میں کیا کیا خیالات گزر رہے تھے؟ عورت کے دل کو اس گنج مخفی، اس طلسم جمیل، اس عقدۂ حسین کے دل کو دنیا میں کون سمجھ سکتا ہے۔

ممالک اسلامیہ اور سید احمد خانی خیالات

راز الفت کھل گیا باطن جو تھا ظاہر ہوا
اب تو ہے سب کی زباں پر جو ہمارے دل میں ہے

سر سید احمد خاں مرحوم کی بے نظیر فطری قابلیت، بے مثل عالی دماغی اور اُن کی اسلامی تحقیقات کی قدر اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ جو آواز اب سے تیس چالیس برس پیشتر اس اسلامی دور کے آخری مجدد کی زبانی سرزمین ہند میں بلند ہوئی تھی، آج مصر، اسلامبول اور خود ہندوستان کے ہر روشن خیال اور تعلیم یافتہ شخص کی زبان سے نکل رہی ہے، وہ راگ جو اس زمانے میں ہمارے کانوں کو نہایت ناگوار گزرتا تھا، اور جسے ہم اپنے خیال میں بے وقت کی راگنی سمجھ رہے تھے آج ہمارے تفنن پسند کانوں کو نہایت سریلا اور دل کش معلوم ہو رہا ہے۔ اور ہم ہیں کہ اس راگ پر مست ہوئے جاتے ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص اس راگ پر مٹا ہوا ہے۔ پچھلی مخالفت اب خود ہم کو شرمناک معلوم ہوتی ہے، اور تعجب ہے کہ ایسی صاف اور صریح باتیں، دبو تعصب اور جہالت کے رعب میں کیوں کر ہمیں ناگوار معلوم ہوتی تھیں۔ اس زمانے میں سر سید کی مثال ایک ایسے روشن ضمیر مدبر کی سی ہے جو غفلت اور ناواقفی کے زمانے میں ایک اونچے پہاڑ کی بلند چوٹی پر چڑھ کر اپنی غافل قوم کو ایسی تعلیم دینا شروع کر دے جسے ان کی جہالت اور غفلت سے کوئی نسبت نہ ہو۔ ان کے کمزور خیالات، ان کی حد سے بڑھی ہوئی غفلت اس تعلیم کے حاصل کرنے کی متحمل نہ ہو وہ اس روشن ضمیر کے روشن خیالات پر ہنسیں، اور اس عاقلانہ تعلیم کو دیوانگی سے تعبیر کریں۔ جہالت کا زور ان کی طبیعتوں پر یہاں تک غالب آئے کہ وہ اس محب قوم کو دشمن ملت سمجھ کر اس کی مخالفت پر آمادہ ہو جائیں۔ تعصب کا خوف ناک دیو اُن کی عقل پر یہاں تک مستولی ہو جائے کہ وہ اپنے جان و ایمان کے فدائی کی جان لینی اور اسے خدمت قومی کے جرم پر طرح طرح کی تکلیفیں دینی عین ایمان سمجھ لیں مگر وہ روشن ضمیر مدبر اور

وکیل امرتسر ۱۹۰۴ء بحوالہ الکلام پٹنہ ۲۵ ستمبر ۱۹۶۰ء۔

محتسبِ قوم ان کی ان جاہلانہ حرکتوں کو، بچوں کی نادان حرکات سے تشبیہ دے اور انھیں
اپنی بھلائی برائی سے ناواقف سمجھ کر انھیں ایسی قابل سرزنش حرکتوں پر بھی معذور
رکھے۔ لیکن یہ پکار پکار کر کہے کہ اس زمانے کو دور نہ سمجھو۔ جب تم میں اپنی برائی بھلائی
کی تمیز ہو جائے گی اور تم وہ سمجھو گے جو میں آج سمجھ رہا ہوں، اور وہ جانو گے جو میں آج
جان رہا ہوں۔ اس وقت تم میری اس تعلیم کی قدر کرو گے۔ اور تمہیں میری خدمت قومی
اور محبت وطنی یاد آئے گی۔ سرسیّد ہی نے سب سے پہلے یہ دعویٰ کیا کہ اگر بائیبل
موجودہ کی عمدہ اصول پر تفسیر کی جائے تو وہ اختلاف دُور ہو جائے جو بائیبل کے مطالب
اور قرآن مجید میں مدت سے پایا جاتا ہے۔ اور ثابت ہو جائے کہ تثلیث کے مسئلے
کو الہامی بائیبل سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ خود عیسائیوں کا ساختہ پرداختہ مضمون ہے۔
اسی دعوے کا عملی ثبوت اس کی تفسیر تبیین الکلام کی تین جلدوں سے ملتا ہے، جو سرسید
نے اس زمانے میں لکھ کر شائع کی تھیں۔ یہی ضرورت جس نے سرسید کو یہ تفسیر لکھنے پر
آمادہ کیا تھا، ایک مدت کے بعد مصر میں ایک عیسائی عالم نے محسوس کی، اور
وحدت الادیان کے نام سے ایک اخبار جاری کیا جس کی اصلی غرض یہ تھی کہ یہ مقصد
اسلام، نصرانیت اور عیسائیت پر ظاہر کر کے انھیں توحید فی الادیان پر آمادہ کیا
جائے۔ سرسیّد ہی دنیائے اسلام میں وہ پہلا شخص ہے جس نے پہلے پہل یہ ضرورت
محسوس کی کہ جدید فلسفے کے مقابلے میں جدید علم کلام کی ضرورت ہے، اور قدیم متکلمین
کی تصنیفات موجودہ علوم کے لیے کافی نہیں ہیں۔ اگرچہ اس زمانے میں علمائے اسلام
نے اس خیال کی بڑی مخالفت کی۔ لیکن آگے چل کر زمانے نے یہ راز بھی اچھی طرح
سمجھا دیا۔ خود علما اس طرف متوجہ ہوئے اور علم کلام کا جدید اسلوب پر ترتیب دینا
اسلام کی اصلی خدمت تسلیم کی۔ ندوۃ العلماء کے ابتدائی جلسوں کی رپورٹ سامنے رکھو
اور شاہ سلیمان صاحب پھلواردی۔ مولوی محمد حسین صاحب الٰہ آبادی۔ اور مولوی
محمد ابراہیم صاحب آروی مرحوم کی تقریریں دیکھو۔ اسی ضرورت کا رونا نظر آئے گا جس
کے پیش کرنے پر انھیں علماء نے ایک زمانے میں سرسیّد کی تکفیر کی تھی۔ ممالک
اسلامیہ میں اس ضرورت پر ایک عرصے سے توجہ ہو رہی ہے۔ رسالہ الحمیدیہ جو اسی
موضوع پر ایک طرابلسی عالم کی تصنیف ہے۔ ہندوستان میں شائع ہو چکا ہے۔ اس

کے علاوہ "الحق الصریح الاسلام والمدینہ" وغیرہ کئی کتابیں اسی ضرورت پر مصر و بغداد میں شائع ہوئی ہیں۔ مصر اور اسلامبول کے اسلامی رسالوں میں اکثر یہ بحث چھڑی رہتی ہے، اور اس پر مبسوط تحریریں لکھی جاتی ہیں "المنار" مصر کے جس نے قدیم و جدید فائل دیکھے ہیں وہ ہمارے قول کی تصدیق کر سکتا ہے۔ مصر کے مفتی اور جامع ازہر کے لیکچرار شیخ محمد عبدہٗ دیار مصر میں ایک بے بدل عالم و فاضل تسلیم کیے جاتے ہیں۔ المنار میں آج کل آپ کے درس قرآن کا سلسلہ تفسیر القرآن کے عنوان سے شائع ہو رہا ہے۔ جس میں اس اصول پر قرآن شریف کی تفسیر کی جاتی ہے جو کبھی ہندوستان میں مستوجب تکفیر سمجھا گیا تھا۔ حال میں مصر کے روشن خیال عالم محمد فرید وجدی کی اسی موضوع پر ایک مبسوط کتاب ماہوار رسالے کی طرح مسلسل شائع ہو رہی ہے۔ جس کا نام "الاسلام فی عصر العلم" ہے۔ الغرض جو خیال اب سے ۳۰ برس پیشتر سر سید مرحوم نے ظاہر کیا تھا۔ وہی خیال آج کل اسلامی دنیا کا بالعموم ہو رہا ہے۔

انسان فطرتاً آزاد ہے۔ اس کی آزادی کسی خارجی اثر سے زائل نہیں ہو سکتی۔ قدیم فلاسفر اس قدرتی آزادی کی تہ کو نہ پہنچ سکے، اور دنیا میں غلامی کی خلاف فطرت رسم پیدا ہو گئی۔ افلاطون الٰہی نے انسان کی فطرت میں استثنا کو دخل دیا اور صرف اہل یونان کو آزادی کا مستحق قرار دیا، اسی طرح یورپ بھی ایک عرصے تک غلامی کا حامی رہا۔ لیکن جب علم کی روشنی جہالت کی تاریکی پر غالب آئی تو تمام یورپ نے انسان کو فطرتاً آزاد تسلیم کر لیا۔ اور ایک یورپین کو جس آزادی کا مستحق سمجھا وہی استحقاق ایک حبشی اور سرکیشین کے لیے لازمی قرار دیا۔ لیکن برخلاف اس کے اسلامی دنیا ایک عرصے سے غلامی کو جائز سمجھ رہی ہے۔ اور عام طور پر وہاں اس کا رواج ترقی کر رہا ہے۔ سلطان اعظم کا تمام محل سرکیشین لونڈیوں سے آباد ہے۔ اور حرمین شریفین کی رونق غلاموں سے سمجھی جا رہی ہے۔ یورپ اسلام پر بڑے زور سے معترض ہے کہ اسلام انسان کو اس فطری آزادی سے محروم رکھتا ہے۔ اور غلامی کی ناپاک رسم کا حامی ہے۔ اس اعتراض کے رفع کرنے کا سب سے پہلے اسلامی دنیا میں سر سید کو خیال ہوا۔ اور مرحوم نے "ایسیز آن دی لائف آف محمدؐ" میں عقلی و نقلی دلائل سے اسلام کو اس رسم کی اعانت سے بری ثابت کیا اور لکھا کہ مسلمانوں کے اذہان کا بانی مذہب

یا خود مذہب ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔ جس طرح موجودہ مسیحی خیالات کا مسیح جواب دہ نہیں ہے، اور پھر اس سبجکٹ پر ایک مبسوط رسالہ "تبریۃ الاسلام"، لکھ کر اس بحث کا بالکل خاتمہ کر دیا۔ یہی وہ ضرورت ہے جسے ۲۰ برس کے بعد روشن خیال مسلمانوں نے محسوس کیا ہے۔ پچھلے دنوں جب کہ فرانس میں ایک فرنچ پروفیسر اسلام کو غلامی کا مجوز قرار دے کر اس دنیا میں اکیلے آزادی کے حامی مذہب پر لعن طعن کر رہا تھا، ایک مصری عالم احمد شفیق بک آفندی کو اس کے جواب پر توجہ ہوئی، اور اس نے فرنچ میں ایک پر زور رسالہ اسلام کی بریت ثابت کرنے کے لیے فرانس میں شائع کیا۔ جس کی تمام یورپ میں دھوم مچ گئی اور تمام کرسچین اخباروں نے اس پر عمدہ ریمارکس کیے۔ اس رسالے کے عربی ترجمے "الرق فی الاسلام" پر "المؤید" ریویو کرتے ہوئے مصنف کا اسلام پر ایک بہت بڑا احسان تسلیم کرتا ہے۔ یہ تحقیق اس سے پیشتر سر سید کے قلم سے ہو چکی ہے۔ اور اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اسلام پر حقیقی احسان (الرق فی الاسلام کے مصنف سے پہلے) خطبات احمدیہ اور تبریۃ الاسلام کے مصنف نے کیا تھا۔ جس نے اول اول اس ضروری مسئلے پر روشنی ڈالی۔ گو اضافی طور پر "الرق فی الاسلام" کا مصنف بھی شکر گزاری کا مستحق ہے۔

سلسلۂ خواتین انگریزی نمبر ا

ملکہ برتھا

ہم ایک مدت سے دیکھتے آئے ہیں کہ "خاتون" میں اِس قسم کے مضامین بہت کم شائع ہوتے ہیں جن کو ہم قابلِ تحسین لوگوں کی سوانح عمریوں کا مسلسل مجموعہ کہہ سکیں۔

اب ہمارے دلی ولولوں نے ہمارے ایک لائق اور قابل دوست کے ارشاد کی تعمیل کرنے پر ہم کو آمادہ کر دیا ہے۔ اور ہم خوش ہیں کہ ناظرین خاتون کی خدمت میں ایک ناچیز تحفہ پیش کر رہے ہیں۔ علمی دنیا میں ہمارے نزدیک اس سے بڑھ کر اور کوئی چیز نہیں ہے کہ ہم گزشتہ لوگوں کے حالات زندگی سے واقف ہوکر اُن کے اعلیٰ اور عمدہ اصول کو اخذ کریں۔ اور اُن کے نیک اور اچھے کاموں سے اپنی آیندہ زندگی کے لیے کچھ سبق سیکھیں۔

درحقیقت اگر دیکھا جائے تو تاریخ کا ایک جزءِ اعظم سوانح عمری ہے۔ کیوں کہ تاریخ زمانہ کی رفتار سیاسی و تمدنی معاملات: ایجاد و اختراع، جنگ و جدل اور بہت سی چیزوں کا پتا دیتی ہے۔ بمقابل اس کے سوانح عمری اُن اچھی اور نیک طبیعتوں کا مفصّل طور پر حال بیان کرتی ہے۔ جن کے کارناموں کا ذکر تاریخوں میں بار بار آتا ہے۔ مگر جن کی ذات کی نسبت بہت سی مختصر طور پر خبر دی جاتی ہے۔ بہت سے ایسے شخص بھی گزرے ہیں کہ جن کا ذکر تاریخوں میں کہیں نہیں آیا۔ پھر بھی ہمارے پاس اُن کی سوانح عمریاں موجود ہیں جن کے ذریعے سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ اُنھوں نے اپنی زندگی میں کیا کیا کام کیے۔ اس لیے ہم نے اب ارادہ کر لیا ہے کہ ناظرینِ خاتون کے سامنے سوانح عمریوں پر ایک سلسلہ وار مضامین کا تحفہ پیش کریں۔

ہماری نظرِ انتخاب پہلے انگریزی خواتین پر پڑتی ہے کہ جن میں بہت سی ایسی نیک اور عالی دماغ بی بیاں گزری ہیں جن کے اوصاف حمیدہ اور خصائل پسندیدہ کی نسبت ہماری بہنوں کو بھی علم ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنی طرزِ معاشرت اور دستورالعمل کے

لیے مفید اور نفع بخش اُصول اخذ کریں۔

سب سے پہلے ہم جس نیک بخت خاتون کا ذکر کرنے والے ہیں وہ" ملکہ برتھا،" ہے جو بلحاظ زندگی بہت ہی مطمئن رہی اور تمام عمر اُس نے چین اور آسودگی میں بسر کی۔ ملکہ برتھا جو عیسائیوں کی سب سے پہلی ملکہ گزری ہے، اُس کے حین حیات میں کوئی ایسا زبردست واقعہ نہیں گزرا جو خصوصیت کے ساتھ قلم بند کرنے کے قابل ہو۔ تاریخ کے صفحے اُس کے حالات زندگی سے بالکل خالی پائے جاتے ہیں۔

بایں ہمہ اُس کے نیک اندیش اور پاک باطن طبیعت کی وجہ سے اور راستبازی کے اثر سے اس کو ہم ایک منوّر چراغ سے تشبیہ دیں گے کہ جو کفر اور بت پرستی کے تاریک حصّہ میں مدت العمر تک برابر روشن رہا۔ اور بہت سے سیاہ قلب انسانوں کو اپنی روشنی سے روشن کرتا رہا۔ یہ ملکہ شاہ " فارس" کی اکلوتی بیٹی تھی اور بہ نسبت اُس کے والدین کے ہمیں اُس کی دادی کا زیادہ ذکر کرنا پڑے گا۔ کیوں کہ برتھا اپنے زمانۂ طفولیت سے اپنی دادی ہی کے نام سے واقف تھی اور اُسی کا دم بھرتی تھی، اس کا نام " ریڈی گنڈ" تھا جو فرانس کے کسی بادشاہ کی بیوی تھی۔ اُس بادشاہ نے اسے اور اس کے چھوٹے بھائی کو ایک جنگ میں گرفتار کر لیا تھا۔ مگر چوں کہ وہ بہت حسین تھی بادشاہ اُس کے حُسن کا مفتوں ہو گیا۔ علاوہ اُس کے" ریڈی گنڈ" شاہی خاندان سے تھی۔ ان تمام باتوں نے بادشاہ کے دل میں اُس کی محبت ڈال دی۔ جس وجہ سے اُس نے اُس کی پرورش کرنا شروع کی۔ چوں کہ ریڈی گنڈ بُت پرست تھی۔ اُس بادشاہ نے اُسے عیسائی بنا کر تعلیم دینا شروع کی۔ جب وُہ سن تمیز کو پہنچی، اُس سے شادی کر لی۔ مگر غریب ریڈی گنڈ بہت ہی تکلیف میں اپنی زندگی بسر کرنے لگی۔ کیوں کہ اُس کا خاوند بہت ہی ظالم سنگ دل اور ضدی آدمی تھا۔ حالاں کہ اُسے اپنی بیوی سے بہت محبت تھی مگر وہ بے چاری اپنی جان کو آفت سے بچانے کے لیے اپنے خاوند کو چھوڑ کر دُور ایک خانقاہ میں جا کر پناہ گزین ہوئی۔ مصیبت زدہ ریڈی گنڈ نے اپنے ہاتھوں سے اپنے لمبے پیارے گھونگر والے بالوں کو کاٹا۔ شاہی لباس اور جواہرات کو چھوڑ کر ایک نن کی کفنی پہننا منظور کر لیا۔ آخر کار اُسی سنگدل بادشاہ کو اُس کا پتا لگ گیا اور وہ اپنے ظالمانہ برتاؤ کرنے

بہت ہی نادم ہوا۔ اُس کے معاوضہ میں اُسے ایک بڑی جاگیر عطا کی۔ جس سے ریدی گند نے ایک خانقاہ بنوائی اور باقی زندگی تعلیم دینے اور نیک کاموں کے لیے وقف کر دی۔ وہ خود خانقاہ کی منتظمہ بھی تھی۔ اُس کے انتظام کے قوانین اور آئین اُسی نے وضع کیے اور محتاجوں کی حاجت روائی کیا کرتی۔ مظلوموں کی فریاد رسی میں منہمک رہتی۔ سست اور کاہلوں کو اُبھارتی، اور معصوموں اور یتیموں پر عنایت کیا کرتی تھی۔ ریدی گند نے اِس لڑکی یعنی برتھا کے باپ کی پرورش یہیں کی۔ اُس کی تعلیم و تربیت کی نگراں تو تھی۔ اور اُسے مذہبی روایات کا شوق دلایا۔ جس سے وہ ایک خردمند اور اچھا بادشاہ ہوا۔ چوں کہ اُس کی تعلیم و تربیت خانقاہ میں ہوئی تھی اُس نے اپنی لڑکی برتھا کی پرورش کے لیے ایسی ہی جگہ انتخاب کی۔ اور اُسے خانقاہ میں بھیج دیا۔ ہمیں اس بات کا بخوبی پتا نہیں چلتا کہ برتھا نے کس خانقاہ میں پرورش پائی مگر ظن غالب ہے کہ ریدی گند ہی سے یہ فیضیاب ہوئی ہو گی۔

تاریخ ہمیں یہ خبر دیتی ہے کہ ایتھل برٹ شاہ کینٹ سے اُس کی شادی ہوئی۔ مگر اُس کی درمیانی زندگی کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ "ایتھل برٹ" ایک کم عمر سیکسن بادشاہ تھا جو سولہ سال کی عمر سے سلطنت کے اہم معاملات اور ریاست کا ذمہ دار ہوا۔ یعنی اس کم عمری میں اُس کے نازک دماغ پر افکار کا بھاری بوجھ پڑا۔ مگر خدا کی قدرت کا انتظام بھی کیا ہی عجیب ہے۔ ہر کسے را بہر کارے ساختند۔

"ایتھل برٹ" کے مصاحب اور ملازم سب اُس کے خیر خواہ تھے۔ اور ہر وقت اُس کے نفع و نقصان میں شریک ہونے کو مستعد رہتے تھے۔ انگلستان کے بادشاہ اور شہزادے اُن اگلے زمانوں میں اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ وہ اپنی سلطنت کو وسیع کریں، چناں چہ ایتھل برٹ کو بھی یہی خبط تھا۔ برخلاف ہمارے بادشاہ ایڈورڈ کے۔ وہ ایک دوسرے سے بہت ہی خلاف رہتے تھے اور رشک کرتے تھے" ایتھل برٹ نے یہ سوچا کہ ایسے موقع پر یہ بہتر ہے کہ ہم انگلستان سے باہر کسی اور بادشاہ کی مدد لیں۔ اپنی اس آرزو کو پورا کرنے کی غرض سے یہ پیرس گیا۔ وہاں اُس نے برتھا کو پہلے ہی بار دیکھا اور اُس سے

محبت ہوگئی۔ شاہ پیرس کو یہ رشتہ داری پسند آئی، کیوں کہ اس شجاع اور کم عمر شاہ کینٹ سے وہ بہت ہی خوش تھا۔ قضا کار شاہ پیرس کا اسی سال انتقال ہوا۔ اور "برتھا" اپنے چچا کے پاس بھیج گئی جو وارث تخت و تاج تھا۔ برتھا کے چچا کو یہ امر ناگوار گزرا کہ ایک عیسائی عورت کی شادی ایک بت پرست بادشاہ سے ہو۔ ایتھل برٹ فرط محبت میں اس بات کا وعدہ کرنے کو تیار ہوگیا۔ کہ اگر برتھا کی شادی اُس سے کر دی جائے تو اُسے وہ اپنے مذہب پر قائم رہنے دے گا اور اُس کے دینی احکام کے انجام دینے کے ایک عیسائی راہب بھی برتھا کی خدمت کے لیے مامور کر دے گا۔

اُس خداوند کارساز کو آخر ان دونوں کو ملانا ہی منظور تھا کہ برتھا کے چچا کے دل میں یہ بات پیدا کر دی کہ وہ رضامند ہو۔ پھر کیا تھا چند دنوں کے بعد اُن کی شادی کر دی گئی، اور ہماری شہزادی اب ملکہ کے خطاب سے مخاطب ہوئی اور بڑے ہی تزک و احتشام سے وہ وداع کی گئی۔ ملکہ برتھا اپنے شوہر کی عظیم الشان سلطنت کی طرف روانہ ہوگئی جس کی نسبت وہ قصے سُنا کرتی تھی۔

اُس کا نیا شاہی مکان وہ تھا جو شہر کنٹربری میں ایک مشہور محل تھا جہاں تمام بادشاہانِ کینٹ کا اپنے زمانۂ حکومت میں قیام ہوا کرتا تھا۔ اس محل میں ایک بہت ہی وسیع اور خوبصورت دالان تھا جہاں بادشاہ اور اُس کی ملکہ اپنے دوستوں اور مہمانوں کی خاطر اور مدارات کیا کرتے تھے اور روز و شب ناچ رنگ کے جلسے رہتے تھے ملکہ برتھا نے اپنی مرضی کے مطابق باغچہ میں ایک درختوں کا جھنڈ اپنی تفریح اور تفنن کی غرض سے مقرر کر رکھا تھا۔ یہاں اکثر وہ چنگ و رباب بجایا کرتی تھی اور پائیں باغ میں اپنی سہیلیوں اور ہمجولیوں کے ساتھ صنائع قدرت کی گلکاری کی سیر کرتی تھی۔ اُس کی شادی کے بعد ایک عجیب زمانہ خوشی اور اطمینان کا گزرا اور اس عرصے میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہوئی جن کی آواز سے قلعہ خوش ہو کر گونجتا رہتا تھا۔ ان بچوں کے نام کچھ عجیب طرح کے تھے مگر لڑکی جسے سب "ناتا" کے نام سے پکارتے تھے جس کے معنی زندہ دل کے ہیں اُس کے اسم بامسمیٰ ہونے میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ اُس کی صورت سے ہر وقت بشاشت

ٹپکتی رہتی تھی۔ ہماری ملکہ نے ایک چھوٹی سی پہاڑی پر اپنے بیے ایک گرجا بنوایا تھا وہاں وہ روز جایا کرتی تھی۔ اور" ایتھل برٹ" بُت خانوں میں جا کر بُت پرستی کیا کرتا تھا۔ ہماری ملکہ کی یہ دلی خواہش تھی کہ" ایتھل برٹ" عیسائی ہو جائے۔ حالاں کہ "ایتھل برٹ" ایک نہایت ہی عالی دماغ اور اچھا بادشاہ تھا جو ہر وقت اپنی رعایا کی فکر میں رہتا تھا۔ مگر بُت پرستی نے اُس کے دل میں کچھ ایسا گھر کر لیا کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کی لکیر کا فقیر بنا رہا۔ تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ غریب سکسنوں کے بچے چُرائے جاتے تھے اور بردہ فروش اُن کو لے جا کر شہر روم میں بطور غلام اور کنیز کے بیچتے تھے۔ روم کے بازاروں اور سڑکوں پر اُن کے جھگٹے کے جھگٹے بکنے کے لیے کھڑے رہتے تھے۔ سکسن بلحاظ خال وخط بہت ہی حسین ہوا کرتے تھے۔ اُن کی گندمی چمڑی کرنجی آنکھیں، گلابی گال اور ہلکے ہلکے بال اُن کا خصوصیت کے ساتھ رومن والوں سے فرق ظاہر کرتا تھا۔ ایک روز ایک راہب سڑک پر سے گزر رہا تھا اور جوں ہی انھیں دیکھا اُسے تعجب ہوا۔ اُس نے اُن بردہ فروشوں سے یہ سوال کیا کہ یہ غلام کس جگہ کے رہنے والے ہیں۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ یہ انگلز ہیں۔ راہب نے کہا کہ نہیں یہ انجلز (یعنی فرشتے) ہیں۔ اس کے بعد اُس راہب نے انگلستان کے متعلق کچھ اُن سے دریافت کیا اور جب یہ معلوم ہوا کہ وہ لوگ بُت پرست ہیں تو فوراً ارادہ کر لیا کہ وہاں جا کر دینِ مسیحی کی ہدایت کرنا چاہیے۔ چند دنوں کے بعد یہ راہب، روم والوں کا اسقف (یعنی اعلیٰ راہب) بنا۔ اُس وقت پھر اُس کو کچھ خیال آیا تو اپنے ماتحت راہبوں میں سے ایک "اگسٹن" نامی راہب کو اس کام کے لیے تیار کیا۔ اُس کے ساتھ چالیس اور راہبوں کو بھی کر دیا۔ جو اس کے زیر دست اور خدمت گار رہتے تھے۔ جب اگسٹن فرانس پہنچا تو وہاں کے لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ انگلستان کی ملکہ عیسائی ہے تو اس کی ہمت اور بڑھی۔ بہر صورت وہ انگلستان سے قریب ایک جزیرہ تھا وہاں پہنچا۔ وہاں سے اپنے آنے کا پیام اور شاہ سے ملنے کا اشتیاق ملکہ برتھا کو کہلوا بھیجا۔ چند دنوں کے بعد یہ ملکہ برتھا کے اصرار سے ایتھل برٹ اور وہ دونوں اس جزیرہ پر اگسٹن سے ملنے آئے۔ اُس وقت تمام راہب کچھ عجیب قسم کا لباس پہنے ہوئے تھے۔ لمبے

ڈھیلے ڈھیلے سیاہ رنگ کے جبّے ۔ بڑی بڑی آستینیں ۔ سرخ چوگوشیہ کلاہیں، اور اس پر طرّہ یہ کہ سر منڈے ہوئے ۔ جب شاہ کے آنے کی خبر سنی تو سب ایک صف میں کھڑے ہو گئے ۔ ایتھل برٹ اور برتھا بے تکلف زمین پر بیٹھ گئے ۔ اور اُن کی لمبی قطار کو تعجب سے دیکھنا شروع کیا ۔ چند لمحوں کے بعد حکم دیا کہ وہ سب بیٹھ جائیں ۔ اور اگسٹن کو اجازت دی کہ وہ اپنا عریضہ پیش کرے ۔

اگسٹن ۔ جلالت مآب حضور والا! یہ بندۂ ناچیز اس لیے حاضر ہوا ہے کہ اُس خدا کے سچے دین کی جناب کو ہدایت کرے یعنی ہمارے پیارے مسیح نے جو روشن راستہ بتلایا ہے ۔ اُس کی رہنمائی کے لیے میں حاضر خدمت ہوا ہوں ۔

ایتھل برٹ ۔ آپ نے جو کچھ فرمایا وہ صحیح ہے مگر میرا قلب جو مجھے ہدایت کر رہا ہے اُس کی پابندی میں مجھ سے فروگذاشت نہیں ہو سکتی، اور میرے لیے یہ ایک مشتبہ امر ہے کہ آپ کا مذہب برحق ہے ۔

اس گفتگو کے بعد ایتھل برٹ نے اُن سے کہا کہ آپ لوگوں کے لیے ایک مکان تجویز کیا گیا ہے جہاں پر رہ کر آپ اپنے مقاصد کی تکمیل کر سکتے ہیں ۔ پھر کیا تھا اُس مکان میں رہ کر بجز اس کے کہ شب و روز اُسی کام میں کوشاں رہے اور کچھ نہیں کرتے تھے لوگ اُن کی عادات اور اطوار دیکھ کر خود بخود اُن کے گرویدہ ہو گئے تھے ۔ اگسٹن اکثر ملکہ برتھا کے بنائے ہوئے گرجا میں جایا کرتا تھا ۔ تھوڑی مدت میں اُس نے ایک معتد بہ تعداد عیسائیوں کی بنالی ۔ آخر وہ دن بھی آگیا جب ملکہ برتھا کی آرزو پوری ہونے والی تھی ۔ خود شاہ ایتھل برٹ نے اُس چھوٹے سے گرجا گھر میں جا کر دین مسیح قبول کیا ۔ اور بُت خانے میں جانے کی قسم کھالی ۔ اُس سال کے ختم ہونے سے پہلے قریب قریب ساری رعایا عیسائی ہو گئی ۔ اور اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ایک بڑا گرجا گھر بنایا جائے شاہ کے حسب ارشاد ایک بہت بڑا گرجا جس میں ہزاروں آدمیوں کی گنجایش ہو سکتی تھی بنا دیا ۔

دین مسیحی کی اس قدر بڑی خدمت کرنے میں اگسٹن کو یہ صلہ ملا کہ وہ وہاں کا اسقف (یعنی اعلیٰ راہب) بنایا گیا ۔ اور چند دنوں کے بعد شہر کنٹربری کا اعلیٰ

اسقف یعنی آرچ بشپ بنا دیا گیا۔ یہ وہی عہدہ ہے کہ جس کی تقلید برابر اب تک چلی آتی ہے اور فقط یہ نہیں کہ تمام راہبوں کا اعلیٰ افسر بلکہ رعایا کا بھی بادشاہ کے بعد وہی بادشاہ ہوتا ہے۔

انگلستان کے بادشاہوں کی تاج پوشی کے موقع پر اسی کو یہ عزت نصیب ہوتی ہے کہ اپنے ہاتھوں سے اُسے تاج پہنائے۔ اگسٹن کو بہت سے اور حقوق حاصل تھے چناں چہ اُس نے ایک بشپ کو کئی راہبوں کے ہمراہ یارک میں تبلیغ دینِ مسیحی کرنے کی غرض سے بھیجا۔ اور ایک قدیم زبردست گرجا جو کنٹربری میں تھا اُس کی مرمت کرائی جو آج کے دن تک کنٹربری کتھیڈرل کے نام سے مشہور ہے۔

۶۰۵ء میں جب اگسٹن کا انتقال ہوا تب اُس کی یادگار میں ایک بڑی زبردست خانقاہ بنادی گئی۔ جس کا افتتاحی جلسہ ملکہ برتھا کی سرپرستی میں ہوا۔ اس موقع پر شاہ ایتھل اور اُس کی شہزادی نے سب سے بڑا حصہ لیا۔ ہمیں افسوس کے ساتھ بیان کرنا پڑتا ہے کہ یہ اخیر موقع تھا جب ملکہ برتھا نے عوام کی کچھ خدمت کی اور اُس کے بعد کی زندگی کا کسی معتبر ذریعہ سے پتا نہیں چلتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اُس کا انتقال بھی اسی سال میں ہوا۔ جیسے اُس کی تمام زندگی آرام و اطمینان سے کٹی ویسے ہی اس نے دنیا سے پتہ [رشتہ؟] توڑنے پر بھی خوشی ظاہر کی۔ یہ کس قدر بڑا احسان تھا کہ جو اُس نے اپنے ہمعصروں پر کیا کہ اُن کے خیال کے مطابق اُنھیں کج راہی سے بچایا اور وہ [اگسٹن انھیں] راہ راست پر لایا۔ کیوں کہ نہ ملکہ برتھا وہاں ہوتی نہ اگسٹن کو وہاں جانے کی جرأت پڑتی۔

اب ہمیں اس قصہ سے یہ نتیجہ نکالنا چاہیے کہ اچھی اور نیک عورتیں خواہ وہ کسی مذہب کی ہوں ہمیشہ اوروں کو فائدہ پہنچاتی رہتی ہیں۔ تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ شاہ ایتھل برٹ اپنی ملکہ کے بارہ سال بعد انتقال کر گیا۔ اور اُس کا مدفن اُس کی رہبر کے برابر سینٹ پیٹر کے گرجا میں اب تک ہے۔ خدا ان دونوں کی طرح ہمیں بھی اپنے خیال کے مطابق صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق دے۔ اور صداقت کو ہمیشہ کتاب [کذب ؟] پر غالب رکھے۔

ہم اپنے ناظرینِ خاتون کو اس موقع پر اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتے

کہ یہ ایک میاں بیوی کی اعلیٰ درجہ کی محبت کا قابل قدر نمونہ تھا ۔

قارون ہلاک شد کہ چہل خانہ گنج داشت　　　نوشیرواں نہ مُرد کہ نام نکو گذاشت

دعا کر کے رخصت ہوتے ہیں کہ خداوند کارساز سب ایسے میاں بیوی جن میں اختلاف مذہب ہو محبت قائم و دائم رکھے ۔ آیندہ ماہ کے پرچے میں ملکہ "ماڈ" کی سوانح عمری ناظرین کی خدمت میں پیش کریں گے ۔

آزاد ۔ از بمبئی[1]

---

[1] خاتون ۔ علی گڑھ ۔ بابت اکتوبر ۱۹۰۷ء ص ۴۶۴ تا ۴۷۲ ۔

تعلیم اور اتالیقی پر اورنگ زیب کا لیکچر

ایک یورپین سیّاح کی زبانی[1]

مغربی سیاحوں اور مورخوں کے ملمع کار اور پر از تعصب قلم نے جن عجیب چالاکیوں سے اورنگ زیب کی فرضی تصویر کھینچی ہے۔ وہ دنیا کے اس متمدن ترین خطے کے قلمی فریبوں کی فہرست میں ہمیشہ نمایاں رہے گی۔ اس شریفانہ مصوری کی انجام دہی کے لیے باعزت مصوروں کو دوسروں کا دست نگر ہونا پڑا۔ جس قسم کے رنگ و روغن کی ضرورت تھی اس کا کافی ذخیرہ متعصبانہ اور سرسری نظر، سطح بینی، غلط واقعات پُر از کذب روایات، اور مدلسانہ قصص نے بیشتر ہی سے فراہم کر دیا تھا۔ مصور تو بعد کو آئیں گے۔ مگر پہلے پہل ہم کو سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں وہ بزرگ صورتیں صوبہ جات مغلیہ ہند میں مصروف سیاحت نظر آتی ہیں۔ جنھوں نے اس بے انتہا نیک کام کا ابتدائی میٹر جمع کیا۔ برنیر، ٹیورنیر، تھیونوہ، نیکولا رومانو کی وغیرہ سیاح اسی راستی پسند گروہ کے برگزیدہ افراد ہیں۔ ان کا فراہم کردہ ذخیرے کا مسلہ اکبر و عالمگیر کی ولادت پر اس سے کہیں زیادہ احسان ہے۔ جس قدر الفنسٹن اور الیٹ مورخین مابعد کا انگلستان کی تاریخی جماعت تسلیم کرتی ہے۔

سچ اور جھوٹ کی باہمی کش مکش میں اخلاق کی طرف سے ہمیشہ اطمینان دلایا گیا ہے کہ اوّل الذکر کی فتح یقینی ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ یہ فتح بھی چند قدرتی نشانیوں اور آثار کا نتیجہ ہے۔ اگر یہ آثار مفقود ہو جائیں، اور بعض اوقات ایسا ہوا بھی ہے تو سچائی کی دبی چنگاریوں کو جھوٹ کی راکھ کے ڈھیر میں ڈھونڈنا ایک

---

[1] "شمس بنگالہ"، کلکتہ بابت ماہ دسمبر ۱۹۰۷ء میں محمد یوسف خاں کا ایک مضمون بعنوان "تعلیم و اتالیقی پر اورنگ زیب کا لیکچر" ایک یورپین سیّاح کی زبانی" مولانا "آزاد" کے تعارفی نوٹ کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ یہ نادر تحریر مولانا" کا دبی نوٹ ہے۔ ہم اسے ڈاکٹر عابد رضا بیدار کے شکریے کے ساتھ پندرہ روزہ "نیا خواب" رام پور ابوالکلام آزاد نمبر ۱۹۶۲ء سے نقل کر رہے ہیں۔

بے سود محنت ہو جائے۔ ایک بڑی علامت اختلاف، تعدّد و تنوّع بیان ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ اور بالخصوص انگلستان کے تاریخی اسٹیج پر جب مغل کا دربار منعقد ہوتا ہے تو کوئی فرماں روا اس قدر مختلف اور متعدد اور گاہ گاہ متضاد صورتوں میں نظر نہیں آتا۔ جس قدر ظلم و تعصب کا یہ فرضی دیوتا اورنگ زیب عالم گیر۔ اس کے خط و خال غایت عجیب اور حیرت زا ہیں کہیں سے خشونت اور سختی ظاہر ہوتی ہے، اور کہیں نرمی اور رحم و تحمل کا اثر ہویدا ہے۔ ایک تصویر میں وہ ہلاکت کا دیوتا ہے مگر اس کی پشت پر جو تصویر بنی ہے اس میں حسن کی دیبی بنا کھڑا ہے۔ اگرچہ آخری اوصاف کا اظہار بھی پوشیدہ مصالح پر مبنی ہے، مگر اختلاف اور اس درجہ تضاد نما اختلاف بے معنی نہیں ہو سکتا۔

بہر کیف یورپ نے مشرق کے اس فرماں روا کی نسبت جو لٹریچر جمع کیا ہے وہ بہت ہی عجیب ہے۔ اور طبیعت انسانی کے بعض چھپے چوروں کو ظاہر کرنے میں بہت کامیاب ہے۔ ذیل کے صفحات میں ہم اورنگ زیب کا "مسئلہ تعلیم پر ایک لیکچر" درج کرتے ہیں، جو نیکولا رومانوکی کے سفر نامے سے ماخوذ ہے۔ یہ لیکچر ڈاکٹر برنیر فرانسیسی (سیاح زمانہ شاہجہاں و عالمگیر) نے بھی نقل کیا ہے۔ مگر تمہید اور اکثر جزئیات میں اس سے مختلف ہے۔

یورپ کی تاریخی غلط بیانیوں نے، بالخصوص جب کہ اسلام و مشرق عنوان بحث ہو، ہم کو اس قدر بدگمان کر دیا ہے کہ ہم ان کی موافقانہ آرا کے قبول کرنے میں بھی غیورانہ تامل سے کام لیتے ہیں۔ اس جائز بدگمانی کا نتیجہ ہے کہ اس لیکچر کی صحت کے بھی (جس کی نسبت بہت خفیف مبالغہ کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۹ویں صدی میں کسی بڑی یونیورسٹی کے چانسلر کی تقریر معلوم ہوتی ہے) ذمہ دار نہیں ہو سکتے۔ ہمیں یاد پڑتا ہے کہ بین پول نے بھی اس لیکچر کا ذکر کیا ہے۔ اس واقعے کی توثیق کے لیے انگلستان کے ایک مورخ کی نسبت ہم کو زیادہ ضرورت خود اس سرزمین کے مستند واقعہ نگار کی ہے۔ پس بغیر توثیق و تصحیح ہم اس لیکچر کو درج کیے دیتے ہیں۔ مضمون بجائے خود دلچسپ اور مفید ہے، اور کم از کم اس قدر اندازہ کرنے کے لیے یقیناً کارآمد ہے کہ اورنگ زیب کی تصاویر کے انگریزی البم میں بعض تصویریں کیا بولتی ہیں۔

سیاح کے مختصر حالات اور اصل لیکچر کا ترجمہ ہمارے دوست مسٹر محمد یوسف خاں کی قلم فرسائی کا نتیجہ ہے جو اگرچہ اُردو کی لٹریری دنیا میں نئے نئے آئے ہیں مگر جس درجہ تیاری اور صلاحیت و قابلیت کے ساتھ آئے ہیں اس کا نمونہ انہیں صفحات سے کیا جا سکتا ہے۔ ترجمہ بہت صاف اور سلیس ہے، اور ہر طرح مستحق تحسین۔ امید ہے کہ آیندہ بھی ان کی تحریرات بنگال کے اس ایک ہی اُردو رسالے کی اعانت کریں گی۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

سرمد شہید

آنانکہ غم تو برگزیدند ہمہ — در کوے شہادت آرمیدند ہمہ
در معرکۂ دو کون فتح از عشق است — با آنکہ سپاہ او شہیدند ہمہ

عہد عالم گیری میں اور اس کے بعد جس قدر فارسی تذکرے لکھے گئے ہیں اُن میں بالعموم سرمد کے عنوان سے چند سطریں ملتی ہیں، لیکن اول تو قدیم تذکروں کے حالات اس قدر مختصر اور ناکافی ہوتے ہیں کہ اگر زندگی میں ان کے نام خطوط لکھے جاتے تو لفافے کے لیے پورا پتا بھی میسر نہ آتا۔ اور پھر جو کچھ ہوں دِقت یہ ہے کہ وہ اس وقت سامنے نہیں۔ میں نے عہد عالم گیری کی تاریخوں کو دیکھا کہ شاید حوادث و واقعات کے ضمن میں کچھ حالات مل جائیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ پولٹیکل عاقبت اندیشیوں نے قلم کو روک لیا تھا۔ مرزا محمد کاظم نے عالم گیر کے حکم سے تمام سوانح و حالات بقید سنین قلم بند کرنے شروع کیے، لیکن صرف ۱۰ سال ہی کے حالات لکھے تھے کہ حکماً یہ سلسلہ بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد شاہ عالم کے عہد میں نواب عنایت اللہ کو خیال تکمیل ہوا۔ اس کے اشارے سے مستعد خاں نے بقیہ ۴۰ سال کے سوانح قلم بند کیے اور ابتدائی دہ سالہ مجموعے کا انتخاب شامل کر کے مآثر عالمگیری نام رکھا۔ میں نے سنہ ۱۰۷۰ھ کے حالات کی ورق گردانی کی کہ یہی سرمد کی شہادت کا سن ہے۔ مگر حالات کا ملنا تو ایک طرف، معلوم ہوتا ہے کہ پوری مستعدی کے ساتھ تاریخ کے صفحوں کو بچایا گیا ہے کہ اس شہید عشق کے جامۂ خونچکاں کے قطرہ افشانی سے حاشیہ پر کہیں دھبے نہ پڑ جائیں۔ لطف یہ کہ اسی سال شاہ عباس ثانی اور حسین پاشا رومی (غالباً والیِ حجاز) کے سفرا آئے تھے۔ ان کے حالات کی سطریں صفحے کی انتہا تک پہنچ کر بھی آگے بڑھنے سے نہیں رکتیں، خیر یہ حالات بھی کچھ نہ کچھ اہمیت رکھتے تھے، طرہ بریں یہ کہ اس سال نواح دہلی میں کہیں چند لڑکے شاہ و وزیر کی نقل کھیل رہے تھے، ان میں ایک کوتوال اور ایک مجرم بھی تھا۔ مصنوعی کوتوال نے غیظ و غضب میں آکر مصنوعی مجرم کو

مولانا کا یہ معرکہ آرا مضمون نظام المشائخ کے شہید نمبر ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا تھا۔

اصلی سزا دے دی، نصف صفحے کے قریب اس حادثۂ عظیم اور داستان الم کی نذر کیا گیا۔ مورخ کی نظر کا جب یہ حال ہو، تو ظاہر ہے کہ ایسے قصوں کے ہجوم میں سرمد بے چارے کی نعش کیوں کر نظر آتی۔

خافی خاں کی منتخب اللباب عہد مغلیہ کی مشہور ترین تاریخ ہے۔ جس نے اورنگ زیب کے حالات اس تفصیل سے لکھے ہیں گویا صرف یہی زمانہ موضوع کتاب ہے۔ یہ قیاس کہتا تھا کہ اس نے یہ واقعہ نظر انداز نہ کر دیا ہوگا۔ کیوں کہ عالمگیری عہد کا قلم اس کے ہاتھ میں نہ تھا۔ جس کو ہر قدم پر روک لیے جانے کا اندیشہ ہو۔ مگر جب اسے کھولا تو ہزار صفحے کے سوانح میں ایک لفظ بھی سرمد کی نسبت نہ تھا۔ سچ یہ ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا راز مورخ کا قلم ہے۔ آج کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی باگ میں کتنی گرہیں ڈال دی گئی تھیں۔

سرمد کی شہادت کا وہی سنہ ہے، جس سنہ میں کوچ بہار اور آسام پر چڑھائی کی گئی، اس لیے دونوں تاریخوں نے اس سال کے حالات کا نصف حصہ اسی فتح یابی کی داستان سرائی میں صرف کر دیا۔ فتح آسام کی اہمیت کے بیان میں شک نہیں مگر مستعد خاں کو کیا معلوم تھا، کہ تماشا گاہ عالم میں ایسی آنکھیں بھی ہیں جو اس شادمانی فتح پر غلط انداز نظر نہ ڈالیں گی مگر اس غم اثر شکست پر ہمیشہ خونچکاں رہیں گی جو ایک مجنون لیلائے حقیقت کو دار پر کھینچ کر معرکۂ حق پرستی میں عالمگیر کو نصیب ہوئی۔

قصہ مختصر با ایں ہمہ دو کتابیں ایسی پیش نظر ہیں جن سے زیادہ تر معتبر راوی سرمد کے لیے نہیں ہو سکتے۔ پہلا شخص شیر خاں لودھی (مصنف مرأۃ الخیال) ہے جو بغیر کسی واسطے کے عالمگیری عہد کے واقعات لکھتا ہے، کیوں کہ اسی عہد کا تذکرہ نویس ہے۔ اس کا تذکرہ مرأۃ الخیال میرے پاس ہے۔ دوسرا شخص علی قلی خاں داغستانی عہد محمد شاہ کے امراء میں سے ہے۔ جس نے نہایت تفحّص و احتیاط سے شعرائے فارسی کا تذکرہ ریاض الشعراء مرتب کیا۔ اس کا قلمی نسخۂ مصنف ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانے میں موجود ہے، اور زیادہ تر حالات میں نے اسی سے لیے ہیں۔ یہ گو عہد محمد شاہ میں لکھا گیا ہے، لیکن سرمد کے حالات کے لیے ایک واسطے سے زیادہ دُور نہیں۔ اس کے علاوہ تمام تذکروں نے جو کچھ لکھا ہے ذہن میں کچھ نہ کچھ تو

محفوظ ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی میں ایک بیاض قلمی عہد عالمگیر ثانی کے کسی خوش مذاق شاعر سراج الدین سراج کی جمع کی ہوئی ہے، اس میں کہیں کہیں حالات بھی دیے ہیں۔ غرض کہ گلدستہ تو بنا مگر چند بتوں اور پنکھڑیوں کو دامن میں لے لیا ہے کہ مشہد سرمد میں جاؤں تو خالی ہاتھ کیا جاؤں۔

سرمد کی قومیت اور مذہب:

سرمد کی قومیت اور مذہب کو صاف نہیں بتلایا۔ مصنف مراۃ الخیال کا بیان ہے کہ "اصلش از فرنگستان وارمنی بود" مگر باقی تذکرے یہودی الاصل تبلاتے ہیں۔ والہ داغستانی اس پر اتنا اور بڑھاتا ہے کہ وطن کاشان تھا۔ مگر یہ خیال باہم متناقض نہیں، کیوں کہ ایران میں قدیم سے ارمنیوں کی وسیع آبادی موجود ہے جو بالعموم مسیحی اور بعض یہودی ہیں، اب تو انھوں نے یکسر یورپین طرز معاشرت اختیار کرلی ہے، اور تحصیل علوم جدیدہ میں تمام ایرانی جماعتوں سے پیش رو ہیں مگر ایک صدی پیشتر تک ان میں مذہب کے سوا کوئی بات مسلمانوں سے مختلف نہ تھی، ان میں سے بعض اسلامی علوم و آداب کو اس حد تک حاصل کرتے تھے کہ مسلمانوں کی تعلیم یافتہ صحبت میں شریک ہو سکتے تھے، چناں چہ تذکروں میں متعدد شعرا کے حالات ملتے ہیں جو ارمنی اور مسیحی تھے مگر ان کے اشعار ایران کے مسلمان خوش گو شعرا کے کلام سے کسی طرح کم نہیں۔ سرمد کا خاندان بھی ارمنی اور یہودی ہوگا۔ کاشان میں متوطن ہوگئے، ارمنی ہونے کی وجہ سے لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوا ہوگا کہ فرنگی ہے، اور باہر کے غیر معروف آدمی کی نسبت ایسا دھوکا ہونا کچھ عجب نہیں۔

آفتاب جب چمکتا ہے تو باغ و چمن کو نہیں ڈھونڈھتا کہ اپنی کرنوں کا انھیں نشیمن بناؤں۔ اس کا فیضان ضوبخش مبدء فیاض کی طرح فیض عام ہے۔ محل سرائے شاہی کے کنگروں کے طلائی کلس اگر اس کی ضوفشانی سے چمک اٹھتے ہیں تو کیا جنگل کے خشک درختوں کی شاخوں پر سنہری رنگ نہیں چڑھ جاتا۔ میں کیا کہہ رہا ہوں ! میرا مقصد نظام شمسی کے مرکز سے نہیں بلکہ آفتاب اسلام سے ہے۔ اس اوقیانوس تجلی کی لہریں اٹھیں تو انھوں نے اپنے پہلے ..... جسم و خون اور قوم کے قائم کیے ہوئے امتیازات کو خس و خاشاک کی طرح بہا دیا۔ پھر سیرابی کا وقت آیا تو احرار قریش اور ارقائے حبش، بطحا و یثرب اور عرب و فرنگ تاج دار داغستان و بادیہ نشین عرب

ادنیٰ و اعلیٰ نزدیک و دُور سب کو یکساں طور پر شریکِ فیض کیا۔ صرف صلاحیت اور اثر پذیری معیارِ فیض رسانی تھی کہ ہر قوم اور ہر زمین بقدرِ صلاحیت حصہ یاب ہوئی۔ بوجہل قریشی تھا اور خزانے کے پاس مگر مدت العمر محروم رہا۔ بلال حبشی اور صہیب رومی تھا۔ پھر کس قدر دُور۔ مگر ان کے دامن دیکھیے تو مالا مال تھے۔ ابرِ کرم کہاں نہیں برستا؟ مگر ہر زمین لالہ زار نہیں بن جاتی۔

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے　　　آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

یہ اسی فیاضانہ فیض بخشی کا نتیجہ تھا کہ عرب گو مبداء و منشاء اسلام تھا۔ مگر اس کی کوئی خصوصیت نہیں رہی نومسلم قومیں جو دور دراز ملکوں سے آئی تھیں ہر علم و فن میں اس طرح دست برعلم ہوئیں کہ خود عرب کو ان کے لیے اپنی صفیں توڑ دینی پڑیں یہاں تک کہ آج تراجم و رجال کی کتابیں اٹھا کر دیکھتے ہیں تو کوئی علم و فن ایسا نظر نہیں آتا جس پر نومسلم قوموں کا تسلط نہ ہو۔ حتیٰ کہ فقر و تصوف جس کی مذہب کے سایے میں پرورش ہوئی ہے اس کی تاریخ بھی نومسلم اشخاص کی خود فرشیوں کی منت پذیری سے آزاد نہیں بات یہ ہے کہ خدا کی محبت کی طرح اسلام کی بے دریغ فیض بخشی بھی اس طرح عام تھی کہ نسبتِ قومیت اور رنگ و خاندان سے اسے کیا سروکار۔

اس عام فیض بخشی کی ایک نمایاں نظیر سرمد کی سوانح عمری بھی ہے، وہ ایران کے کسی ارمنی خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور مذہباً یہودی یا عیسائی تھا۔ آغازِ عمر ہی میں فیضانِ الٰہی کی نظر انتخاب اس پر پڑی، اور جذب ہدایت کی کشش نے مشرف باسلام کیا۔

خاندانی نام:

خاندانی نام کا پتا نہیں چلتا اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ قبول اسلام کے بعد کیا نام رکھا گیا۔ عام طور پر صرف سرمد ہی کے لقب سے تذکروں میں ذکر کیا گیا ہے اور سچ یہ ہے کہ سرمد کا بے نام ہونا جائے تعجب نہیں۔ کیوں کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی شرع میں بے نام و نشانی تو رکن اولین بلکہ شرط ایمان ہے۔

بادبودت زمن آواز نیاید کہ منم

لیکن بعض تذکروں "سعیدائے سرمد" کے عنوان سے اس کے حالات درج

لیکنے گئے ہیں اس سے قیاس ہوتا ہے کہ اسلامی نام کا ایک جزو شاید لفظ سعید ہوگا۔ جو بقاعدۂ تخفیف تخلص کے ساتھ مشہور ہوگیا۔

تحصیل علمی :

تحصیل علمی کا حال معلوم نہیں، لیکن تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ علم و فضل اور عربیت میں درجۂ کمال رکھتا تھا، اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ تحصیل علمی اس زمانے کے نصاب کے مطابق کامل ہوگی۔

ابتدائی پیشہ :

ابتدائی پیشہ تجارت تھا۔ ایران سے تجارتی اموال لے کر ہندوستان کی طرف بڑھا کہ اس زمانے میں علم و فن کی طرح جنس و متاع کی نمائش گاہ ہندوستان تھا۔ مگر یہ جوان تاجر جو بے خبر ہندوستان کی طرف قدم زن تھا نہیں جانتا تھا کہ وہاں پہنچ کر کس تجارت میں اپنا تمام سرمایہ لگا دینا پڑے گا۔ وہ شاید ایرانی مصنوعات فروخت کرکے ہندوستان کی قیمتی اجناس اور محسود عالم کانوں کے لعل و الماس خریدنا چاہتا تھا۔ لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ قضا و قدر کا فیصلہ اس کے خلاف ہوچکا ہے۔ تجارت تو بہرحال اسے آخر حیات تک کرنا پڑے گی مگر زخارف مادی کی تجارت گاہوں میں نہیں، بازار حسن و عشق میں جہاں سونے چاندی کی جگہ دل صد پارہ اور جگر صد زخم کا سکہ رائج ہے اور جہاں تجارت یہ ہے کہ صبر و شکیب، ہوش و خرد اور دل و جگر دے کر ایک غلط انداز نظر، ایک چین بجبیں تغافل پیشہ نگاہ خرید لیجیے۔ کہ اس سہل قیمت پر یہ متاع بالکل مفت ہے۔

صد ملک دل بہ نیم نگہ می تواں خرید خوباں دریں معاملہ تقصیر می کنند

اور صرف اتنا ہی نہیں کیوں کہ یہ تو اس بازار کی نمائشی اور سامنے کی چہل پہل ہے، اگر ہمت قدم آگے بڑھائے تو پھر وہ آخری سودا بھی کرنا پڑے گا۔ جس کی قیمت فقط جان ہے۔ اور جس میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ حیات کا لبریز پیمانہ خون شہادت کے ایک لبریز جام سے بدل جاتا ہے۔

دو عالم نقد جاں بر دست دارند بباز ارے کہ سودائے تو باشد

اس زمانے میں سیاح (ایرانی) عموماً سندھ ہو کر ہندوستان آتے تھے، سندھ کے

شہروں میں ٹھٹھ ایک مشہور شہر تھا۔ جس کو اب نئے جغرافیہ میں گمنامی کا خانہ نصیب ہوا ہے، یہی ٹھٹھ وہ سینائے مقدس تھا جو سرمد کے لیے تجلی گاہ ایمن بنا۔ اور لیلائے حسن نے اول اول اپنے چہرے سے نقاب الٹی، کہتے ہیں کہ ایک ہندو لڑکا تھا۔ جس کی چشم کافر نے یہ افسوں طرازی کی اور ایسا ہونا کچھ مستبعد نہیں۔ کیوں کہ عشق خیز دلوں کو دو نیم کرنے میں بخیہ گر کی سوئی اور جلاد کی تیغ دونوں برابر ہیں، یہاں تجارت میں خریدار عموماً بے پروا و بے نیاز مگر صاحب جنس غرض مند ہوتا ہے۔ پھر جو لوگ کہ اپنے دلوں کو ہاتھوں پر بطرز نذر رکھے ہوئے خریدار ڈھونڈھتے ہوں انھیں تو حق ہے ہی نہیں کہ خریدار میں خاص اوصاف کے طالب ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساده لوح ایرانی تاجر بھی متاع دل کی کس مپرسی سے تنگ آگیا تھا۔ اور خود خریدار کو بیتابانہ ڈھونڈھ رہا تھا۔ جب خریدار مل گیا تو نظر اٹھا کے دیکھا نہیں کہ کون ہے اور کیا لے کے آیا ہے۔ اسی کو غنیمت سمجھا کہ دل جیسی متاع ارزاں کی ایک چشم سحر کار طالب ہے اور بلا تامل یہ سودا منظور کر لیا۔

دلال عشق بود خریدار جانستان　　　خود را فروختیم چه سودا بما رسید

سرمد کو آیندہ جس صحرا میں بادیہ پیمائی کرنی تھی یہ اس کی طرف پہلا قدم تھا۔ اور کچھ سرمد ہی کی خصوصیت نہیں، عشق خواہ کسی عنوان ہو منزل حقیقت کا کیا ذکر عشق تو وہ دروازہ ہے کہ جس سے گزرے بغیر انسان انسان نہیں ہو سکتا جس کے دل و جگر میں ٹیس اور آنکھوں میں تری نہیں اس کو معنیٔ انسانیت سے کیا واسطہ ؟ تم نے اکثر دیکھا ہو گا کہ زاہد معتکف بھی با ایں ہمہ تعبس و تقشف جب اپنے زاویۂ عبادت میں سر بزانو ہوتا ہے تو حور و غلمان کی مسکراہٹ سے لطف لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یعنی جو خشک دماغ مسجد کے گوشوں اور حجروں میں دوست کو ڈھونڈھتے ہیں انھیں بھی اس تصور کے بغیر چارہ نہیں۔

حور جنت جلوہ بر زاہد دہد در راہ دوست　　　اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را

یہی وجہ ہے کہ جو سوداز دگان حقیقت شاہد ازلی کے جاں دادہ ہیں انھیں بھی عشق مجازی کے کوچوں میں در و دیوار سے سر ٹکراتے دیکھا گیا ہے، کیوں کہ دل جب تک لذت آشنائے درد نہ ہو برف کی ایک قاش ہے جس کو پانی بنتے دیکھا۔

مگر آگ میں جلتے ہوئے کبھی نظر نہ آئی حالانکہ انسانیت کا مفہوم یکسر سوز و گداز ہے، اور عشق کا کلیسا، آتش کدہ ہے۔ یہاں وہی آتش طلب قدم رکھ سکتے ہیں جو اپنے دلوں کو اس آتش کدے پر نذر چڑھا دیں اور پھر دامن سے ہوا دیتے ہیں کہ کہیں شعلوں کی بھڑک کم نہ ہو جائے۔

افسردہ را نصیب نباشد دل کباب   آں یابد ایں نوالہ کہ مہمان آتش ست

عشق الٰہی کی پہلی شرط یہ ہے کہ ماسوا کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ مگر انسان آب و گل کے تعلقات میں اس طرح پا بہ گل ہے کہ جب تک دل پہ درد کو کوئی محکم چوٹ نہ لگے ادھر سے ٹوٹ نہیں سکتا۔ مکھی جب شہد پر بیٹھ جاتی ہے تو جب تک اڑا ئیے نہیں، نہیں اڑتی۔ انسان کا دل جب تک چوٹ نہ کھائے دنیا کی لذتوں کو نہیں چھوڑتا۔ یہ چوٹ صرف عشق ہی کے ہاتھوں لگ سکتی ہے۔ عشق ہی کا فرشتہ اپنے بازوؤں میں وہ مافوق الفطرت طاقت رکھتا ہے کہ اس کی تیغ کا پہلا ہی وار خون کے تاروں سے بندھے ہوئے رشتوں اور دنیا کی دل فریبیوں کی جکڑی ہوئی زنجیروں کو دو ٹکڑے کر دیتا ہے، اور دل جب ہر قسم کی بندشوں سے آزاد ہو کر اپنے آپ کو دیکھتا ہے تو حلقۂ ازل کے سوا اور کوئی بیڑی پاؤں میں نہیں ہوتی، اسی درد کے لیے عارف عطار بے قرار و فغاں ساز ہے کہ:

کفر کافر را و دیں دیں دار را   ذرۂ دردے دل عطار را

غور کرو جس مردہ دل کو کبھی یہ وقت خوش نصیب نہ ہوا کہ کسی بندِ نقاب کے ملنے کے تصور میں اپنے خرمنِ ہوش و حواس پر بجلیاں گرائے اس کو شاہدِ حقیقت کا نظارہ حواسِ ظاہری سے کب ہو سکتا ہے۔ جس افسردہ نفس نے اپنی عزیز اور شیریں راتیں کسی نرگسِ خواب آلود کی یاد میں نہ کاٹی ہوں، اس کو معشوقِ حقیقی کی یاد میں بے چین راتیں کب نصیب ہو سکتی ہیں، جس خیرہ دماغ نے اپنے سرمایۂ عجز و نیاز کو کسی مغرور ناز کی کج ادائیوں اور بے نیازیوں پر نثار نہ کر دیا ہو وہ خود پسندی اور خود آرائی کے بت کیوں کر توڑ سکتا ہے؟ جس بے حسی کو کسی پیکرِ حسن کی صدائے شیریں نے مبہوت و لایعقل نہ کر دیا ہو۔ اس کو سازِ ازل کی نغمہ سرائی پر کیوں کر وجد آئے۔ غرض کہ جس بد نصیب کو کسی مست حسن کی نگاہ بے محابا بے خود نہ کر سکی۔

آئے۔ غرض کہ جس بدنصیب کو کسی مست حسن کی نگاہ بے محابا بے خود نہ کرسکی اسے جلوۂ طور پر کیوں غش آنے لگا؟ جو فتیلہ پہلے جل چکا ہو وہ فوراً آگ پکڑ لیتا ہے۔ لیکن نئے فتیلہ کو بہت دیر تک آگ دکھلانی پڑتی ہے۔

محبت با دلِ غم دیدہ الفت بیشتر گیرد　　چراغے را کہ دودے ہست در سر زود تر گیرد

ناظرین اگر جویائے حسن ہیں تو روئے پنہاں کے نظارے کے کیوں کر منتظر ہیں؟ انھیں تو پردۂ نقاب کی زیبائی پر ہی لوٹ جانا چاہیے۔ کنعان کی گم کردہ پسر آنکھوں نے جلوہ یوسفی کا انتظار نہیں کیا۔ پیراہن یوسفی کی بو پاتے ہی آنکھیں کھل گئیں۔ اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْلَا اَنْ تُفَنِّدُوْنَ - یہی وجہ ہے کہ مے خانۂ حقیقت میں جب مجلس گرم ہوتی ہے تو پہلے جام و مینا کا دور چلتا ہے۔ اور جب اس کے تلخ گھونٹ گوارا ہو جاتے ہیں تو پھر خود ساقی اپنے چہرے سے نقاب الٹ دیتا ہے کہ اب جام و سبو کی ضرورت نہیں، اس کی نگاہ نشہ خیز ہے، خود رفتگی و خود گزشتگی حاصل کیجیے۔

مے حاجت نیست مستیم را　　در چشم تو تا خمار باشد

سرمد کے آگے بھی یہ جام رکھا گیا اور جام کی خوبی بہت کچھ جام پیش کرنے والے ہاتھ کی رعنائی پر منحصر ہے۔ اس لیے ہم اس ہندو لڑکے کو بھولنا نہیں چاہتے۔ جس کی نگاہ لیلیٰ روش نے سرمد کو مجنوں بنایا۔ مگر افسوس کہ ہر عاشق قیس و فرہاد کی قسمت کو کہاں سے لائے، سرمد کے لیلیٰ کا زیادہ سے زیادہ جو حال معلوم ہوتا ہے یہی ہے کہ ایک ہندو لڑکا تھا اور غور کیجیے تو یہ بھی بہت ہے کیوں کہ بازار عشق میں جب سودا چکایا جاتا ہے تو کب یہ دیکھا جاتا ہے کہ خریدار کون ہے اور کیا قیمت مل رہی ہے؟

مرا فروخت محبت و لے نمی دانم　　کہ مشتری چہ کس است و بہائے ما چند است

اربابِ تذکرہ اس میں بھی ہم آہنگ نہیں کہ یہ واقعہ کہاں ہوا؟ والہ داغستانی لکھتا ہے کہ بندر سورت ہیں، اور آزاد بلگرامی نے اپنے کسی تذکرے میں عظیم آباد پٹنہ لکھا ہے۔ لیکن ان سب میں مراۃ الخیال قدیم العہد ہے۔ اور اس کا بیان ہے کہ "در اثنائے تجارت بشہر تتہ افتاد بر ہندو پسر عاشق گشت" اس لیے ہم نے اسی کو

ترجیح دی ہے ۔ بہرکیف بجلی کہیں گری ہو۔ دیکھنا یہ ہے کہ دہقان کے خرمن سوختہ کا کیا حال ہوا۔

عشق کی شورش انگیزیاں ہر جگہ یکساں ہیں، ہر عاشق گو قیس نہ ہو، مگر مجنوں ضرور ہوتا ہے، اور جب عشق آتا ہے تو عقل و حواس سے کہتا ہے کہ میرے لیے جگہ خالی کر دو۔ سرمد پر بھی یہی حالت طاری ہوئی، اور جذب و جنون اس طرح چھایا کہ ہوش و حواس کے ساتھ تمام مال و متاع تجارت بھی غارت کر دیا۔ دنیوی تعلقات میں جسم پوشی کی بیڑی باقی رہ گئی تھی۔ بالآخر اس بوجھ سے بھی پاؤں ہلکا ہو گیا کہ پابندیاں تو مدعیان ہشیاری کے لیے ہیں۔ مجنون لایعقل مرفوع القلم ہوتے ہیں۔

خطا بمردم دیوانہ کس نمی گیرد   جنوں نداری و آشفتہ خطا ایں جاست

بیابان نوردی :

بیابان نوردی عالم عشق کی سیر و سیاحت ہے کہ اسی سے انسان کی عقل تجربہ کار و پختہ ہوتی ہے۔" مجنوں " جو صف عشاق میں نمایاں نظر آتا ہے، اس کی وجہ بھی ہے کہ صحرا گردی میں کوئی اس کا حریف نہیں، سرمد نے بھی مدتوں صحرا کی خاک چھانی، سندھ کے ریگ زاروں سے تلوے گرم کیے، ہندوستان کے گرم و سرد موسموں کو یکساں عریانی میں کاٹ دیا۔ اور بالآخر جب یہ عقدہ کھلا کہ :

بیہودہ چرا در طلبش می گردی   بنشیں اگر او خداست خود می آید

تو پھر ایک مستقر کی تلاش ہوئی، جہاں بیٹھ کر عشق کے آخری امتحان کا انتظار کیا جائے۔ لیکن جب نتیجہ یہی تھا تو پھر بیابان نوردی کیوں تھی؟ مگر نہیں خود کہہ چکا ہوں کہ یہ بھی عشق کے قانون کمال میں داخل ہے، اور عشق کے قانون ہیں :

یکے از دستگیری ہائے عشق است   عزیزاں را بہ خواری بر کشیدن

یہ وہ زمانہ تھا کہ عنقریب بساط ہند پر عالم گیر ایک نئی چال چلنے والا تھا۔ شاہ جہانی حکومت کا آخری عہد اور شہزادہ دارا شکوہ ولی عہد سلطنت تھا، سلسلہ مغلیہ میں دارا شکوہ ایک عجیب طبیعت اور دماغ کا شخص گزرا ہے، اور ہمیشہ افسوس کرنا چاہیے۔ کہ تاریخ ہند کے قلم پر اس کے دشمن کا قبضہ رہا۔ اس لیے اصلی تصویر پولٹیکل چالوں کے گرد و غبار میں چھپ گئی، وہ ابتدا سے درویش دوست اور صوفیانہ دل و دماغ کا شخص تھا۔

اور ہمیشہ فقراء اور ارباب تصوف کی صحبت میں رہتا تھا۔ اس کی بعض تحریرات جو دست بردِ حوادث سے بچ گئی ہیں، بتلاتی ہیں کہ ان کا لکھنے والا خود بھی ذوق و کیفیت سے خالی نہیں، اس کے صاحب ذوق ہونے کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ تلاش مقصد میں دیر و حرم کی تمیز اٹھا دی تھی، اور جس نیاز کیشی کے ساتھ مسلمان فقراء کے آگے سر جھکاتا تھا، ویسی ہی عقیدت ہندو درویشوں کے ساتھ رکھتا تھا۔ اس اصول سے کون صاحب حال اختلاف کر سکتا ہے۔ کیوں کہ اگر اس عالم میں بھی کفر و اسلام کی تمیز ہو تو پھر اعمٰی اور بصیر میں کیا فرق ہے، پروانے کو تو شمع ڈھونڈھنی چاہیے، اگر صرف شمع حرم ہی کا شیدا ہے تو سوز طلبی کامل نہیں۔

عاشق ہم از اسلام خرابست و ہم از کفر   پروانہ چراغ حرم و دیر نداند!

سرمد جوشِ جنون میں پھرتا ہوا جب شاہ جہاں آباد (دہلی) پہنچا تو قضا نے اشارہ کیا کہ قدم روک لیے جائیں۔ کیوں کہ جس جام کی تلاش ہے وہ اسی مے خانے میں ملے گا۔ مصنف مرأۃ الخیال، جو عالمگیر پرستی کے معبد میں صف اوّلیں کا طالب ہے لکھتا ہے کہ "چوں خاطر سلطان دارا شکوہ بجانب مجانین میل داشت صحبت بوے در گرفت" بے چارہ علی شیر ابھی ہوشیاری و دیوانگی ہی کی بحث میں سرمار رہا ہے۔ اسے کیا خبر کہ دنیا میں ایسی ترازو بھی ہے جس کے ایک پلّے میں اگر دیوانگی رکھ دی جائے تو دوسرا پلّہ تمام عالم کی ہوشیاری رکھ دینے سے بھی نہیں جھک سکتا، اور پھر ایسے خریدار بھی ہیں جن کو اگر ہوش و حواس کا تمام سرمایہ دے دینے سے ایک ذرہ جنون مل سکتا ہو، تو بازار یوسف کی طرح ہر طرف سے ہجوم کریں۔ بہر کیف خواہ کچھ ہو عالم گیری ہوشیاری سے تو ہمیں دارا شکوہ کی دیوانگی اور جنون پسندی ہی پسند آتی ہے، کہ وہاں تو تیغ ہوشیاری کشتگان حسرت کے خون سے رنگین ہے، اور یہاں خود اپنے جسم کی رگ رگ سے گردن سے خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں، شاید دارا شکوہ بھی عالم گیر جیسے ہوشیار کی ہوشیاری سے تنگ آگیا تھا۔ اسی لیے اس نے سرمد جیسے مجانین کی صحبت کو ہوش والوں کی مجلس پر ترجیح دی:۔

غرضیکہ سرمد دارا شکوہ کی صحبت میں رہنے لگا، اور اسے بھی سرمد سے کمال عقیدت تھی۔ اس زمانے میں عشق کی شورش انگیزیاں کبھی کبھی اسے باہر نکلنے پر مجبور کرتیں،

لیکن چوں کہ معلوم ہو چکا تھا کہ آخری امتحان گاہ یہی ہے۔ اس لیے شاہ جہاں آباد سے نکل نہیں سکتا۔ یہاں تک کہ شاہجہاں کی علالت اور دارا شکوہ کی نیابت نے عالمگیری ارادوں کے ظہور کا سامان کر دیا، اور ایک عرصے کی شورش اور خوں ریزی کے بعد ۱۰۶۹ھ میں عالمگیر اورنگ زیب تخت نشین حکومت ہوا؟ یہ زمانہ دارا شکوہ کے ساتھیوں اور ہم نشینوں کے لیے خود دارا شکوہ سے کم مصیبت انگیز نہ تھا۔ بہت سے لوگ تو دارا شکوہ کے ساتھ نکل گئے، اور جو رہ گئے انھوں نے اپنے آپ کو کشتی طوفان میں پایا۔ لیکن اس رہین بے خبری کو اپنے استغراق میں اس کی فرصت کہاں ملتی تھی کہ نظر اٹھا کے دیکھے۔ اور اگر دیکھتا بھی تو وہاں سے کیوں کر نکلتا۔ کیوں کہ بایں ہمہ بے خبری اس سے بے خبر نہ تھا کہ اب تک جو کچھ ہوا ہے عشق کی ابتدائی منزلیں تھیں۔ آخری منزل طے کرنی باقی ہے، اور وہ یہیں پیش آنے والی ہے۔

بیک دو زخم کہ خوردن ز عشق ایمن مباش
کہ در کمیں گہ ابرو کماں کش است ہنوز

سرمد کی شہادت:

سرمد کی شہادت کے اسباب اکثر تذکرہ نویسوں نے بتلائے ہیں۔ تذکرۂ "مرأۃ الخیال" میں ہے کہ سرمد کی اس رباعی پر جبہ پوشان شرع کے کان کھڑے ہوئے، اور انھوں نے اسے کفر قرار دیا کہ معراج جسمانی سے انکار لازم آتا ہے۔

ہر کس کہ سر حقیقتش باور شد ... او پہن تر از سپہر پہنا ور شد
ملا گوید کہ بر فلک شد احمد ... سرمد گوید فلک بہ احمد در شد

مگر اس ترک سادہ کو فقیہانہ جنگ و جدل سے کیا سروکار تھا، اس نے نظر اٹھا کے دیکھا تک نہیں کہ یہ کور بصر کیا شور و غوغا کر رہے ہیں؟ وہ تو اس عالم میں تھا جہاں ان کے اقرار و انکار کی بحثوں کی آواز نہیں پہنچ سکتی۔

در عجائب ہائے طور عشق حکمتہا کم است ... عشق را با مصلحت اندیشی مجنوں چہ کار

لیکن اصل بات یہ ہے کہ عالمگیر کی نظروں میں تو سب سے بڑا جرم دارا شکوہ کی معیت تھی اور وہ کسی نہ کسی بہانے قتل کرنا چاہتا تھا۔ ایشیا میں ہمیشہ پالٹیکس مذہب کی آڑ میں رہا ہے، اور ہزاروں خونریزیاں جو پولٹیکل اسباب سے ہوئی ہیں انھیں

مذہب ہی کی چادر اوڑھا کر چھپایا گیا ہے ۔ جب اور کوئی بہانہ نہ ملا تو عریانی و برہنگی کو کہ خلاف رسم شرع ہے بنیاد قرار دیا ۔ اور مذکورہ بالا رباعی سے نتیجہ نکالا کہ معراج کا منکر ہے ۔ ملا قوی اس زمانے میں قاضی القضاۃ تھے ۔ عالمگیر نے انھیں سرمد کے پاس بھیجا کہ برہنگی کی وجہ دریافت کریں ۔ ملا صاحب نے کہا کہ باوجود علم و کمال و فضل برہنہ و مکشوف العورات رہنا کس عذر پر مبنی ہے ۔ سرمد نے کہا کہ کیا کروں شیطان قوی ہے ۔ اور فی البدیہہ یہ رباعی پڑھی ۔

خوش بالاے کردہ چنیں پست مرا   چشمے بدو جام بردہ از دست مرا
او در بغل من است و من در طلبش   دزدے عجبے برہنہ کردہ است مرا

ملا صاحب برہم ہوئے اور برہم ہونے کی بات ہی تھی کیوں کہ اسلام کی توہین نہیں کی گئی ۔ بلکہ خود ان کے وجود اسلام کی سخت اہانت ہوئی یعنی ان کا اسم سامی ابلیس لعین کا وصف قرار پایا ۔ بہر کیف انھوں نے عالمگیر سے آکر کہا کہ کفر کا کافی مواد ہاتھ آگیا ہے ، اور قلمدان کھولنا چاہا کہ علماے ظاہر کی تیغ خون آشام اسی نیام میں رہتی ہے ۔ لیکن عالمگیر کی عاقبت اندیشی نے صرف اس بہانے کو کافی نہ سمجھا ۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ سرمد کوئی معمولی شخص نہیں ہے جس کا قتل ایک عام الورود واقعہ سمجھا جائے گا ۔ علم و فضل کے لحاظ سے کوئی اس کا ہمتا نہیں ، اور رجوع خلایق کا یہ حال ہے کہ سارا شاہجہاں آباد اس کا معتقد اور ہوا خواہ ہے ۔ اس لیے جب تک کوئی بہانہ کافی نہ ہاتھ آئے اس ارادے کو ملتوی رکھنا چاہیے ۔

اسلام کے اس تیرہ سو برس کے عرصے میں فقہاء کا قلم ہمیشہ تیغ بے نیام رہا ہے ۔ اور ہزاروں حق پرستوں کا خون ان کے فتووں کا دامن گیر ہے ۔ اسلام کی تاریخ لو خواہ کہیں سے پڑھو ۔ تو سیکڑوں مثالیں ملتی ہیں کہ جب بادشاہ خونریزی پر آتا تھا تو دار الافتا کا قلم اور سپہ سالار کی تیغ دونوں یکساں طور پر کام دیتے تھے ، صوفیہ اور ارباب باطن پر منحصر نہیں ، علماے شریعت میں سے بھی جو نکتہ بین اسرار حقیقت کے قریب ہوئے ، فقہاء کے ہاتھوں انھیں مصیبتیں اٹھانی پڑیں ، اور بالآخر سر دے کر نجات پائی ۔ سرمد بھی اسی تیغ کا شہید ہے ۔

چوں می رود نظیری خونیں کفن بحشر   خلقے فغاں کنند کہ ایں دادخواہ کیست

آخر الامر یہ قرار پایا کہ سرمد کو علما و فضلائے عصر کے مجمع میں طلب کیا جائے، اور تمام علماء کی جو رائے قائم ہو، اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ چنانچہ مجلس منعقد ہوئی اور سرمد کو بلایا گیا۔ سب سے پہلے خود عالمگیر مخاطب ہوا، اور پوچھا کہ لوگ کہتے ہیں کہ سرمد نے دارا شکوہ کو مژدہ سلطنت دیا تھا۔ کیا یہ سچ ہے؟ سرمد نے کہا کہ ہاں اور وہ درست نکلا کہ اسے ابدی سلطنت کی تاجپوشی نصیب ہوئی۔ عمامہ بندوں نے کہا، کہ برہنگی شرع کے خلاف ہے، اور اس کے لیے صاحب عقل و تمیز کا کوئی عذر مسموع نہیں اس کا جواب، تو سرمد پہلے دے چکا تھا۔

در دے عجبے برہنہ کردہ است مرا

خلیفہ ابراہیم بدخشانی اواخر عہد عالمگیری میں ایک صاحب طریقت بزرگ گزرے ہیں والہ داغستانی ان بزرگ سے روایت کرتا ہے کہ جب مجمع علماء میں سرمد کو لباس پہننے کے لیے کہا گیا اور مسموع نہ ہوا تو بادشاہ نے علماء سے کہا کہ محض برہنگی وجہ قتل نہیں ہو سکتی۔ اس سے کہا جائے کہ کلمہ طیبہ پڑھے، اور یہ اس لیے کہ بادشاہ سن چکا تھا کہ سرمد کی عادات عجیبہ میں سے ایک یہ عادت بھی ہے کہ کلمہ طیبہ جب پڑھتا ہے تو الٰہ سے زیادہ نہیں کہتا۔ علما نے سرمد سے کلمہ پڑھنے کی خواہش کی تو اپنی عادت کے بموجب صرف لَآ اِلٰهَ پڑھا کہ جملہ نفی ہے اس پر علماء نے شور مچایا۔ تو کہا ابھی تک میں نفی میں مستغرق ہوں، مرتبہ اثبات تک نہیں پہنچا۔ اگر اِلَّا اللہ کہوں گا تو جھوٹ ہوگا۔ اور جو دل میں نہ ہو وہ زبان پر کیسے آئے؟ علماء نے کہا ایسا کہنا کفر صریح ہے، اگر توبہ نہ کرے تو مستحق قتل ہے۔ یہ ظاہر پرست نہیں جانتے تھے کہ سرمد اس سے بہت اونچا ہے کہ کفر و ایمان کی بحثیں سنائی جائیں، وہ قتل و خون کے احکام سے مرعوب ہو۔ یہ کفر ساز تو اپنے مدرسہ و مسجد کے صحن میں کھڑے ہو کر سوچتے تھے کہ اس کی کرسی کتنی اونچی ہے، اور وہ اس منارۂ عشق پر تھا جہاں دیوار کعبہ اور مندر بالمقابل نظر آتے ہیں، اور جہاں کفر و ایمان کے علم ایک ساتھ لہراتے ہیں۔

کشودہ بست کہ در دے ود از کفر سخن   ہمہ جا گفت و شنو برسر ایماں نہ رود

سرمد نے تو اپنی حالت، بے کم و کاست، بیان کر دی تھی، ایمان بالغیب پر جو

لوگ قانع نہیں ہوتے وہ اپنے اقرار کو مشاہدۂ عینی سے استوار کرنا چاہتے ہیں اور شاہدِ حقیقت کی رونمائی نقد شہادت ہے جو ابھی سرمد کو نصیب نہیں ہوئی تھی۔ پس جس چیز کو دیکھا نہ تھا۔ کیوں کر کہتا ہے کہ "ہے"۔ "اس مسلک کے جتنے رہرو ہیں سب ہی کو اس منزل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ لیکن سرمد کا جرم یہ تھا کہ وہ جس جام کو چھپ چھپ کر پیتے ہیں۔ سرمد نے علانیہ منہ سے لگایا اور دُرّۂ محتسب کا مستحق ٹھہرا:

خرقہ پوشاں ہمہ گرمست گزشتند گزشت　　قصہ ماست کہ در کوچہ و بازار بماند

اور نظر تعمق سے دیکھیے تو یہ اعلان ضروری تھا، کیوں کہ جب اس سفر کی آخری منزل شہادت تھی تو خواہ ناقے کا رُخ کسی طرف ہوتا دستِ کارفرما کا فرض تھا کہ اس طرف پھیر دے۔

منصور را کہ رخصتِ اظہار دادہ اند　　غیر از قصاص و محنت زنداں نبودہ شرط

غرض کہ جب سرمد نے توبہ نہ کی تو علماء نے بلا تامل فتویٰ صادر کیا اور دوسرے دن قتل گاہ میں لے گئے۔ یہ واقعہ ۱۰۷۰ھ میں ہوا کہ عالم گیر کی تخت نشینی کو ایک سال سے زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا۔

مو بمویم دوست شد ترسم کہ استیلائے عشق
یک انا الحق گوئے دیگر بر سر دار آورد

جب سرمد کو شہادت گاہ لے چلے تمام شہر ٹوٹ پڑا، اور اس قدر ہجوم تھا کہ راستہ چلنا دشوار ہو گیا تھا۔ عشق کی نیرنگیوں کو کیا کہیے جہاں کا عام پسند تماشا خوں ریزی ہے، اور جہاں قربانی سے بڑھ کر کوئی دل پسند کھیل نہیں۔ جب کوئی سر دادہ سر بکف بڑھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ دولھا کی سواری جا رہی ہے، اور براتیوں کا ہجوم ہے کہ شانے سے شانہ چھلتا ہے۔

بجرم عشق توام می کشند و غوغائیست　　تو نیز بر سر بام آ چہ خوش تماشائیست

مگر یہ عشق مجازی تھا کہ سرِ بام آنے کی خواہش کی گئی ورنہ سرمد کو تو سر اٹھانے کی بھی ضرورت نہ ہوئی، جب جلاد تلوار چمکاتا ہوا آگے بڑھا تو مسکرا کر نظر ملائی اور کہا،

"فدائے تو شوم بیا بیا کہ تو بہر صورتے کہ می آئی من ترا خوب می شناسم"

صاحب مرأۃ الخیال راوی ہے کہ اس جملے کے بعد یہ شعر پڑھا، اور مردانہ وار سر تلوار کے نیچے رکھ کر جان دے دی۔

شورے شد و از خوابِ عدم چشم کشودیم   دیدیم کہ باقی است شبِ فتنہ غنودیم

صاحب مراۃ الخیال کو عالمگیر کی خوشامد سے اتنی فرصت کہاں تھی کہ سرمد کی نعش خون آلود پر اشک افشانی کرتا لیکن ستم یہ ہے کہ اس سنگین دلی پر قانع نہ ہو کر چاہتا ہے کہ کسی طرح یہ خوں ریزی بھی عالمگیر کے دفتر مناقب و فضائل میں جگہ پائے۔ حالاں کہ اس دفتر میں تو پہلے ہی سے ہر صفحہ رنگین ہے، اس کو بھی عشق کی شیوہ گری سمجھیے کہ یہاں کی قربانیوں سے جن کے ہاتھ خون آلود ہوتے ہیں وہ مجرم و خونی ہونے کی جگہ تحسین و ثواب کا صلہ مانگتے ہیں۔ گویا میدان عشق بھی قربان گاہِ بتاں ہے کہ جس قدر خون بہائے عین ثواب ہے۔

یہ عجیب رسم دیکھی کہ بروزِ عید قربان   وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سرمد کی جہاں قبر سمجھی جاتی ہے یہ اس کا مدفن نہیں صرف مشہد ہے۔ لیکن والہ داغستانی نے تصریح کر دی ہے کہ: "در جنب مسجد جامع گردن اورا زدند و در ہما نجا دفن کردند" یہ مقام موجودہ مزار کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟ پھر لکھتے ہیں کہ "راقم الحروف زیارتِ مزاروے مکرر مشرف شدہ ام در بہار فصل سبزہ از تربتش کم می شود والحق فیض عجیبے در زیارت آں منصور ثانی است۔"

والہ داغستانی عہد محمد شاہی میں تھا، اور اس کے تذکرے کا سال تصنیف ۱۱۶۰ھ ہے۔ لیکن آج بھی مشہد سرمد زیارت گاہ عوام و خواص ہے، اور ہمیشہ فاتحہ کے ہاتھ اس کے آگے رو بآسمان رہتے ہیں:

بر سرِ تربتِ من چوں گذری ہمت خواہ   کہ زیارت گہہ رندانِ جہاں خواہد بود

خلیفہ ابراہیم بدخشانی راوی ہیں کہ سرمد نے زندگی میں کلمہ طیبہ لَا اِلٰہ سے زیادہ نہیں پڑھا۔ لیکن جب شہادت پائی تو لوگوں نے سنا کہ سر کشتہ سے تین بار لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کی صدا بلند ہوئی۔ اس کے علاوہ والہ داغستانی لکھتے ہیں کہ ایک ثقہ جماعت سے سُنا گیا ہے کہ سرمد کا سَر مقتول کلمۂ طیبہ پڑھتا رہا۔ اور اتنا ہی نہیں بلکہ کچھ دیر مصروف حمد الٰہی بھی رہا۔ موجودہ زمانے میں ایسی روایتوں پر لوگ بمشکل یقین لائیں گے، لیکن ہمیں تو یہ بیان پڑھ کر تعجب نہ ہوا۔ کیوں کہ اگر خوش اعتقادی کے کان نہیں ہیں تو کیا حقیقت بینی کی آنکھوں سے بھی محروم ہو جانا چاہیے! ہم نے بہار میں شگفتہ و شاداب پھولوں اور خزاں میں افسردہ و خشک شاخوں کو باتیں کرتے دیکھا ہے۔ پھر اگر ایک شہید عشق کے

سرِمقتولوں کے لب ہلتے نظر آئیں تو کیوں تعجب ہو؟ ممکن ہے کہ سرمد کے بے جان سر سے زیادہ گزر کر ہمارے کانوں میں اب تک مشہد سرمد سے صدا آ رہی ہے کہ:

کس چہ داند قدر مردِ نہائے عشق　　منّتِ ایں مرگ بر جان من است

عالمگیر ۱۰۶۹ھ میں تخت نشین ہوا۔ اور ایک ہی سال کے بعد سرمد کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد ایک قرن سے زیادہ عرصے تک حکومت کی، اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ:۔

خونے کہ عشق ریزد ہرگز بدر نباشد

یہ سرمد کے خون ہی کی نیرنگیاں تھیں کہ اس تمام مدت میں عالمگیر کو کبھی راحت و اطمینان کے دن نصیب نہ ہوئے۔ یہاں تک کہ پیغام اجل بھی آیا تو عالم غربت و پریشانی میں۔ مگر سوانح نویس کے قلم سے ایسے جملے نہیں نکل سکتے۔ ہمارے لیے تو یہی بہتر ہے کہ ہو سکے تو عالمگیر کو بھی اس معاملے میں معذور سمجھیں۔ تاریخ قیاس و ظنون اور شخصی آرا کے پریشان مجموعوں کا نام ہے۔ آج چند میلوں کے فاصلے پر ایک حادثہ گزرتا ہے تو اخباروں کے دو نامہ نگار متفق اللسان نہیں ہوتے۔ کس کو معلوم ہے کہ اس وقت کی اصلی حالت کیا تھی، اور عالم گیر کے گرد و پیش کن حالات و اسباب کا ہجوم تھا۔ پھر یہ بھی ہے کہ خونِ رفتگانِ عشق جب اپنے قاتلوں سے گلہ مندِ جفا نہیں تو ہمیں کیا حق ہے کہ ان کی شکایت سے قلم آلودہ ہوں۔ جب سرمد نے جلاد سے کہا۔ "بہر صورتے کہ می آئی من ترا می شناسم" تو اسے عالمگیری علما کیا شکایت ہو گی۔ بات یہ ہے کہ دبارِ محبت میں انتقام و دعوٰی کی شنوائی نہیں۔ اور عشق کے مذہب میں کینہ و عداوت سے بڑھ کر کوئی شے حرام نہیں۔ یہاں سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ قاتل تیغ لے کر آئے تو سر جھکا دیجے۔ اور ہو سکے تو اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیجیے۔

شد است سینہ ظہوری پُر از محبتِ یار
برائے کینۂ اغیار در دلم جا نیست

قصرِ حُسنی

گاہے گاہے باز خواں ایں دفترِ پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را

خاندان برامکہ کے ایک ممتاز اور عالی مرتبہ ممبر، حسن بن سہل نے، نہرِ معلّٰی کے نیچے، ساحل دجلہ پر ایک قصرِ عالی شان تعمیر کرایا تھا، یہ قصر اپنے بانی کے نام سے مشہور تھا، جس کی وفات کے بعد اس کی بیٹی بوران[1] کے قبضہ میں آیا، خاندان عباسیہ کا سولھواں فرماں روا معتضد باللہ جب تخت نشین ہوا تو اپنے قیام گاہ کے لیے اس کی نظر انتخاب اس محل پر پڑی، چناں چہ اس نے بوران بنت حسن سے اس کے تخلیہ کی فرمائش کی، بوران نے چند روز کی مہلت مانگی جو اس کو مل گئی۔

حصولِ مہلت کے بعد بوران نے عمارت کی درستگی و آراستگی کی طرف توجہ کی، اوّلاً شکستہ مقامات کی مرمت کرائی، اس کے بعد سفیدی پھروائی، اصل عمارت کی درستگی کے بعد اُس کی آراستگی شروع کی، زمین پر نہایت بیش بہا و خوشنما فرش بچھوائے، دروازوں پر نہایت پُر تکلف و گراں قیمت پردے لٹکائے گئے، آراستگی سے فراغت کے بعد محل کے گوداموں میں وہ تمام اشیا مہیا کی گئیں جن کی شاہانہ زندگی میں ضرورت ہوتی ہے، جب اس عمارت کو بہمہ وجوہ شاہی قیام کے قابل بنا دیا تو معتضد باللہ کو اطلاع دی اور معتضد نے محل کو بہمہ وجوہ آراستہ و مکمل دیکھ کر نہایت پسندیدگی

---

[1] یہ بوران، حسن بن سہل کی وہی لڑکی ہے جس سے مامون رشید نے عقد کیا تھا، اور جس کی نسبت ایک طول طویل حکایت عقد الفرید میں بیان کی گئی ہے۔ علّامہ ابن خلدون نے مقدمۂ تاریخ میں اس حکایت کا مضحکہ اڑایا ہے۔ ۱۲

نوٹ: مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ مضمون رسالہ نقاد (آگرہ) کے شمارۂ فروری ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا تھا معلوم نہیں نقاد میں یہ کس ماخذ سے نقل کیا گیا۔ اس زمانے میں الہلال نکل رہا تھا لیکن یہ الہلال میں موجود نہیں، الہلال کے علاوہ کسی رسالے کے لیے کوئی مضمون لکھنا مولانا کے لیے ممکن نہ تھا۔ اس لیے یقین ہے کہ یہ مضمون الہلال کے اجرا سے قبل کا ہے، اور بایں یقین یہ اس مجموعے میں جگہ پا رہا ہے۔ (ابوسلمان)

ظاہر کی۔

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا ماخذ ہلال بن المحسن کی روایت ہے مگر اس روایت کا آخری جز یعنی بوراؔن سے معتضد کی تخلیہ محل کی فرمائش اور بوران کا معتضد کو حوالہ کرنا قابل تسلیم نہیں، اس لیے کہ بوراؔن کا سنہ وفات ۲۷۱ ہجری ہے، اور معتضد ۲۷۹ھ ہجری میں، تخت نشین ہوا ہے۔

معتضد سے پہلے معتمد باللہ ۲۵۶ھ ہجری میں تخت نشین ہوا تھا۔ بوراؔن اس وقت زندہ تھی، اس لیے عجب نہیں کہ بوراؔن نے معتمد کو یہ قصر دیا ہو، اور روایت نے غلطی سے معتمد کے بدلے معتضد بیان کر دیا ہو، بہر نوع اس قدر ضرور صحیح واقعہ ہے کہ یہ قصر دراصل حسن بن سہل برمکی کا تھا، اس کی وفات کے بعد بوران کے پاس رہا، اور بوران سے خلفاے بنی عباس کے پاس آیا۔

معتضد نے اس قصر کے گرد و پیش کے قطعات بھی اس میں شامل کر لیے اور ایک دیوار اٹھوادی جس سے نہ صرف یہ تمام قطعات ایک عمارت کے اجزا معلوم ہونے لگے بلکہ نہایت مستحکم اور محفوظ ہو گئے، معتضد کے جانشین مکتفی باللہ نے جو ۲۸۹ھ ہجری میں تخت نشین ہوا تھا، دجلہ پر ایک تاج بنوایا جس کے پیچھے چند بے حد بلند و وسیع قبے اور ایوان بھی تعمیر کرائے تھے۔

مکتفی کے بعد مقتدر ۲۹۵ھ میں تخت نشین ہوا، مقتدر نے تعمیرات کے نا تمام حصوں کی تکمیل مزید کی، اور بعض نئی عمارتیں بھی از سر نو بنوائیں۔ اس تمام اضافہ و توسیع کے بعد دار الخلافتہ کا طول و عرض کیا تھا؟ اس کا جواب عضد الدولہ کے خزانچی ابو نصر خوشاذہ کی زبان سے یہ ہے کہ "میں دار الخلافتہ کے آباد و ویران حصے اور حریم و غیر حریم میں پھرا۔ میرے اندازہ میں دار الخلافتہ شہر شیراز کے برابر ہے۔"

دار الخلافتہ نہ صرف اپنی وسعت و بلندی کے لحاظ سے دہشت انگیز و حیرت آفریں تھا بلکہ اس کے بعض قطعات بھی اس زمانے کی اعجوبہ طرازی و نادرہ کاری کے بہترین نمونہ تھے، اس عنوان کے تحت میں گو دار الشجر، الجوسق اور حیر الوحش کے علاوہ الفردوس اور التاج بھی داخل ہیں مگر چوں کہ مصنف نے ان دونوں قطعات کے متعلق کچھ بھی نہیں لکھا، اس لیے ہم صرف مقدم الذکر مقامات کے حالات لکھتے ہیں۔

دار الشجرہ :

دار الخلافتہ کے ایک قطعہ میں نہایت صاف پانی کا ایک وسیع و مستدیر حوض تھا، وسط حوض میں ایک نقرئی درخت تھا، جس کا وزن پانچ کروڑ درہم تھا، اس درخت کی ۱۸ شاخیں تھیں، بعض شاخیں نقرئی اور بعض پر طلائی ملمع تھا۔ یہ شاخیں بہت طویل تھیں، جب ہوا چلتی تھی تو یہ شاخیں اصلی شاخوں کی طرح جھومتی تھیں، ان کے پتے مختلف رنگ کے تھے جو ہوا سے اصلی پتوں کی طرح ہلتے تھے، ان شاخوں پر ہر نوع کے نقرئی و طلائی طیور بٹھائے گئے تھے جو نہایت شیرینی کے ساتھ نغمہ سنجیاں کرتے تھے، حوض کے داہنی و بائیں جانب اسپ سواروں کے ۱۵ سنگی بت تھے، سواروں کی پوشاکیں دیبا و حریر وغیرہ گراں بہا کپڑوں کی تھیں، ہر سوار کے ہاتھ میں ایک ایک نیزہ تھا، یہ تمام سوار اس طرح متحرک تھے کہ معلوم ہوتا تھا گویا ان میں سے ہر ایک سوار دوسرے پر حملہ کرنا چاہتا ہے، یہ مکان دار الشجرہ کہلاتا تھا اور عجیب و غریب مشینوں اور علم منجنیق کے رموز و اسرار سے ایک حیرت انگیز طلسم بنا ہوا تھا۔

الجوسق :

یہ ایک محل کا نام ہے جو چند باغوں کے درمیان میں بنایا گیا تھا، وسط محل میں رانگے کا ایک حوض تھا، یہ حوض ایک جانب سے تیس ہاتھ اور دوسری جانب سے ۲۰ ہاتھ لمبا تھا، اس کے گرد رانگے کی ایک نہر بھی تھی جو صفائی اور سفیدی میں جلا کی ہوئی چاندی سے بھی زیادہ درخشاں و خوش نما معلوم ہوتی تھی، حوض میں چار طیارات تھیں (طیارہ ایک خاص قسم کی کشتی کو کہتے تھے) ان کشتیوں کی نشست گاہیں طلائی تھیں جن پر کارچوبی اور حاشیہ دار دبیقی کپڑا منڈھا ہوا تھا، اور ان پر کارچوبی پارچہ دبیقی کی چادریں پڑی رہتی تھیں۔

حوض کے گرد ایک وسیع باغ تھا، جس میں ایک روایت کے بموجب چار سو کھجور کے درخت تھے، ہر درخت پچاس ہاتھ لمبا تھا، ان درختوں کے تنوں پر منقش ساگوں کے پترے ہر چہار طرف سے جڑے ہوئے تھے، اور ان کے تنے طلائی ملمع کا سے آراستہ کیے گئے تھے، باغ کے کناروں پر ترنج، دستنبو

اور منقع وغیرہ درختوں کی قطاریں باغ رضواں کا دھوکا دیتی تھیں۔

حیر الوحش:

"حیر" کے معنی باغ کے ہیں، اور وحش سے مقصود حیوانات ہیں، یہ قطعہ دراصل آج کل کی اصطلاح کے مطابق باغ حیوانات تھا، اس میں مختلف قسم کے جنگلی جانور رکھے گئے تھے، اور وہ اس قدر انسانوں سے مانوس ہو گئے تھے کہ آدمیوں کے پاس آکے اُن کے جسم سونگھتے تھے (جیسا کہ پالتو جانور اکثر کرتے ہیں) اور اُن کے ہاتھ سے چیزیں لے کر کھاتے تھے۔

۳۰۵ھ میں شاہ روم نے مقتدر باللہ کے پاس اپنا سفیر بھیجا، یہ سفیر جب تکریت پہنچا تو مقتدر نے حکم دیا کہ دو ماہ تک اس کو تکریت میں رکھا جائے، وہاں سے جب بغداد آیا تو دار ساعد میں اُتارا گیا، یہاں سفیر نے دو ماہ تک انتظار کیا مگر بارگاہِ خلافت میں حاضر ہونے کی اجازت نہیں ملی، اس عرصہ میں قصر کی آرائش نہایت اہتمام کے ساتھ گراں بہا خوشنما آلات، فروش، اور پردوں سے کی گئی تھی، پارچہ ہائے انماطی، دبیقی اور طبری کے بارہ ہزار فرش بچھائے گئے، ۳۸ ہزار روپے پارچہ ہائے ارمنی، واسطی، بہنی، دبیقی مطرز تز کے لٹکائے گئے، ان ۳۸ ہزار پردوں میں سے ۱۲ ہزار پردے پارچۂ دبیقی کے تھے جن پر گھوڑے، ہاتھی، اونٹ اور دیگر جانور کی تصویریں منقش تھیں۔

سفیر کی فرودگاہ (دار ساعد) سے لے کے دار الخلافت کے یہاں تک ایک لاکھ ساٹھ ہزار سوار اور پیادوں کی دورویہ صفیں کھڑی کی گئی تھیں، سواروں کی پوشاکیں نہایت قیمتی، گھوڑے نہایت عمدہ، زینیں نقرئی و طلائی تھیں، سواروں کے ہمراہ کوتل گھوڑے بھی تھے، بازار شرقی کی تمام دُکانیں، کوٹھے حتیٰ کہ چھتیں اور چھجے تک تماشائیوں نے بہت زیادہ کرایہ پر لے لیے تھے، بازار مذکور کے یمین ویسار کے مکانات اور خود بازار تماشائیوں سے بھرا ہوا تھا۔

اصناف کشتی میں سے شذاوات، طیارات، زلازلات، اور سمریات دجلہ میں باہمہ آرائش و سامان کھڑی تھیں، دار الخلافت کے پھاٹک سے لے کر پیش گاہِ خلافت تک مجرئی غلام اور اندرونی و بیرونی خدام لباس فاخرہ پہنے، زرین پٹکے باندھے اور ہاتھوں میں ننگی تلواریں لیے سرو قد کھڑے ہوئے تھے۔ تمام حاجب

و دیگر خدام اپنے اپنے منصب کے موافق گزر گاہوں اور نشست گاہوں میں حاضر تھے، آرائش کے یہ ہمہ وجوہ مکمل ہونے کے بعد سفیر کو حاضر ہونے کی اجازت دی گئی۔

سفیر اپنی فرودگاہ وار ساعد سے مع اپنے تمام جلوس کے دو رویہ صفوں سے ہوتا ہوا دار الخلافت کی طرف روانہ ہوا، راستہ میں نصر قشوری الحاجب کا مکان ملا جو خلیفہ کی ڈیوڑھی کا دربان تھا، لیکن مکان کی آراستگی اور اشخاص کی صف بستگی کو دیکھ کے وہ سمجھا کہ شاید دار الخلافت یہی ہے، منظر مکان کی عظمت اور خیال دار الخلافت کی ہیبت اس پر چھاگئی، اور وہ مرعوب ہو کر رُک گیا، لیکن پھر اس کو بتا دیا گیا کہ یہ دار الخلافت نہیں ہے بلکہ دار الحاجب ہے، سفیر آگے بڑھا، تھوڑی دور کے بعد وزیر السلطنت کا مکان ملا، یہ مکان ابو الحسن علی بن محمد الفرات کی صرف مردانہ نشست گاہ تھی، یہاں جب سفیر نے حاجب کے مکان سے زیادہ شکوہ و احتشام دیکھا تو اس کو یقین ہو گیا کہ یہی دار الخلافت ہے مگر یہاں بھی اسے بتایا گیا کہ یہ دار الخلافت نہیں بلکہ دار الوزیر ہے۔

دجلہ اور باغ کے بیچ میں ایک نشست گاہ تھی جو عمدہ عمدہ پردوں اور چیدہ چیدہ فرشوں سے آراستہ تھی، چند دست تخت یا اس کے مانند کوئی شے نصب تھے، جن کے ہر چہار طرف غلام عصا اور تلواریں لیے کھڑے تھے سفیر اس نشست گاہ میں گیا، اس کے بعد تمام قصر کی سیر کرائی گئی، پھر پیش گاہ خلافت میں باریاب ہونے کے لیے حاضر ہوا۔

یہ تفصیل ایک روایت کے مطابق ہے۔ دوسری روایت سے جو اس روایت سے طویل، مفصل اور کسی قدر مختلف ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب سفیر دار الخلافت تک پہنچ گیا تو ایک تہ خانہ میں داخل کیا گیا جہاں سے وہ بارگاہِ خلافت میں حاضر کیا گیا، سفیر نے شاہِ روم کا پیغام عرض کیا، اور اس کے بعد اس کو تمام قصر کی سیر کرائی گئی، سیر قصر کی کیفیت کے متعلق چند روایتوں کے جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت سفیر داخل ہوا ہے قصر میں فوج کا ایک سپاہی بھی نہ تھا، صرف حجاب اور مختلف النسل خدام تھے جن کی تفصیل یہ ہے۔

حبشی غلام	حُجاب	خدام سیاہ	خدام سفید
۴ ہزار	۷ سو	۳ ہزار	۴ ہزار

یہ تمام اشخاص چھتوں پر کھڑے کیے گئے تھے، سفیر عام پھاٹک سے داخل ہو کے خان خیل کی طرف چلا، خان خیل ایک بہت بڑا مکان تھا، جس میں بہ کثرت رواق اور سنگِ مرمر کے ستون تھے، داہنی جانب پانچ سو گھوڑے کھڑے تھے، جن پر پانچ سو طلائی و نقرئی زینیں کسی ہوئی تھیں، اسی طرح بائیں جانب پانچ سو گھوڑے کھڑے تھے جن پر دیبا کی جھولیں اور لمبے لمبے برقعے پڑے ہوئے تھے اور ان تمام گھوڑوں کی باگیں لباس فاخرہ پہنے ہوئے سائیسوں کے ہاتھوں میں تھیں۔

یہاں سے درمیان کی دہلیزوں اور گزرگاہوں سے ہوتے ہوئے سفیر کو حیرالوحش میں لے گئے، حیرالوحش سے اُس کو ایک اور مکان میں لے گئے جہاں چار ہاتھی کھڑے تھے یہ ہاتھی دیبا کی جھولوں اور گلکاری سے آراستہ کیے گئے تھے، سفیر ان مقامات کو نہایت متحیر ہو ہو کے دیکھتا تھا، اور ادنیٰ ادنیٰ باتوں کو متعجبانہ پوچھتا تھا، اس مکان سے اس کو ایک اور مکان میں لے گئے جہاں ایک سو شیر تھے، ۵۰ داہنی جانب اور ۵۰ بائیں جانب، ان شیروں میں سے ہر شیر کا ہاتھ چند اور شیروں کے ہاتھ میں تھا، اور شیروں کی گردنوں میں زنجیریں اور طوق پڑے تھے، اس مکان سے اس کو الجوسق میں لے گئے، الجوسق سے دار الشجرہ میں اور دار الشجرہ سے الفردوس میں لے گئے جو بے شمار آلات و فروش سے آراستہ تھا۔

الفردوس کی دہلیز میں دس ہزار طلاکار زرعین آویزاں تھیں، یہاں سے اس کو ایک ایسے راستہ میں لے گئے جو تین سو ہاتھ لمبا تھا، اور اس کے ہر دو جانب دس ہزار درقہ، خود، بیقہ، زرہ، مرصع، ترکش اور کمانیں آویزاں تھیں، اور ایک ہزار گورے اور حبشی غلام چپ و راست کھڑے تھے، ۲۳ محلوں کی سیر کرنے کے بعد سفیر کو صحن التسعینی میں لے گئے، صحن التسعینی میں حجری غلام لباس فاخرہ پہنے اور پورے طور پر مسلح کھڑے تھے اور ان کے اسلحہ میں برچھے، تیر، عصا اور تلواریں تھیں، سفیر کو مع اپنے جلوس کے صحن التسعینی سے دار السلام میں لے گئے جہاں کثرت سے سقی کے غلام دوڑ دوڑ کے برف کا پانی اور شربت وغیرہ لوگوں کو پلا رہے تھے۔

اس سیر کی طول مسافت کا اندازہ اِس سے ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ سات مقام پر اس عرصہ میں استراحت کی غرض سے بیٹھے اور اتنی ہی بار پانی پیا، ابو عُمر عدی الطرطوشی صاحب السلطان اور رئیس بلادِ شام ایک سیاہ عبا پہنے اور سیف و منطقہ زیب کمر کیے، تمام سیر میں اِن کے ہمراہ تھے۔ جب سفیر روم خلافت کی سیر کر چکا تو حریم خلافت سے اِس کی طلبی کا پیغام پہنچا۔

خلیفہ المقتدر باللہ کے دیوان خاص کی عمارت "قصر حسنی" کا وہ ٹکڑا تھا جو عین دجلہ کے کنارے واقع تھا اور "التاج" کے نام سے مشہور تھا، سفیر جب باریاب حضوری ہوا تو اس نے دیکھا کہ آبنوس کے ایک تخت پر خلیفۂ عباسی متمکن ہے، اور دیبق کا ایک زرافشاں حلہ پہنے ہوئے ہے، جس پر طلائی بیل بوٹوں کے بنانے میں صنّاع نے حیرت انگیز انسانی کمال ظاہر کیا ہے۔ تخت بھی دیبقی مطرز و مذہب فرش سے مفروش ہے، اور اِس کے سِروں کے دونوں جانب لعل و زمرد کے دو بڑے بڑے ہار آویزاں ہیں جن کی چمک اور درخشانی سے تمام گرد و پیش منور ہو رہا ہے۔

خلیفہ کے سامنے اِس کے پانچ شہزادے بیٹھے تھے، تین داہنی جانب اور دو بائیں طرف سفیر روم کے ساتھ نصر القشوری بہ حیثیت مترجم کے موجود، سفیر جب تخت کے قریب پہنچا تو اُس نے سینہ پر ہاتھ رکھا اور تعظیم کے اظہار کے لیے سر جھکا دیا۔ پھر مترجم سے کہا کہ "اگر تمہارے یہاں سجدہ کرنا ممنوع نہ ہوتا تو میں سجدہ کرتا لیکن میں اُس طریق سے کورنش بجالایا ہوں، جو ہمارے یہاں کے آداب و رسوم کا شعار ہے۔"

اِس کے بعد خلیفہ کی طرف سے قیصر روم کے خط کا جواب دیا گیا جس کو سفیر نے لے کر چُوما، آنکھوں سے لگایا اور باب دجلہ کی طرف سے اپنی فرودگاہ کی طرف روانہ ہو گیا، خلیفہ کی طرف سے سفیر روم کے لیے پچاس کشتیاں عطایائے شاہانہ کی پیشتر سے پہنچ چکی تھیں، اس کا اندازہ مشکل ہے کہ اِن میں سے ہر کشتی کے اندر دنیا کی کس قدر دولت موجود تھی؟ اور جس خزانے سے آئی تھی اُس کے اندر زر و جواہر کے کیسے عظیم الشان سمندر بہ رہے تھے؟ یہ واقعہ ۳۰۵ھ کا ہے۔

ابوالکلام آزاد۔ دہلوی

مطبوعاتِ مولانا آزاد صدی

مولانا ابوالکلام آزاد (شخصی مطالعہ) : از ڈاکٹر شیر بہادر خاں پنی - مولانا آزاد کی شخصیت، سیرت اور افکار و خدمات کے بارے میں مصنف کا مطالعہ اور تاثرات۔ صفحات : ۱۱۲، قیمت : ۲۵ روپے (مجلد)

امام الہند مولانا آزاد : از مولانا امداد صابری - مولانا آزاد کی ہمہ جہت شخصیت، خصائص فکر، کمال اخلاق و تہذیب، محاسن سیرت اور ان کے علمی و عملی کارناموں کا تعارف۔ صفحات : ۳۰۴، قیمت : ۶۵ روپے (مجلد)

اردو کا ادیب اعظم : از عبدالماجد دریابادی - مولانا آزاد سے متعلق مصنف کے مضامین، تقاریر، شذرات، کتابوں پر تبصرے اور دونوں کے مابین مراسلت کا مجموعہ۔ صفحات : ۱۶۰، قیمت : ۳۰ روپے (مجلد)

خطوطِ ماجدی : مرتبہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری - مولانا عبدالماجد دریابادی کے علمی، ادبی، لسانی اور نیچ کے تین سو خطوط اور مشاہیر کے بارے میں تیئیس پیغامات کا مجموعہ۔ صفحات : ۲۷۲، قیمت : ۶۰ روپے (مجلد)

ابوالکلام آزاد : مرتبہ عبداللہ بٹ - مولانا آزاد پر مشاہیر علم و سیاست کے مضامین کا مجموعہ - پہلی اشاعت : ۱۹۴۳ء اہم اضافوں کے ساتھ آزاد صدی ایڈیشن۔ صفحات : ۱۵۲، قیمت : ۳۰ روپے (مجلد)

آسپکٹس آف ابوالکلام آزاد (انگریزی) : مرتبہ عبداللہ بٹ - مشاہیر و معاصرین علم و سیاست کے مضامین کا مجموعہ - آزادی صدی ایڈیشن - اہم اضافوں کے ساتھ۔ صفحات : ۱۲۸، قیمت : ۴۰ روپے (مجلد)

مولانا ابوالکلام آزاد (شخصیت، سیرت اور کارنامے) : مولانا سعید احمد اکبرآبادی - مولانا آزاد کی سیرت اور علمی، ادبی و سیاسی خدمات پر مقالات، تبصرے اور تقریر۔ صفحات : ۱۲۸، قیمت : ۳۰ روپے (مجلد)

ابوالکلام و عبدالماجد (ادبی معرکہ) : از ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری - الہلال کی ایک ادبی لسانی بحث کی روداد اور اجزائے بحث کی تدوین و محاکمہ۔ صفحات : ۱۴۴، قیمت : ۲۵ روپے (مجلد)

ابوالکلام آزاد —— ایک مطالعہ : مرتبہ و مؤلفہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری - مولانا آزاد کی شخصیت اور بہ حیثیت ادیب، خطیب، صحافی، عالم دین، سیاسی افکار و خدمات کا تعارف و تبصرہ - صفحات : ۲۴۸، قیمت : ۵۰ روپے (مجلد)

انجمن خدام کعبہ (تاریخ اور مقاصد و خدمات) : از ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری - ۲۰ ویں صدی کی پہلی اسلامی انقلابی تحریک پر ناقدانہ نظر - ایثار ملی اور عبرت کا ایک متاثر کن منظر - صفحات : ۱۱۲، قیمت : ۳۰ روپے (مجلد)

اردو کی ترقی میں مولانا ابوالکلام آزاد کا حصہ : از ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری - اردو کی علمی ترقی، فروغ اور لسانیات میں مولانا آزاد کی خدمات اور افکار کا تعارف۔ صفحات : ۱۴۴، قیمت : ۴۰ روپے (مجلد)

پیغام کلکتہ (۱۹۲۱ء) : آل انڈیا خلافت کمیٹی کا ترجمان، زیر نگرانی : مولانا ابوالکلام آزاد، زیر ادارت : مولانا عبدالرزق ملیح آبادی - تاریخ ملت اسلامیہ ہند کا ایک اہم ماخذ (عکسی اشاعت) صفحات : ۲۰۸ (بڑا سائز)، قیمت : ۱۰۰ روپے (مجلد)

مولانا حسرت موہانی ـــــ مجاہد آزادی کامل : از شفقت رضوی ۔ مکمل آزادی کے لیے مولانا حسرت کی مجاہدانہ سرگزشت مع ۱۹۲۱ء کا ضبط شدہ خطبۂ صدارت (عکس)۔ صفحات : ۱۴۴، قیمت : ۴۰ روپے (مجلد)

میر کارواں مولانا ابوالکلام آزاد : از ڈاکٹر ریاض الرحمٰن شروانی ۔ مولانا آزاد کی زندگی، سیرت اور افکار و خدمات پر مشاہدے، مطالعے اور تحقیق کا حاصل ۔ صفحات : ۱۴۴، قیمت : ۴۰ روپے (مجلد)

مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے معاصرین : مرتبہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری ۔ نو معاصر مشاہیر سے مولانا آزاد کے تعلقات و روابط کی داستان اور افکار و سیرت کا موازنہ ۔ صفحات : ۱۷۸، قیمت : ۵۰ روپے (مجلد)

شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی ـــــ ایک سیاسی مطالعہ : از ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری ۔ شیخ الہند کی سیاسی خدمات پر تبصرہ اور سیاسی خطبات، فتووں اور خطوط کا مجموعہ ۔ صفحات : ۱۷۸، قیمت : ۴۵ روپے (مجلد)

افاداتِ آزاد : مرتبہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری ۔ ادبی و مذہبی استفسارات کے جوابات و ملفوظات کا فکر انگیز مجموعہ ۔ تصحیح و اضافہ شدہ آزاد صدی ایڈیشن ۔ صفحات : ۲۰۰، قیمت : ۵۰ روپے (مجلد)

تحریکِ ہجرت : از ڈاکٹر معین الدین وغیرہم، مرتبہ : شاہد حسین خاں ۔ ۱۹۲۰ء میں برعظیم پاک و ہند سے ہجرت افغانستان کی تاریخ اور افکار و دستاویزات ۔ ایک عظیم قومی عمل کی عبرت انگیز روداد ۔ صفحات : ۱۶۴ قیمت : ۵۴ روپے (مجلد)

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ : از ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری ۔ ساتویں صدی ہجری کے عظیم محدث، مصلح، مجدد اور مجاہد کی زندگی اور کارناموں کا تذکرہ ۔ صفحات : ۱۱۶، قیمت : ۳۰ روپے (مجلد)

مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت : از ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری ۔ مولانا آزاد کی صحافت کے خصائص اور خدمات کا جامع تذکرہ ۔ اخبارات کے مضامین کے اشاریے ۔ صفحات : ۲۲۲، قیمت : ۶۰ روپے (مجلد)

ایک علمی خاندان : از شفقت رضوی ۔ مولانا آزاد، ان کے والد، ہمشیرگان، برادر بزرگ، اہلیہ، خسر اور برادرِ نسبتی کے حالات اور علمی ادبی خدمات کا تذکرہ ۔ صفحات : ۲۶۶ قیمت : ۷۰ روپے (مجلد)

ارمغانِ آزاد : مولفہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری ۔ مولانا آزاد کے کلام اور ۱۹۱۰ء تک کے دستیاب شدہ مضامین کا مجموعہ ۔ مع تنقید و تبصرہ ۔ صفحات : ۲۵۰ قیمت : ۶۵ روپے (مجلد)

لسان الصدق، کلکتہ (۱۹۰۳-۵ء) : مرتبہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری ۔ مولانا آزاد کے اوائل عہدِ صحافت کا ایک یادگار علمی رسالہ ۔ عکسی اشاعت ۔ صفحات : قیمت : روپے (مجلد)

مولانا ابوالکلام آزاد (آثار و افکار) مرتبہ و مؤلفہ پروفیسر محمود واجد ہاشمی ۔ مولانا آزاد کے شاگرد ایم ای زکریا بھاگل پوری کے نام مولانا کے خطوط، مولانا سے متعلق ڈائری اور انٹرویو مع تبصرہ ۔

صفحات : ۱۲۰ قیمت : ۳۵ روپے (مجلد)

